اخلاقیاتِ نبوی

مقالات مذاکرۂ ملّی اخلاقیاتِ نبویؐ

کراچی ۱۴۰۲ ہجری

مرتبہ حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

مرتب : ـــــــ حکیم محمد سعید

ناشر : ـــــــ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس
ہمدرد سنٹر، کراچی ۱۸

طابع : ـــــــ نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد ۲، کراچی

تاریخ اشاعت : ـــــــ ۱۹۸۲ عیسوی

پہلا ایڈیشن : ـــــــ ایک ہزار

قیمت : ـــــــ ۴۵/.. رُوپے

ترتیب

حرفِ اوّل

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت پاک ہر دور میں بصیرت افروز اور حیات بخش رہی ہے۔ موجودہ سخت اور پیچیدہ دور میں بھی سیرت کو، خصوصاً اس سے مستنیر ہونے والی اخلاقیات کو مختلف انداز سے اور مختلف سطحوں پر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن نے قومی پیمانے پر سالانہ سیرت کانفرنسوں کا آغاز اسی جذبے سے کیا ہے۔ ربیع الاوّل ۱۴۰۲ ہجری میں ہمدرد کی سیرت کانفرنس کا موضوع اخلاقیات نبوی تھا۔ اس میں پاکستان بھر سے آئے ہوئے اہل علم وقلم نے مقالات پڑھے تھے۔ ان مقالات کی افادیت کو دوام بخشنے کے لیے جناب محترم حکیم محمد سعید صاحب نے "مذاکرۂ ملی اخلاقیاتِ نبوی" کے دوران ہی اعلان فرما دیا تھا کہ ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ چنانچہ سوائے ان چند مقالات کے جو مقالہ نگار حضرات نے عنایت نہیں کیے، تمام مقالات کا یہ خوب صورت مجموعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔

اس کتاب "اخلاقیات نبوی" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ملک کے ممتاز علما، ماہرین تعلیم، اساتذہ، ماہرین قانون اور اصحاب قلم نے تمدن و معاشرت، تعلیم و تربیت، عدل و انصاف، معاش اور معاشی نظام، سرمایہ و محنت کے روابط، امن و جنگ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات پر اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں موجودہ حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بحث کی ہے۔

کتاب میں مقالات اسی ترتیب سے پیش کیے جا رہے ہیں جس ترتیب سے مذاکرے میں پڑھے گئے تھے۔ ہم فاضل مقالہ نگار حضرات کے ممنون ہیں۔

۱۴۰۳ ہجری میں جناب حکیم محمد سعید نے ہمدرد سیرت کانفرنس کا موضوع تعلیمات نبوی کے ضمن میں خودی کا خصوصی مطالعہ منتخب کیا ہے۔ اس کے مقالات بھی انشاء اللہ ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کتابی شکل میں شائع کرے گا۔

مسعود احمد برکاتی

ناظم مجلس تحقیق و تصنیف ہمدرد

خطبۂ آغاز و استقبال

عزیزانِ محترم، دانشورانِ معظم، شرکائے مذاکرہ و مندوبین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ سبحانہ وتعالیٰ، نور السمٰوٰت والارض، اوّل و آخر، ظاہر و باطن، قادر و قدیر اور اللہ رحمٰن و رحیم کا فضل وکرم ہے کہ ہم سب یہاں فضائے اخلاص و اخلاق اور ماحولِ مطہر و مقدس اور حالات خلوص و اُنس میں جمع ہوئے ہیں اور یہاں موجود و شریک ذکور و اناث کا مقصد وحید اور منتہاد منشائے واحد یہ ہے کہ ہم سب حمدِ باری تعالیٰ کریں، اور پیروی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ راہِ علم و عمل اختیار کریں کہ جس پر صراطِ مستقیم کی تعریف صادق آسکے، وہ صراطِ مستقیم کہ جس کے لیے دعا سورۃ فاتحہ میں تعلیم کی گئی ہے اور اسی کی تعمیل میں ہم اپنی نمازوں کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی استدعا کرتے ہیں اور رہنمائی کے لیے دعا کرتے ہیں۔

علمائے دین، صاحبانِ قرطاس وقلم!

میں اپنی جانب سے اور اپنے رفقائے مستعد و منظم اور بانیانِ تحریک "آوازِ اخلاق" کی طرف سے قلوب کی گہرائیوں اور رُوح کی حرارتوں کے ساتھ آپ کا پُرخلوص اور پُرجوش استقبال کرتا ہوں اور خوش آمدید کہتا ہوں۔

اللہ ذوالجلال والاکرام کا شکر گزار ہوں کہ اس ذاتِ اقدس نے مجھے اور میرے رفقائے محترم کو توفیق عطا فرمائی کہ ہم اس مذاکرۂ ملی اخلاقیات نبوی میں، کہ جو اپنی نوعیت کا اوّلین اجتماعِ ملی ہے، آپ کو دعوتِ شرکت دیں۔ اور اب میں بہ خلوص واحترام اور بہ صمیم قلب مندوبینِ ذوی احتشام اور شرکائے واجب الاحترام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہماری دعوت الی الخیر کو قبول فرمایا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

حاضرینِ محترم و خواتینِ مکرم!

اما بعد، ہمارے اس اجتماعِ ملی و دینی کا مقصدِ وحید اور منشائے کلی یہ ہے کہ ہم اسلامی مملکت پاکستان میں اخلاق ملت کا ایک حقیقت پسندانہ اور دیانت دارانہ جائزہ لینے کی خدمت سرانجام دیں۔ اور اس "مذاکرۂ ملی اخلاقیات نبوی" کا منتہائے مقصود بلا خوف و بلا تامل یہ فرض ادا کرنا ہے کہ آج اس مملکت اسلامیہ کے ہر شعبۂ زندگی میں انحطاطِ طاقتِ اخلاق اور اس کی کیفیات و کمیات اور اس کے اسباب کا جائزہ لے کر اس کا علاج تجویز کیا جائے اور یہ علاج جامع و

مانع ہو اور کلیۃً اور لفظاً و معناً ہدایاتِ قرآن کا آئینہ دار ہو اور سنّتِ نبوی کا عکاس ہو اور ایسا حل ہو کہ اس سے ملّت کا ہر فرد فیض حاصل کر سکے۔ اس سے فرار کی جرات نہ عالم کر سکے اور نہ جاہل۔ مختار ہو کہ مجبور، ہر فردِ بشر اس کا پابند ہو۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ملّتِ پاکستانی بہ حیثیتِ مجموعی انحطاطِ اخلاق کی شدید و آہنی گرفت میں ہے۔ میں فی الوقت اس سے بحث نہیں کروں گا کہ اس صورتِ حال کے اسباب و علل کیا ہیں اور وہ ملّت کہ قیامِ پاکستان کے وقت اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک ایثار و قربانی اور پابندیِ احکامِ ربّانی کا نمونہ بنی رہی، اور تعمیرِ وطن کے جذباتِ مقدسہ سے سرشار اور تشخص ملی کی تحریک کے لیے مستعد و متحرک اور طرزِ اسلامی کے لیے جان نثار، وہ رفتہ رفتہ کیسے اسلامی اخلاق کو خیرباد کہہ گئی اور زوالِ اخلاق کو کیسے اس نے اپنا لیا اور فرائض ملی سے وہ کیسے غافل ہو گئی اور نظریۂ حیاتِ ملی سے کیوں کنارہ کش ہو گئی؟ آپ خوب جانتے ہیں کہ یہ داستان طویل ہے اور بڑی تلخ۔ اس صورتِ حال کے اسباب میں نہ ہم نظامِ تعلیم کی صریحی خرابیوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ ہم اربابِ بست و کشاد کی واضح و صریح کوتاہیوں سے صرفِ نظر کر سکیں۔ اسبابِ فاسدہ کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ایک عظیم و شجیع ملّت کو جو سربلندیِ اسلام اور سرفرازیِ مسلمین کے لیے عزمِ بلند اور قصدِ قوی کے ساتھ میدانِ عمل میں اتری تھی وہ پسپا ہو کر نکبت و ناکامی کے قعرِ مذلّت میں جا گری، اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنے اس حال پر شرم سار ہے نہ شرمندہ و آزردہ۔ اسے نہ یہ رنج ہے کہ حالات نے اور اس کے منفی طرزِ فکر نے اس سے اس کا مقامِ بلند چھین لیا ہے اور نہ اسے یہ فکر دامن گیر ہے، کہ اس کے انتشارِ ذہنی و فکری اور اس کے لازمی نتیجے میں انتشار و افتراقِ عملی نے اس سے فکری آزادی چھین لی ہے اور قومی آزادی کے لیے شدید خطرات پیدا کر دیے ہیں اور صفِ اقوام و مللِ عالم میں پاکستان کا مقام غیر متعین کر دیا ہے اور غیر مشخص۔

صاحبانِ فکر و نظر اس کے شاہد ہیں اور گواہ، اور عام افرادِ ملّت بھی واقف کہ میں اس صورتِ حال کو عرصۂ دراز سے اور بڑی شدّت کے ساتھ محسوس کر تا رہا ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن سے درخواست کرتا رہا ہوں کہ ان مرض شناسانِ ملّت کو چارہ گری کے لیے آگے بڑھنا چاہیے اور رفعیۂ مرض کا سامان کرنا چاہیے۔ اہلِ فکر و نظر اور صاحبانِ قرطاس و قلم کو حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیے اور پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ محاسبہ کر کے فکر و نظر کی پوری توانائیوں کے ساتھ اور قلم کی پوری طاقت کے ساتھ اس عظیم ملّت کو قعرِ مذلّت سے اور تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانا چاہیے اور نور آشنا کرنا چاہیے۔

حالات ہیں کہ دن بدن خراب ہو رہے ہیں، اخلاقی مسائل ہیں کہ روز بروز بدل کر شدّت اختیار کر رہے ہیں۔ بدی کی طاقتیں سر اٹھا رہی ہیں اور فراوانیِ سامان کے ساتھ اخلاقِ ملّت کے تار و پود بکھیر دینے کا فیصلہ کر چکی ہیں، بہت

سے قلم اپنی عصمتوں کو پامال اور فروخت کر چکے ہیں اور بہت سے اذہان کا سرِعام نیلام ہو چکا ہے۔ دنیائے علم و ادب ملوثِ بے ادبی ہو رہی ہے اور میدانِ صحافت میں باغیانہ اور غیر دانش مندانہ اور سوقیانہ انداز دیکھے جا رہے ہیں اور ذرائع ابلاغ میں منفی مظاہر صاف طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔ پاکستانی مدارس میں ایک دو نہیں متعدد کتابیں، اردو ہی میں نہیں، ملک کی ہر زبان میں خلافِ شرع و اسلام اور خلافِ نظریۂ حیاتِ ملی سالہا سال سے پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ یہ کتابیں لکھنے والے کون تھے، یا کون ہیں؟ ان کو داخلِ نصاب کرنے کرانے والے کون تھے یا کون ہیں؟

کیا اخلاقی محاسبے اور تجزیے کا اصل و صحیح میدان اس کے سوا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے؟ میں جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں، اور میں یقین محکم رکھتا ہوں اور آپ بھی کہ محاسبے کا یہ فرض صرف وہی اربابِ فکر و نظر ادا کر سکتے ہیں کہ جو نظریۂ حیاتِ ملی پر یقینِ محکم اور ایمانِ کامل کے ساتھ قائم ہیں۔ اور یہ محاسبہ وہی قلم کر سکتا ہے جس کو ہاتھ میں رکھنے والا پاکستان کا دوست ہو اور اسلام کا بے خوف اور بہادر سپاہی ہو اور یہ محاسبہ ہر وہ فردِ ملت کر سکتا ہے کہ جو صرف اللہ سے ڈرتا ہو اور پھر دنیا کی ہر طاقت کا باغی ہو۔ اور یہ محاسبہ وہی اہلِ دل اور صاحبانِ ایمان کر سکتے ہیں کہ جو سربلندیِ اسلام اور سرفرازیِ مسلمین کے جذباتِ مقدسہ سے سرشار ہیں۔

من حیث المجموع ملت طاؤس در باب اوّل و آخر کی قائل نظر آتی ہے۔ اندرونِ ملک جو سیاسی خلفشار اور جو ملی انتشار ہے اور جو ذاتی اختلافات ہیں اُس پر مستزاد وہ بدیہی خطرات ہیں کہ جو پاکستان کی سرحدوں کے چاروں طرف سر اٹھا رہے ہیں۔ یہ وہ سیاسی و نظریاتی سرحدیں ہیں جن کی حفاظت کی ہم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

پاکستان میں خیر کی طاقتیں ہیں مگر خفتہ و خوابیدہ ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ روپوشی اور گراں خوابی کا یہ وقت نہیں ہے بلکہ خیر کی ہر طاقت کو عقل و تدبر کی طاقتوں کے ساتھ اور فکر و نظر کی پوری بالیدگی کے ساتھ اور قلم کی پوری توانائیوں کے ساتھ برسرِ عمل ہو جانا چاہیے۔ میں اسلام و سیاست کو جدا نہیں کرتا، مگر جو سیاست اخلاق سے عاری ہو اور کردار سے محروم، میرے نزدیک وہ سیاست نہیں ہے، کثافت ہے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ گزشتہ ۳۵ سالوں سے سیاست پاکستان کے مرض کی دوا نہ بن سکی اور وہ سیاست بھی بُری طرح مات کھا گئی ہے کہ جو اقتدار اور اسلام کو ہم معنی بنانے پر مصر رہی ہے، اور وہ سیاست بھی پٹ چکی ہے کہ جو مذہبی فرقہ بندیوں پر پروان چڑھی تھی۔ اس سیاست کا بھی تیا پانچا چشمِ فلک نے دیکھ لیا ہے کہ جو نظریۂ حیاتِ ملی کے پرخچے اڑا دینے کے درپے تھی۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ہر سیاسی بازی گری ناکام ہو چکی ہے اور اب تقاضائے وقت یہ ہے کہ عاری از کردار سیاسی بازی گری کو خیرباد کہہ دیا جائے اور سلامت روی کو اختیار کیا جائے اور دیانت و امانت کی حکمرانی کو اپنایا جائے۔ اور تعمیرِ وطن اور تعمیرِ اذہانِ اہلِ وطن پر توجہات اور توانائیاں

مرکوز کی جائیں۔

یہ بنیادی نکتہ تو طے ہے کہ پاکستان کو لازماً ایک مملکتِ اسلامیہ رہنا چاہیے اور ایسی مملکتِ اسلامیہ کہ جس کا دستور قرآن ہو اور جس کا اصول سنتِ رسولؐ ہو۔ حاکمیت بس اللہ کی ہو اور اس کرۂ ارض کی ہر شے کو اللہ کی ملک تسلیم کر لیا جائے۔

پاکستان کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بات خود بخود طے ہو جاتی ہے کہ پاکستان کے ہر فرد و بشر کو اسلامی زندگی گزارنی ہے۔ قرآن و سنت کے مطابق اپنے اعمال و کردار کو ڈھالنا ہے۔ اخلاق کو سب سے بڑا مقام پاکستانی کی زندگی میں حاصل ہونا چاہیے۔ جو افرادِ ملت اس راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں ان کو راہِ راست اور صراطِ مستقیم پر لانے کا فرض بھی ادا کرنا چاہیے۔

اس مسلّمہ اور قطعی غیر اختلافی اصول کی روشنی میں اور پاکستان میں شدید زوالِ اخلاق کے پیشِ نظر ملت کے ہر فرد کو فکر کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ اس کے فرائض کیا ہیں؟

خیانت و کذب اور حرص و حسد، غرور و نخوت، نفاق و غیبت، بدگمانی اور عیب جوئی جیسے آلام و امراضِ امت کا علاج کیا ہے۔ میرا ملی فرض مجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ میں ان آلام پر اختصار کے ساتھ اظہارِ رائے کروں۔ اور یہ بتاؤں کہ جب اخلاقی امراض کسی فرد یا کسی جماعت میں پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کے اثرات و نتائج کیا نکلتے ہیں اور ان سے فرد و معاشرہ کس کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ اس تجزیے کے بعد میں توقع رکھتا ہوں کہ صاحبانِ نظر یہ فیصلہ خود فرمائیں گے کہ ان امراض کی موجودگی میں پاکستانی معاشرہ کن خطرات سے دوچار ہے۔

چند اخلاقی امراض

خیانت

آج کے معاشرے کے انحطاطِ اخلاق اور انتشار و پراگندگی کے اسباب و محرکات کی فہرست میں خیانت بے حد اہم سبب ہے، یہ انسانی رُوح کو مکدّر اور فکر کے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہے معاشرتی اور اجتماعی قوانین کی عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔

تعاون اور حقوقِ باہمی کی نگہداشت سے حسنِ معاشرت اُبھرتا ہے۔ اجتماعی نظام کی بنیاد حقوق اور فرد و جماعت کے ربطِ باہم پر ہے۔ خیانت کرنے والا ان سارے حقوق کو پامال کرتا ہے اور معاشرتی قوانین کی خلاف ورزی کر کے اپنے غیر تربیت یافتہ ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ خائن ذلت، رسوائی اور پستی کو قبول کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایک تاجر خیانت کی راہ سے ذلت کی منزل کو پہنچ جاتا ہے۔ مزدور و ملازم خیانت کی وجہ سے اپنا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں۔ ذمّہ داریوں کے احساس کے بغیر عظمت اور سعادت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہماری اہم ترین ذمّہ داری محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ دیانت ہے اور خیانت اس کی ضد!

کذب

سچائی کی طرح جھوٹ کے بھی مختلف رُوپ ہیں۔ اگر انسان کی رُوح اس گندگی میں مبتلا ہوجاتی ہے تو اس کے فضل وکمال کا تناور درخت بے برگ وثمر ہوجاتا ہے، اس کے اخلاق کی ساری پتّیاں اس کی شخصیت کے شجر سے اس طرح گر گر کر بکھر جاتی ہیں جیسے موجِ خزاں سے تخریبِ چمن ہوتی ہے۔

جھوٹ تنہا ایک بُرائی نہیں ہے، بلکہ بہت سی دوسری برائیاں بھی اس کے بطن سے جنم لیتی ہیں۔ بیشتر اخلاقی برائیوں کے بے شمار نام دراصل جھوٹ ہی کے مختلف رُوپ ہیں۔ خیانت جھوٹ ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ کذب سے ضمیر مُردہ ہوجاتا ہے، محبت دیگانگت کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور نفاق کے زہریلے ناگ چاروں طرف پھنکارنے لگتے ہیں۔

جھوٹ بولنے والے سچائی اور سادگی کو مغلوب کرنے کے لیے بلند بانگ دعوے، خوش نما الفاظ، چرب زبانی اور مصنوعی شیریں بیانی سے کام لیتے ہیں۔ وہ سادگی اور حقیقت کو اپنے سحر انگیز اسلوب سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ سادگی کا جمال ابدی ہے۔

جھوٹ بولنے والا اپنے انجام کار پر غور نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے پُرفن ہونے کی خبر کسی کو نہیں، حالانکہ اپنی باتوں کے تضاد اور اپنی دروغ بافی کی وجہ سے رسوائی، ندامت، اور عبرت انگیز ذلّت کے لیے اسے تیار رہنا چاہیے۔

حرص وطمع

جس دن سے انسان اس دنیا میں قدم رکھتا ہے ضرورتوں کا حصار اس کے گرد وسیع اور طویل ہوتا جاتا ہے بعض ضرورتیں تو ایسی ہیں کہ اُن کا تعلق بقا اور زندگی کے تحفّظ سے ہے، انھیں فطری ضروریات سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان پر کوئی پابندی نہیں عائد کی جاسکتی، لیکن بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی تکمیل کی کوئی منزل نہیں، ان کی نہ کوئی حد ہے نہ غایت۔ ان کو خواہشِ بے جا کہنا چاہیے۔ انسانی تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آج تک کسی کی ایسی ساری خواہشات پوری ہوئی ہوں۔ اسی آرزوئے بے نہایت کو حرص کہتے ہیں، تشنگی اس کا انجام اور ناآسودگی اس کی تقدیر ہے۔ دنیا کے کسی بلند بام پر اس کا کوئی آشیاں نہیں۔

حریص انسان اور حریص معاشرہ مادّی دولت حاصل کرنے کے لیے اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہوا دیوانہ وار بھاگتا چلا جاتا ہے۔ اسے شاید یہ نہیں معلوم کہ فلاح وکامرانی یہ نہیں ہے کہ ایک فرد دوسرے پر یا ایک معاشرہ دوسرے معاشرے پر مادّی اعتبار سے سبقت حاصل کرے، تاریخی فلاح یہ ہے کہ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے کی سلامتی کا ضامن بن جاتے اور حرص وطمع سے بلند ہوکر اجتماعی مفاد کا پاسبان بن جائے۔

حسد

حسد ایسا بدترین جذبہ ہے کہ اس کے اثرات کا جائزہ لینا دشوار ہے۔ معاشرے کے اسی فی صد جرائم کا محرک یہی سیاہ جذبہ ہے جس کو حسد کہتے ہیں، اگر آپ غور کریں تو قلبِ انسانی کی مثال صحرا میں ایک ایسے چھوٹے شہر کی سی ہے جس کے گرد کوئی فصیل یا قلعہ نہیں، نیکیوں کا رہزن اپنی غارت گری سے اس شہر کو چشم زدن میں تاراج کر سکتا ہے۔ شہر دل کی رونق کے اور جمال کے دشمنوں میں حسد سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے وجود سے دل ویران و تباہ ہو جاتا ہے، عمل کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ ناکامی و محرومی کی آتشِ سوزاں حاسد کی تقدیر بن جاتی ہے۔

غرور و نخوت

انسانی اخلاق کا مذموم پہلو غرور و تکبر ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی افراد ہی نہیں پورا معاشرہ نشۂ نخوت سے سرشار ہوتا ہے۔ عام طور پر غرور و تکبر کے مرض میں وہ لوگ گرفتار ہوتے ہیں، جن کی پرورش و پرداخت تنگ و تاریک ماحول، اور غیر اخلاقی روایات کے گہوارے میں ہوتی ہے۔ وہ جب باہر کی دنیا میں، صاف ستھرے ماحول، اور پاکیزہ اخلاق کی فضا میں آتے ہیں تو انھیں کوئی مقام نہیں ملتا۔ وہ اپنی اس محرومی کے لیے اپنی سیرت و کردار کی مناسب تعمیر کے بجائے غلط طور پر اپنے شرف و برتری کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ حال آں کہ جسے واقعی فضل و شرف حاصل ہے، اُسے اس کے اعلان و اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ غرور کا عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ معدوم کو موجود سمجھیں۔ صحت مند ذہن کی علامت یہ ہے کہ وہ خیالی حدود و قیود سے آزاد ہو، خواہشات اور توقعات کا اسیر نہ ہو، اس لیے کہ یہی راستے کبر و غرور کی طرف جاتے ہیں۔

نفاق

ہمارا معاشرہ ریا اور نمائش کے مہلک مرض میں گرفتار ہے اور یہ نفاق ہی کا ایک پہلو ہے، اس لیے کہ ظاہر و باطن میں جب مطابقت نہیں ہوتی تو قول و عمل اور فکر و کردار میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔

نفاق کی دیمک جب نظامِ اجتماعی کے ستونوں کو چاٹنے لگتی ہے تو ساری عمارت منہدم ہو کر نمونۂ عبرت بن جاتی ہے۔ افراد کا افراد سے تصادم، اقوام کا اقوام سے تصادم، یہ جنگ و پیکار، اور رُستخیز سب کچھ نفاق ہی کا نتیجہ ہے۔ نفاق قوموں کے لیے پیامِ مرگ ہے۔

غیبت

غیبت انسانی خوبیوں کی عمارت منہدم کر دیتی ہے، اور اخلاق کے سارے سوتوں کو خشک کر دیتی ہے۔ معاشرے پر اس کے ہولناک اثرات میں یہ بھی ہے کہ افراد کے درمیان بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور کبھی کبھی اس

کے شعلے سارے معاشرے اور بسا اوقات پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ غیبت کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، حسد، تکبر، سوئے ظن کی دبی ہوئی چنگاری غیبت پر ابھارتی ہے، لیکن ترغیب کرنے والا شاید نہیں جانتا کہ اس کا ہر لفظ خود اس کی شخصیت اور اس کے شیشۂ عظمت کے لیے تیشہ ثابت ہوتا ہے اور وہ لوگوں کی نظروں میں خفیف ہوتا ہے۔

عیب جوئی

جس طرح حسنِ ظن ایمان کی شاخ ہے، تجسس نفاق کی شاخ ہے۔ منافق کو اپنے بھائیوں کے رنج و غم کی پروا نہیں ہوتی اور ذمہ دار انسان اپنے بھائیوں کے ساتھ حسنِ ظن رکھتا ہے اور ان کے مفاد کی نگرانی کرتا ہے۔ دوسروں کی عیب جوئی کرنے والا منافق یہ نہیں جانتا کہ اس طرح وہ اپنے عیوب سے صرفِ نظر کر رہا ہے، اپنے دل کو اندھا اور جسم کو خستہ و مضمحل کر رہا ہے۔ سب سے کمزور انسان وہ ہے جو دوسروں کی عیب جوئی کرتا ہے اور اپنی اخلاقی برائیوں کو چھپانے کا ایک بہانہ تراشتا ہے۔ وہ انسان بدترین ہے جو دوسرے افراد کی سیرت و کردار کی تہوں میں جھانکنے اور عیب نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بدگوئی

بعض افراد بااختیار شخصیتوں کے سامنے دوسروں کی برائیاں کرتے ہیں۔ ان کی بدگوئی کا مقصد اس بااختیار شخصیت کو منحرف کرنا اور دوسروں کو اس کی نظروں میں حقیر و رسوا کرنا ہوتا ہے۔ یہ باتیں پہلے تو لطفِ مجلس کے طور پر شروع ہوتی ہیں، لیکن آگے چل کر بہت سے فسادات کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ بدگو اخلاقی پستی اور انحطاط کے دور سے تو گزر رہا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس ناک اخلاقی انحطاط اس بااختیار شخص کا ہے، جو چغل خوروں کی باتیں سنتا ہے اور بدگوئیوں کو اذنِ باریابی عطا کرتا ہے۔

بدگمانی

ہر انسان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، آنکھوں سے وحشت اور رفتار و گفتار سے سراسیمگی نمایاں ہے۔ ذہن اعتماد سے خالی، شیشۂ قلب سوئے ظن سے مکدر۔ اپنے سائے سے ڈرنے والا انسان، شاید اپنی کمزوریوں کے تجزیہ سے قاصر ہے، اسے اعتراف نہیں کہ اپنے ذہنی و فکری انتشار کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ وہ ہر شخص سے بدگمان ہو کر اپنی متاعِ حیات لٹا بیٹھا ہے، اب اس کی شخصیت اور قامت نامکمل رہے گی اور نشاط و مسرت کے جذبے سے اس کا دل کبھی آشنا نہ ہو سکے گا، اس لیے کہ یہ پھول حسنِ ظن اور اعتماد کی شاخِ رعنا پر کھلتے ہیں۔ بدگمانی اور سوئے ظن کے

ریگستانوں میں تو چنگاریوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انتشارِ شخصیت نئی تہذیب کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ ہے، مگر کھُل کر یہ نہیں کہا جا رہا کہ یہ انتشار اس بدگمانی اور اعتمادِ باہمی کے فقدان کا نتیجہ ہے جو جدید عالمی تہذیب کا بدترین مرض ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے اور دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے، وہ اپنے عدمِ تحفظ کے احساس کی یہ توجیہہ کرتا ہے کہ زمانہ برسرِپیکار ہے، حالاں کہ دوسروں سے بدگمانی خود اس کی جارحیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

جسدِ ملّت کو گھُن کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر دینے والی یہ اخلاقی بیماریاں جن میں سے بعض کا ذکر میں نے کیا ہے۔ انھوں نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جو جو اور جس جس طرح نقصانات پہنچائے ہیں اور ان نقصانات کے جو اثرات ہوئے ہیں وہ تو سب اہلِ دانش پر عیاں ہیں اور سب ہی ان کا احساس رکھتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں ان اخلاقی بیماریوں نے ایک مجموعہ بن کر جو ایک عام مرضی کیفیت ہمارے معاشرے پر طاری کر دی ہے اور ایک بیمار فضا ہم پر حاوی ہو گئی ہے وہ ہے انتشار و افتراق کی۔ ایک ملّت کے افراد ہونے کے باوجود ہم منتشر ہیں، جب کہ اس ملّت کا مقصدِ وجود یہ بتایا گیا ہے کہ سارے عالمِ انسانیت کی شیرازہ بندی کرے گی۔ اپنے مقصدِ حیات سے بحیثیتِ مجموعی ملّت کے اور انفرادی طور پر افرادِ ملّت کے دور ہو جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ملّت گروہوں میں بٹ گئی ہے اور ہر گروہ بلکہ ہر فرد خود کو تنہا محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ ملّت کہ جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند کہی جاتی تھی اس کا شیرازہ اس طرح بکھر گیا ہے کہ اس کا ہر فرد شدید احساسِ تنہائی کی گرفت میں ہے۔ تنہائی کا احساس ایک نفسیاتی مرض ہے جو طرح طرح کے اخلاقی اور سماجی مسائل پیدا کرتا ہے، اور آج ہم مسائل کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔

تنہائی ایک اہم معاشرتی مسئلہ ہے۔ یہ انسان کی بدنصیبی ہے کہ اس بھری دنیا میں وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے، لیکن انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ فرد کا گلشنِ اخلاق جب ویران ہوتا ہے تو محبت، وفا، دوستی اور اعتماد کی ساری شاخیں بے برگ و ثمر ہو جاتی ہیں اور گلشن کی تباہی اور تاراجی کا اعلان کرنے لگتی ہیں۔ آسمانوں پر کمند پھینکنے والے انسان کو قوت اور عجز و درماندگی کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ دنیا میں اُس شخص سے زیادہ عاجز اور بے بس کوئی نہیں جس کا کوئی دوست نہ ہو۔ یہ انسان کے سوئے خُلق کی علامت ہے اور اخلاق کی بھیانک تباہی یہ ہے کہ وہ دوست کو پا کر ضائع کر دے۔

حاضرینِ کرام!

میں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ابتدا میں پاکستان کا جو نقشۂ اخلاق پیش کیا اس کا بدیہی تقاضا یہی تھا کہ میں

احتیاط واختصار کے ساتھ ان عوامل کا بھی ذکر کروں کہ جو پاکستان میں انحطاطِ اخلاق کے ذمہ دار ہیں، اور یہ بتاؤں کہ ان عوامل نے چمنِ پاک کو کس طرح خزاں رسیدہ کیا ہے۔ اہلِ دل کے سامنے میں نے حالِ دل کہنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ میرے مخاطب فقط وہی نہیں ہیں کہ جو یہاں موجود ہیں، میں ان زعما سے بھی مخاطب ہوں کہ جن کو دعوائے رہنمائی ملّت ہے اور میرا خطاب اس گروہ سے بھی ہے کہ جس نے اس وطنِ پاک میں بارہا ہیئتِ اقتدار کا روپ دھارا ہے اور اس مملکتِ پاک میں خرمنِ امن وراحت کو تاراج کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں چشمِ فلک زندگی کی جگہ سکوت، سلامتی کی جگہ اضطراب، نغمۂ نشاط کی جگہ شورِ ماتم، زمزمہ سنجی کی جگہ نوحہ خوانی دیکھ رہی ہے۔

تہذیب وتمدن کی بہشت اور علم وحلم کے مرغزار معدوم ہوتے ہیں۔ اور پھر قیامت یہ برپا ہوئی کہ ہم نے افرادِ ملّت کو تذبذب کے راستے پر ڈال دیا، شک میں مبتلا کر دیا اور بدعملی کے جال میں پھنسا دیا۔ یہ تین دھاری انوکھا خنجر اُس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ثابت ہوا جس کے گھاؤ کی کہانیاں ہم سُنتے رہتے ہیں۔ حالات ایسے پیدا ہوتے کہ قرآن سے فرار اور سنّت سے اغماض معمولاتِ حیات میں شمار ہوتے۔ فکری آزادیاں سلب ہوئیں اور قومی آزادی کے لیے ہزار خطرات پیدا ہوتے۔ صنعت وحرفت کو چُن چُن کر برباد کیا تو اس کا نام بت شکنی رکھا گیا۔ انسان سوزی کا نام حیاتِ نو قرار پایا۔ حیا سوزی کا عنوان عصمتِ وطن پڑا۔ آزادی کا تصور مسخ ہوگیا اور عزّ وشرفِ انسان معدوم ہوا۔ مسجدوں کے مینار جُھک کر سوال کرنے لگے کہ اے اہلِ پاکستان اور اہلِ اسلام! تم نے اپنے تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ معمارانِ حرم! کیا تم نے پاکستان اس لیے بنایا تھا کہ تم اس قلعۂ اسلام کو اپنے ہی ہاتھوں مسمار کر دو؟

آوازِ حق

ایسے سخت حالات میں ایک ایسی آوازِ اخلاق کی ضرورت ہے کہ جو ہم نیند کے ماتوں کو جگا دے اور آواز دے:

اے مسلمانانِ پاکستان!

تمہارے لیے منزل ایک ہی ہے، راہ بھی ایک ہی ہے۔ یہی راہ تم کو لغزشوں سے بچا سکتی ہے، یہی راہ چشمِ نگراں کا کام کر سکتی ہے۔ جب کبھی تمہارے دلوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھنے لگیں اور تمہارے قدم لڑکھڑانے لگیں تو اس چشمِ نگراں کا تصور کرو۔ بصیرت کی آنکھیں کھولو اور یاد کرو انسانیت کے اُس قافلۂ عظیم کو جو عرب کی بے آب و گیاہ وادی سے چلا تھا، جس نے بداخلاقی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایمان کی شمعیں جلائیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کو صداقت کی روشنی سے منور کر دیا۔ مسلمان جب بھی مصائب وآلام کا شکار ہوتا ہے قرآن کی یہ صدا اس کی سماعت کو سکون و سرور بخشتی ہے:

امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء ویجعلکم خلفاء الارض

أالٰہ مع اللہ قلیلا ما تذکرون امن یھدیکم فی ظلمات البر

والبحر ومن یرسل الریاح بشراً بین یدی رحمتہ أالٰہ مع اللہ ۝

یعنی: "کون ہے کہ جب ایک مضطر اور بے قرار روح اس کو پکارتی ہے تو اس کی فریاد سنتا ہے، اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے؟

کون ہے کہ جس نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا اور اس کی وراثت بخشی؟

کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟

پھر بتاؤ کون ہے جو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں ہدایت کرتا ہے اور بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو بشارت کے لیے بھیج دیتا ہے۔

کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے؟"

اس دارِ فانی میں جب کبھی کسی بنی آدم نے اصلاحِ حیات کی کوئی منزل طے کی ہے تو صرف اس ہاتھ کی رہنمائی سے۔ اور جو اس کی رہنمائی میں آگیا پھر اس کے لیے گمراہی نہیں۔

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام فھو علی نور من

ربہ فویل للقاسیۃ قلوبھم من ذکر اللہ ۝

یعنی: "اللہ جب کسی شخص کو راہِ راست پر چلانا چاہتا ہے تو اس کا دل اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اور جس کا دل کھول دیا گیا تو پھر وہ اپنے پروردگار کی روشن کی ہوئی مشعلِ ہدایت اپنے سامنے پاتا ہے۔ مگر افسوس ان لوگوں پر جن کے دل ذکرِ الٰہی سے غافل ہو کر سخت ہو گئے ہیں۔"

پاکستان میں زندگی کے دو سال انتہائی کشمکش میں گزارنے کے بعد اور ان تمام حالات سے گزرنے کے بعد جن کا میں نے ابھی اوپر حوالہ دیا ہے اگر آج امید کی کوئی کرن پھوٹی ہے اور انقلابِ فکر اور تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں تو ان پر احتیاط کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ اسلام کے لیے جو تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں ان کے ساتھ چل کر دیکھنا چاہیے۔ بے شک ستارے ٹوٹ گئے ہیں مگر سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لینی چاہییں اور ان کو

اندھیری راتوں میں بجھا دینا چاہیے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کریں اور کاسہ لیسی کی زندگی اختیار کریں۔ مگر کچھ اُجلے نقش و نگار نظر آرہے ہیں۔ اگر نفاذِ شریعتِ اسلامی کا آج غلغلہ بلند ہوا ہے تو اس کی حقیقتوں کا دیانت دارانہ جائزہ لینا چاہیے اور قافلے کو صراطِ مستقیم پر ڈال دینے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

اخوانِ عزیز!

ہمیں آج ایک عہد کرنا چاہیے کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اس وطنِ پاک کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے رہیں گے۔ میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ آج ہم زلزلوں سے ڈرتے ہیں، مگر کبھی ہم خود زلزلہ تھے۔ ہم آج اندھیروں سے کانپ رہے ہیں مگر کبھی ہم اجالا تھے۔ آج ہم بھیگ جانے کے خدشے سے احتیاطیں برت رہے ہیں، ہم ہی تھے کہ سمندروں میں اُتر گئے تھے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو ہم ہی نے روند ڈالا تھا، بجلیاں جب آتیں تو ہم ان پر مسکراتے۔ بادلوں کی گرج کا قہقہوں سے ہم نے جواب دیا تھا۔ صرصر اٹھی تو اس کا رخ پھیر دیا۔ ذرا غور تو کیجیے کہ یہ ایمان کی کیسی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تار فروخت کر رہے ہیں!! اور اللہ سے اس درجہ غافل کہ جیسے اُس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

تلاشِ حق

باعمل، فعال اور تعمیری ذہن رکھنے والی شخصیتیں لایعنی اور غیر مفید کاموں میں اپنی قوت ضائع نہیں کرتیں، انھیں اپنی عظمت کا خود بھی شعور ہوتا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ کون سا کام ان کے شایانِ شان ہے اور کون سا کام اُن کے مقام و رتبہ سے فروتر۔ ان کی تنقیدوں میں متانت ہوتی ہے، وہ دوسروں کا مذاق نہیں اڑاتیں، انھیں معلوم ہے کہ تمسخر ایجابی طرزِ عمل نہیں، بلکہ منفی انداز ہے، مثبت طرزِ عمل غلطیوں کی دردمندانہ اصلاح ہے۔ اس حقیقت کی ترجمانی کرنے والی شخصیت ایجابی کہی جاتی ہے مگر ہمارے معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مثبت طرزِ فکر اور ایجابی طرزِ عمل کے مقابلے میں منفی طریق کار، اور منفی نقطۂ نظر رکھنے والی شخصیتیں ہی زیادہ حاوی ہیں، یہ فرد کا نہیں بلکہ معاشرے کا ذہنی افلاس ہے۔ ہمیں اس صورتِ حال کا مداوا کرنا چاہیے۔

اس ہنگامۂ ہستی میں انسان کو سکونِ قلب کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ وہ ہتھیار ہے جس کے بغیر معرکۂ حیات سر کرنے کی کوشش ذلت انگیز شکست کے سوا کچھ نہیں، آج انسان اپنے ذہنی طوفان کی موجِ مضطر میں اسیر ہو کر دیوانہ وار چیخ رہا ہے کہ مجھے بچاؤ۔ سکون و طمانیت کے چمن کی جستجو ہر انسان کی ضرورت بن چکی ہے مگر اسے گلستانِ

امن تک رسائی نہ دولت وثروت سے ہوسکتی ہے نہ شہرت واختیار سے، بلکہ صرف اخلاقی اور انسانی خوبیوں سے۔ سکون کا سرچشمہ اخلاق ہی ہے اور اس کے انحطاط نے تہذیب وتمدن کی حیرت انگیز ترقیوں کے باوجود ہمارے دل کا قرار چھین لیا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ انسان اپنے طرزِ حیات پر ناقدانہ نظر ڈالے اور یہ سوچے کہ اُس نے کیا کھویا، اور کیا پایا؟

صداقت اور خلوص روح وقلب کی جگمگاتی دنیا کی بڑی دل کش شعاعیں ہیں اور جو شخصیت اپنے دامن میں ان پھولوں کی مہک رکھتی ہے وہ بے حد جاذب ہوتی ہے۔

کسی فرد کی سچائی اور اس کا خلوص کسی ویرانے میں کھلنے والا پھول نہیں ہے بلکہ چمنستانِ عالم کا وہ پھول ہے جس کی شگفتگی اور رعنائی سب کے لیے جنت نگاہ ہوتی ہے۔ صدق وصفا سے صلح کی فضا پیدا ہوتی ہے، باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے اور اس اخلاقی صفت کی بنا پر ساری قوم ایسی ناقابلِ تسخیر فصیل بن جاتی ہے کہ وہاں کسی موجِ بلا کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

ہر فرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اصولِ اخلاق کو اپنی عملی زندگی پر منطبق کرے، کیوں کہ اخلاق کے بغیر نہ کسی فرد کو معاشرے میں رہنے کا حق حاصل ہے نہ کسی معاشرے کے تحفظ کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ جو شخص دولتِ اخلاق سے بہرہ ور ہوتا ہے اس کی شخصی وانفرادی سطح بلند ہوتی ہے، اس کا دائرۂ سعی وعمل وسیع ولامتناہی ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے اخلاق کی بنا پر زندگی کے سارے وسائل سے استفادہ کرتا ہے اور ہر دروازہ اس کے لیے "بابِ مفتوح" ہوتا ہے۔

عقل، فطرت اور مذہب نے انسانی زندگی کے فرائض کا تعین کیا ہے، معاشرتی زندگی تقاضائے فطرت کے عین مطابق ہے، لیکن فرد وجماعت کی وابستگی کے پہلے ہی مرحلے پر فرائض کے ساتھ حقوق کا بھی تعین ہوتا ہے، فرائض و حقوق کے اس مجموعے کو اخلاق کہتے ہیں۔ معاشرے اور افراد کے درمیان اس کے بغیر ہم آہنگی نہیں پیدا ہوسکتی۔ اخلاق کے بغیر بڑے سے بڑا شخص خزف ریزہ ہے اور معاشرہ ایک خزاں رسیدہ چمن۔

یہ انسان کی سب سے بڑی غلط فہمی ہے کہ وہ سکون وطمانیت کے لیے دولت، شہرت، اقتدار اور مادّی ترقی کے حصول کی جہدِ مسلسل میں دیوانہ وار مصروف رہتا ہے، حال آں کہ ان میں سے ہر چیز ایک نئی تشنگی اور نئی بے قراری پیدا کرتی ہے۔ یہ سعی وکاوش ایسی ہے، جیسے آب کی جستجو میں سراب کے پیچھے دوڑنا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی جستجو انسان کر رہا ہے اس کا وجود خارج کی دنیا میں نہیں ہے، بلکہ اس کا اپنا باطن

سکون و طمانیت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، اس لیے کہ اخلاق کا تعلق انسان کے باطن ہی سے ہے۔

قرآن اور اخلاق

کوئی قوم اور کوئی جماعت ترقی کرنا تو بڑی بات ہے اپنے وجود کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی اگر وہ اخلاق کے کم سے کم معیار کو ملحوظ نہ رکھے۔ افراد کے مجموعے کو قومی شخصیت بخشنے والی طاقت اور جوڑنے والی قوت اخلاق ہی کی قوت ہے۔ اخلاقی اقدار کے پاس و لحاظ کے بغیر افراد کے مجموعے کو بھیڑ تو کہا جاسکتا ہے قوم یا ملت نہیں کہا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جو قومیں اپنے اخلاق کو معیار سے گرا لیتی ہیں اور اپنے افکار و اعمال میں اخلاقی قدروں کو ملحوظ نہیں رکھتیں اُن کو تاریخ کا متلاطم سمندر ہچکولے دیتا ہے اور اگر پھر بھی وہ عبرت حاصل نہیں کرتیں تو بالآخر مذلت کے بحر عمیق میں تہہ نشین ہوجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معقول نظامِ حیات اخلاقی اقدار پر سب سے پہلے متوجہ ہوتا ہے اور ان کے استحکام کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اخلاق کی آبیاری کے بغیر کوئی نظام کوئی معاشرہ بقاو ترقی کے مراحل سے نہیں گزر سکتا۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے جس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور جس قسم کی سیرتیں اس کو مطلوب ہیں اس کے لیے نیک و بد اور خوب و ناخوب کا ایک مکمل نظامِ اقدار فراہم کرتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں ایمان کے ساتھ عملِ صالح کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اور صالح اعمال کی وضاحت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی ہے۔ عمل کے صالح ہونے کا پیمانہ اخلاق ہے، اخلاق ایک جزد ہے تقوے کا۔ اسلام نے انسان کی بڑائی اور عظمت کا جو واحد معیار مقرر کیا ہے وہ تقوٰی ہے:

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

"بلاشبہ تم میں سب سے مکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ تقوے والا ہے"۔

قرآنِ حکیم کے ان چند الفاظ کی جامعیت پر آپ جتنا غور فرمائیں گے ان کی اہمیت اور معنویت آشکار ہوتی جائے گی۔ دولت، شہرت، حکومت، قابلیت کسی چیز کو معیار نہیں بتایا گیا۔ برتری، احترام اور بلندی کا صرف ایک ہی پیمانہ رکھا گیا ہے اور وہ ہے اخلاقِ عالیہ۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرے میں برتری کا معیار نیکی ہو تو اس معاشرے میں نیکیاں ہی فروغ پائیں گی اور نیکیوں کو ہی اقتدار حاصل ہوگا۔ اخلاق کی اہمیت اس سے زیادہ اور کس طرح ظاہر کی جاسکتی ہے کہ رحمتِ عالم سرورِ کونین نورِ مجسمؐ نے فرمایا کہ "میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں"۔

اور یہ بھی شارعِ اسلامؐ ہی کا ارشاد ہے کہ "مسلمانوں میں کامل ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں" اور ایک بار فرمایا کہ "تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں"۔

غرض اخلاق اور محاسنِ اخلاق کے سلسلے میں ہمیں قرآنِ حکیم اور احادیث و سیرتِ پاک سے مکمل روشنی اور رہنمائی ملتی ہے اور ہمیں اس باب میں کسی دوسری طرف دیکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

جب ہم مطالعۂ قرآن حکیم کرتے ہیں اور حیاتِ سرورِ کائنات کو سامنے رکھتے ہیں تو بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تعلیماتِ اسلام کی بنیاد اخلاق پر رکھی گئی ہے اور اس میں اس درجہ وضاحت و صراحت ہے کہ ہمیں اسلام اور اخلاق ہم معنی ملتے ہیں۔ قرآن اور اخلاق، اخلاق اور حیاتِ فخرِ موجودات اور اسلام و اخلاق بہمہ وجوہ اور بہر طور ہم معنی ہیں۔

مذاکرۂ ملی اخلاقیاتِ نبوی

پاکستان اسلام کے نام و عنوان پر عالمِ وجود میں آیا تھا۔ یہ ملک منصۂ شہود پر اس لیے جلوہ گر ہوا تھا کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان اپنے دینی فرض سے عہدہ برآ ہونے کے آرزومند تھے اور انھوں نے بے اندازہ قربانیاں دے کر ایک اسلامی مملکت قائم کر دی کہ جہاں وہ قرینۂ اسلامی کے مطابق زندہ رہیں گے اور دنیا کے لیے وہ نمونۂ حیات پیش کریں گے کہ جو ایک مسلمان کا طرۂ امتیاز ہے اور جو قرآن و سنّت کا عکاس و آئینہ دار ہے۔ اگر یہ منشائے حقیقی نہ ہوتا تو آرزو دیتے دلِ مسلم اور تمنّائے قلبِ مسلم ہیں وہ درد و سوز پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ شانِ کبریائی جوش میں آتی اور ایک ریاستِ اسلامی کا محیر العقول وجود ممکن ہوتا۔

ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پاکستان اسلام سے عبارت ہے اور اس کے بغیر اس کا وجود و قیام ممکن نہیں ہے۔ ماضی کے تجربات ہمارے سامنے ہیں۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور یہ وہ دین ہے کہ جس نے تمام اقوامِ عالم کو اپنی روشنی سے منور کیا ہے اور تمام تاریکیوں کو اجالا بخشا ہے۔ ہم اس دینِ متین کے نام لیوا و حامل اور پیرو ہیں۔ مگر کیا اس سے بڑی غفلت بھی کوئی اور ہو سکتی ہے کہ ہمیں اس مقام کا احساس نہ رہے۔

میرے نزدیک اسلام کے دامنِ تقدس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنما داغ اور دھبّا نہیں ہو سکتا کہ آج انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں۔ عقیدۂ مسلم یہ ہے کہ جس طرح خالقِ کائنات اپنی ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے، کوئی ہستی اور وجود اس میں شریک نہیں اسی طرح قرآنِ کریم اپنی جامعیت اور کمال میں وحدہٗ لاشریک ہے اور بالکل اسی طرح اس کا لانے والا رسول کمالِ انسانیت و تعبّد اور قوائے نبوت و اصلاح میں بھی وحدہٗ لاشریک ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ جو اُمّت اس خدائے واحد، اس قرآنِ واحد اور اس رسولِ واحد کے دامنِ تعلیم سے وابستہ ہو وہ بھی اپنے اندر شانِ وحدت و یکتائی کا جلوہ رکھے۔ وہ بھی اپنے اعمالِ زندگی کی ہر شاخ میں بے مثال ہو اور شانِ

وحدت کی حامل ہو۔ اس کے اعمال و اخلاق غلغلہ اندازِ عالم ہوں۔ اقوام و مللِ عالم اس کے اعمال کا اتباع کریں۔ زندگی کے ہر حسن و جمال میں اس کے خط و خال مرقع عالم کے لیے نمونہ بنیں۔ وکذالک جعلنا کم امۃً وّسطاً کے یہی معنی ہیں اور اسی لیے مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

یاایہاالذین آمنوا ان تتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقاناً۔

"مسلمانو! اگر تم اللہ کا خوف اپنے اندر پیدا کر کے متقی بن جاؤ گے تو وہ تمھارے لیے تمام دنیا میں ایک خاص امتیاز اور خصوصیت پیدا کر دے گا۔"

اخوانِ پاکستان!

ذرا غور کیجیے کہ جس قوم کو اس صدائے الٰہی نے مخاطب بنایا ہو اس کے لیے اس سے بڑھ کر کیا بدبختی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ہر شاخ میں غیروں کے لیے نمونہ بننے کی جگہ خود دوسروں کو اپنا کعبۂ مقصود اور قبلہ بنانے کی غلطی کرے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پاکستان میں ہم نے تعلیم و صحت، اخلاق، معاشرت و معیشت، سیاست یہاں تک کہ مدنی زندگی کے ہر شعبے میں دوسری قوموں کے اعمال کو نمونہ بنایا، تہذیب و تمدن میں یورپ کی شاگردی کی۔

یہی وہ بنیادی گمراہی ہے کہ جس نے تعمیرِ ملت کے ستونوں کو منہدم کر دیا ہے اور سب سے بڑا خسران یہ ہے کہ من حیث المجموع ملت طاقتِ اخلاق سے محروم ہو چکی ہے اور بداخلاقی کی وادیوں میں گمراہ ہو چکی ہے۔

پستیِ اخلاق کی جس صورتِ حال پر میں نے روشنی ڈالی ہے اس کا مقصد کسی خاص گروہ، کسی خاص طبقے، کسی خاص جماعت کی تنقیص یا اس پر تنقید ہرگز نہیں ہے، بلکہ ملت کے ایک فرد کی حیثیت سے جائزہ لینا ہے۔ اسے آپ خود تنقیدی بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عاجز بھی اسی ملت کا ایک فرد ہے اور جو صورتِ حال ہو اس کی ذمہ داری میں ہم سب شریک ہیں۔ ایک آزاد ملک کے شہری کی حیثیت سے اس کے سیاہ و سفید میں ہم سب شامل ہیں اور خرابیِ احوال میں کم و بیش شرکت سب ہی کی ہے۔ میری گزارشات کا منشا صرف یہ ہے کہ خرابی چاہے کسی میدان میں ہو اس کی جڑ اخلاقی انحطاط میں ہے۔ سیاست ہو کہ معیشت، معاشرت ہو کہ تجارت، صنعت ہو کہ تعلیم، بگاڑ جہاں بھی پیدا ہو رہا ہے، جس حد تک بھی ہو رہا ہے، اس کی وجہ اخلاق کا فقدان ہے۔ جب افراد کے اخلاق میں کمزوری در آئے تو زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ ہر شعبۂ حیات کے افراد اپنے پست اخلاق کی وجہ سے اس شعبے میں اپنی صالحیت و صلاحیت سے بہار لانے کے بجائے اس کو خزاں رسیدہ کر دیتے ہیں، الغرض خرابی جب بھی ہوئی ہو جس نے بھی کی ہو اس کی پشت پر اخلاقی اضمحلال ہی کارفرما رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنی ذہنی وابستگیوں اور ذاتی، گروہی اور

جماعتی نقطۂ نظر سے بلند ہو کر اس صورتِ حال پر غور کریں اور کسی ایک فرد، گروہ یا جماعت کو ہدف بنانے کے بجائے اخلاق کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنے کی سعی کریں، کیوں کہ جب سیلاب آتا ہے تو وہ اپنے پرائے کی تفریق نہیں کرتا سیلاب اندھا ہوتا ہے اور وہ سب کو بہا کر لے جاتا ہے

محبانِ گرامی!

اس سیلاب پر بند باندھنا چاہیے، فوری باندھنا چاہیے اور ہم سب کو مل کر باندھنا چاہیے۔ اس سیلاب کو روکنے کے لیے ہمارے پاس طاقت موجود ہے اور وہ طاقت ہے اخلاقِ نبوی کی۔ اخلاقِ نبوی کی پیروی ہی ہمیں خس و خاشاک کی طرح بہہ جانے سے بچا سکتی ہے۔ سرکارِ دو عالم، نبیِ اکرم، نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم نے جب ظہور فرمایا تھا تو دنیا کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ آپ کے نسخۂ کیمیا نے ایک ایک مرض کا علاج کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیاتِ اجتماعی کا بیمار ڈھانچہ مضبوط اخلاقی بنیادوں پر کھڑا ہو گیا اور دنیا میں ایک بے مثال انقلاب کا باعث بنا۔ ضرورت ہے کہ آج بھی ہم اسی نسخۂ کیمیا سے اپنے امراض کا علاج کریں اور شفا حاصل کریں۔ یہی وہ ضرورت ہے کہ جو "مذاکرۂ ملی اخلاقیاتِ نبوی" کی محرک ہوئی اور ہم نے ماہِ ربیع الاول کو اس آوازِ اخلاق کو بلند کرنے کے لیے اس لیے منتخب کیا ہے کہ یہ ماہِ مبارک مسلمانانِ عالم کے لیے جشن و مسرت کا پیام ہے اور اس لیے ہے کہ اس مہینے میں اللہ کا وہ فرمانِ رحمت دنیا میں آیا جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرماں کا موسم بدل دیا۔ ظلم و طغیان اور فساد و عصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں۔ اللہ اور اس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔ انسانی اخوت و مساوات کی یگانگت نے دشمنوں کو نابود کر دیا اور کلمۂ کفر و ضلالت کی جگہ کلمۂ حق و عدالت کی حکمرانی کا اعلانِ عام ہوا۔

آخر میں آیئے دستِ دعا دراز کریں۔

اے باری تعالیٰ! ہم اخلاقی زوال کی جس دلدل میں پھنس گئے ہیں، اس سے ہمیں صرف اور صرف تیرے حبیب پاکؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی نکال سکتی ہے، تو ہمیں اِثم و عُدوان کے بھنور سے بچا اور افعالِ حسنہ کی توفیق عطا فرما۔ اس ذکرِ جمیل کو قبول فرما جو یہاں ہوا ہے اور ہو گا۔ اور اس کے طفیل ہمیں اخلاقِ نبویؐ سے قریب کر دے۔

اے خالقِ کائنات! ہم گنہگار سہی، مگر تیرے بندے ہیں، تیرے رسولؐ کے نام لیوا ہیں، جس نے ہمیں اخوت و اتحاد کا سبق دیا اور تیری یہ آیت و ہدایت سُنائی کہ "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا"۔

مگر ہم نے تیری رسّی کو چھوڑ دیا اور شیرازۂ ملّت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ہمارے ہاتھوں میں اتنی طاقت عطا فرما کہ ہم حبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں اور ایک دل، ایک جان ہو کر تعمیرِ جہاں کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ آمین، ثم آمین

نظامِ معاشرت

جناب محترم مولانا محمد مالک کاندھلوی

الحمد للہ رب العالمین و العاقبت للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ وکفی باللہ شھیداً محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانا۔ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ○

صدق اللہ العظیم

مذاکرہ ملی اخلاقیاتِ نبوی کے سلسلے میں اس وقت موضوعِ بیان نظامِ معاشرت ہے۔ اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آیات جو تلاوت کی گئیں اگرچہ سرورِ کائنات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ جس دینِ حق و ہدایت کو لے کر مبعوث ہوئے اُس کا بیان ہیں۔ اور آپ کے صحابہ کی ایمانی، عملی، اخلاقی اور معاشرتی خوبیوں کا ذکر ہے جن کے اخلاق و معاشرت کی طہارت وعظمت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا۔ مگر آیاتِ مبارکہ کے اس اصل موضوع پر اجمالی نظر ڈالتے ہی سے نظامِ معاشرت کے بنیادی اصول سمجھ میں آجاتے ہیں، کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ انسانی حیات اور مقاصدِ حیات کی تکمیل اور رشد و فلاح کی منازل طے کرنا ہدایت اور حق کا محتاج ہے۔ بغیر ہدایت انسان گمراہی میں پڑے گا، اور حق کے بغیر باطل نظام کی تباہ کاریاں عالمِ انسانیت کے سارے نظام کو درہم برہم کر ڈالیں گی۔ تو سب سے پہلے تعلیماتِ نبویہ کی بنیاد حق و ہدایت ہوئی۔ اور اس حق و ہدایت کی بنیاد پر قائم ہونے والی عملی عمارت۔ اخلاق و معاشرت کی جُملہ خوبیوں پر مشتمل ہونے کے باعث اس طرح ظہور پذیر ہوئی کہ آپ کے صحابہ **اشداء علی الکفار رحماء بینھم** کا مظہرِ کامل بن کر دنیا کے سامنے رونما ہوئے۔

شدت و رحمت یعنی سختی و نرمی ہی ایسی دو قوتیں ہیں جو نظام کو چلاتی ہیں، اور سعادت و شقاوت کی منزل پر پہنچانے والی بھی یہی دو طاقتیں ہیں۔ اگر ان کا رُخ صحیح ہے تو انسانی حیات اخلاق و معاشرت کی ہر خوبی کو حاصل کرے گی۔ اور اگر رُخ غلط ہے تو تباہی اور بربادی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔

اس کی وضاحت کے لیے میں آپ کی توجہ تخلیقِ آدم کے ارادۂ تکوینی پر فرشتوں کے ایک اشکال اور اُس کے جواب کی جانب مبذول کردوں۔ حق تعالیٰ شانہ نے جب یہ فرمایا انی جاعل فی الارض خلیفہ کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے عرض کیا اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء کہ اے پروردگار! کیا آپ ایسی مخلوق پیدا کرنے والے ہیں جو زمین میں فساد مچائے اور خوں ریزی کرے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں معاشرت کے بگاڑ اور تباہی کی باعث ہیں۔

حضراتِ مفسرین نے فرشتوں کے اس اشکال کی متعدد وجوہ بیان کی ہیں۔ امام رازیؒ ان وجوہ کا ذکر کرتے ہوئے اصل سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ فرشتوں نے یہ بات انسان کے اجزائے ترکیبیہ پر نظر کرتے ہوئے کہی، کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ تخلیقِ انسان میں جو اجزا ہیں یعنی پانی، مٹی، آگ اور ہوا، یقیناً اُن کے آثار اُس کی عملی زندگی میں رونما ہوں گے۔

ہر نسخۂ مرکب اپنے اجزا کی تاثیر اور اُس کے خواص پر مشتمل ہوتا ہے تو پانی سے حرص و لالچ جیسی خصلتیں پیدا ہوں گی، اور مٹی کی خاصیت جذب و انقباض ہے تو اُس سے بخل پیدا ہوگا، اور آگ کی تاثیر و خاصہ حرارت و اشتعال ہے تو اس سے برافروختگی اور غصہ ہوگا اور ہوا کا خاصہ بلندی و اُبھار ہے تو نخوت و غرور اور سرکشی جیسی چیزیں واقع ہوں گی۔ اور یہ جملہ چیزیں عالم میں فساد و خوں ریزی کا سبب بنیں گی۔ حق تعالیٰ نے جواب اپنی شانِ عظمت کے مناسب یہ دیا کہ انی اعلم ما لاتعلمون جس سے فرشتوں کو اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تم نے انسانی قوائے عملیہ کا ایک رُخ دیکھ کر ایسا اندازہ کیا، لیکن اس حقیقت کو اب واضح کردیا جائے گا کہ یہی قوتیں جو انسانی معاشرے کو تباہ کردینے والی ہیں اگر ان کا رُخ صحیح کردیا جائے گا تو بہ جائے فسادِ معاشرہ کے صلاح و کمال کی اعلا منزلوں پر انسانی زندگی پہنچ جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من اعطیٰ للہ ومنع للہ واحب للہ وابغض للہ یعنی جس نے جو عطا و سخاوت کی وہ بھی اللہ کے لیے اور جو کچھ بخل و تنگی کی وہ بھی اللہ کے لیے اور جو کچھ محبوب رکھا وہ بھی اللہ کے لیے اور جس چیز سے بُغض و

نفرت کی وہ بھی اللہ کے لیے، تو بے شک ایسے شخص نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسانی حیات میں سخاوت و بخل اور محبت و نفرت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ اُن میں سے کوئی چیز بھی عملی زندگی میں ناپید ہو جائے، لیکن یہی وصفِ سخاوت اگر خیر کے کاموں میں ہو تو ایثار و ہمدردی اور خدمتِ خلق کی صورت میں رُونما ہو گا۔ اور یہ وصف اگر برائیوں میں ہو تو اسراف اور فضول خرچی اور تعیّش جیسی مذموم خصلت بن کر سامنے آئے گا۔

علیٰ ہذا القیاس بخل و تنگی اگر برائیوں سے ہو تو معاشرے کو بہتر بنانے کا سامان ہو گا اور اگر خیر اور بھلائیوں میں ہو تو محرومی اور بدنصیبی میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ شوق و محبت کے جذبات خیر میں ہوں تو معاشرہ محاسن اعمال و اخلاق کا مظہر بن جائے گا، اور اگر یہ جذبات نفس کے تقاضوں کے تابع ہو جائیں تو شر و فساد اور بے حیائی کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ اسی طرح بغض و نفرت اگر اپنوں سے ہو تو دنیا میں انسان درندوں کی شکل میں نظر آنے لگیں گے اور یہ بغض دشمنوں سے ہو اور بُری باتوں سے ہو تو قوم کے لیے بقا و سلامتی اور عزت و عافیت کا سامان ہو گا اور عفت و پاک دامنی اور تقویٰ سے معاشرہ مزین ہو گا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے مسند میں ایک روایت ذکر کی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ رب العزت نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اللہ نے آدم میں ایک چیز رُوح پیدا کی اور ایک چیز نفس بھی اس میں پیدا کیا۔

تو اب انسانی زندگی میں عفت و تقویٰ، ایثار و سخاوت اور ہر فلاح و سعادت کی چیز جو ظاہر ہوتی ہے وہ رُوح سے ہے، کیوں کہ وہ ملاءِ اعلیٰ سے ہے اور امرِ رب ہے۔ اور جو چیز بھی شر اور بُرائی کی انسان میں ظاہر ہو وہ اس کے نفس سے ہے۔ آپ کے اس ارشادِ مبارک نے انسان کی عملی قوتوں کے دو رُخ ظاہر کر دیے اور یہ بتا دیا کہ خیر کے محرکات رُوح سے ہیں اور شر کے محرکات نفس سے ہیں۔

امام بیہقی نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب عقل پیدا فرمائی تو اُس سے فرمایا اَقْبِلْ فَاَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ اَدْبِرْ فَاَدْبَرَ ثُمَّ قَالَ قُمْ فَقَامَ ثُمَّ قَالَ اُقْعُدْ فَقَعَدَ کہ اسے عقل تو آگے آ تو وہ آگے ہو گئی۔ اُس سے فرمایا کہ تو پیچھے ہٹ جا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اُس سے فرمایا تو اُٹھ کھڑی ہو وہ کھڑی ہو گئی۔ اُس سے فرمایا تو بیٹھ جا وہ بیٹھ گئی۔ بدءِ تخلیق میں عقل کے ان احوال کو مقدر فرما کر یہ ظاہر کر دیا گیا کہ انسان کی زندگی میں یہ عملی پہلو ودیعت کر دیے گئے کہ کسی کام کی رغبت تو کسی سے نفرت، کسی کی طرف دوڑ اور مسابقت تو کسی سے پرہیز اور بُعد، اور عقل ہی مدبر اور حاکمِ بدن ہے۔ اگر اس عقل کی حکمرانی اپنے اعضا تے بدتیر پر نفس کی

تحریک سے ہے تو نتیجہ شر و فساد، اور اگر روح کی تحریک پر ہے تو صلاح و خیر۔

امام ربّانی شیخ مجدّد الفِ ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں: کمالِ ایمان یہ ہے کہ بندہ اپنی قوتِ غضبیہ کو اور قوتِ شہویہ کو احکامِ خداوندی کے تابع کر دے اور اس مقام تک پہنچ جائے کہ مقتضائے طبیعت مقتضائے شریعت بن جائے۔ اسی حقیقت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد واضح کر رہا ہے۔ الا ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب، یعنی آگاہ ہو جاؤ انسانی جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے۔ وہ اگر درست ہو تو تمام بدن درست ہوگا۔ اور وہ اگر بگڑ جائے تو تمام بدن بگڑ جائے گا۔ خبردار ہو جاؤ وہ قلب ہے۔ گویا قلبِ انسانی اور قالب دونوں اس طرح مربُوط ہیں کہ صلاح و خیر اور فساد و شر میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔

تو عقلِ انسانی جو اپنے بدن پر قوتِ حاکم ہے اگر وحیٔ الٰہی اور تعلیمِ ربّانی سے نُور حاصل کرے گی تو اپنے جسم کو خیر میں مصروف کر سکے گی۔ اور اگر اس نورِ الٰہی سے محروم رہتے ہوئے ظلمت و تاریکی میں پڑی رہی تو شر و فساد اور گمراہی کی تاریکیوں ہی میں اپنی مملکت برباد کر ڈالے گی۔

یہ بات بالکل اُسی طرح ہے جیسے حضورؐ نے ارشاد فرمایا: المعدة حوض البدن ومنه تصدر العروق بالصحة والمرض، یعنی معدہ بدن کے لیے ایک حوض ہے وہیں رگیں تمام بدنِ انسانی کی طرف تن درستی و بیماری لے کر لوٹتی ہیں۔

الغرض معاشرہ اور انسان کی عملی زندگی میں اگر نفس کے محرکات ہوں تو نتیجہ شر و فساد اور قتل و خوں ریزی ہی ہوگا (جیسے کہ فرشتوں کو اشکال ہوا تھا) چناں چہ ایسے انسان کا طرزِ زندگی قرآنِ حکیم نے بیان فرمایا: واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیها ویهلك الحرث والنسل والله لا یحب الفساد، یعنی کہ جب بھی وہ پیٹھ پھیر کر واپس جائے تو زمین میں فساد برپا کرتا ہوا اور کھیتوں اور نسل کو تباہ و برباد ہی کرنے میں کوشاں ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور نفس کی تباہ کاریاں اُس کو ایسا مغرور و بدمست بنا دیتی ہیں کہ واذا قیل له اتق الله اخذته العزة بالاثم فحسبه جهنم۔ یعنی جب اس کو کہا جائے کہ خدا سے ڈر تو غرور و تکبّر اُس کو اور گناہ و سرکشی پر آمادہ کرتا ہے، لیکن رُوح کے محرکات اُس کی قوتِ غضبیہ کا رُخ مجرمین کی سرکوبی کی طرف پھیر دیتے ہیں اور وہ مجرمین پر قہرِ خداوندی بن کر برستا ہے۔ اور جذب و شوق کی طاقتیں اُس کو تقویٰ اور طاعت کی طرف کھینچ لاتی ہیں۔ اب اس کو عبادت اور محاسن اعمال و اخلاق اس قدر لذیذ و مرغوب معلوم ہوتے لگتے ہیں کہ اس سے زائد کوئی چیز زندگی میں مرغوب نہیں رہتی۔ پہلا رُخ معاشرے کے فساد کا تھا تو یہ رُخ معاشرے کی صلاح و فلاح کا ہوا۔

یہی وہ چیز ہے جس کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللّٰہ** یعنی انسانوں میں بہت سے وہ ہوتے ہیں جو اپنے نفس کو فروخت کر ڈالتے ہیں اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے۔ یعنی اپنے نفس کے تقاضوں کو مٹا کر رُوح کے تابع کر لیتے ہیں۔

نفس اپنی ذات اور فطرت سے امارۃ بالسوء برائیوں پر آمادہ کرنے والا ہے۔ ضرورت ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے اس کے زہر کو مُدبّر کر کے اس کو کُشتہ بنا لیا جائے۔ اگر نفسِ امّارہ کو تعلیماتِ نبویہ سے مُدبّر کر لیا گیا تو پھر یہ نفسِ امارہ اور لوّامہ کے بجائے نفسِ مطمئنہ بن جائے گا۔ اور رُوح کے لیے ایک شکاری کتّے کی طرح بڑے بڑے قیمتی اعمال و افعال اور خصائل کا شکار لا لا کر انسانی حیات کو سُودمند و منتفع کرنے لگے گا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں احوالِ قلب پر بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا کہ بدنِ انسانی کو ایک ..... شہر یا ملک کی طرح سمجھ لینا چاہیے اور عقل کو بمنزلۂ حاکم کے۔ اور اُس کے مدرکات و قویٰ خواہ حواسِ ظاہرہ میں سے ہوں یا باطنہ سے اس کے اعوان و مددگار اور لشکر ہیں۔ اور اس کے اعضائے بدنیہ گویا اس کی رعیت ہیں۔ اور نفس امارۃ بالسوء جو اُس کے جذباتِ شہوت و غضب ہیں اس کا دشمن ہے جو اس کے ساتھ برسرِ پیکار ہے اور اس کی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے اور اس کی رعیت کو ہلاک کرنے پر تُلا ہوا ہے تو اب اگر اس ملک کا بادشاہ اس دشمن کے ساتھ مقابلہ و جہاد کر کے اس کو شکست دے دے گا تو اپنی سلطنت بھی محفوظ رکھ سکے گا اور اپنی رعیت کو بھی ہلاکت سے بچا لے گا۔ یعنی اس کی زندگی نجاح و کامیابی حاصل کرے گی۔ اور وہ اپنے وجود کو دنیوی ذلت اور اخروی عذاب سے بھی بچا لے گا۔ دنیا میں کوئی بادشاہ اپنی سرحدوں کو دشمن کے حملے کے لیے خالی نہیں چھوڑا کرتا۔

اس مقالے کی محدود گنجائش ان نکات کی توضیح کی اجازت نہیں دیتی جن کی طرف اشارہ کیا گیا۔ البتہ صرف ایک حدیث کا مضمون محض حوالے کے طور پر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس سے بخوبی یہ بات ظاہر ہو سکے گی کہ تعلیماتِ نبویہ نے دنیا کے انسانوں کے لیے کیسا پاکیزہ نظامِ معاشرت عطا فرمایا:

امام بخاری اور امام مسلم نے صحیحین میں حدیث تخریج فرمائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **سبعۃ یظلھم اللّٰہ یوم لا ظل الا ظلہ (الخ)**۔ یعنی سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص سایۂ رحمت میں جگہ دے گا اُس روز جب کہ کوئی سایہ اُس کے سائے کے علاوہ نہ ہو گا۔ فرمایا: ایک عدل و انصاف قائم کرنے والا حاکم۔ دوسرا وہ نوجوان جو اللہ کی عبادت میں سرشار و مست ہوا در اسی میں نشوونما پا رہا ہو۔ تیسرے وہ دو شخص جو باہمی محبت صرف اللہ کے لیے رکھتے ہوں، اُسی پر جمع ہوتے ہیں اور اُسی پر جُدا ہوتے ہیں۔ چوتھا وہ شخص جو مسجد سے فارغ ہو کر

نکلا، لیکن اُس کا دل مسجد ہی میں اٹکا ہوا ہے تا وقتے کہ وہ پھر مسجد میں آجاتے۔ پانچواں وہ جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور خشیت و تقویٰ سے اُس کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ چھٹا وہ جس کو کسی نے نفس کی شہوتوں کی دعوت دی اور اُس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا انی اخاف اللہ کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔ ساتواں وہ شخص جو اس طرح کسی کو صدقہ کرتا ہے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔ تو اس حدیث میں نظامِ حیات کو ہر خیر و سعادت سے آراستہ کرنے کے تمام پہلو واضح فرما دیے گئے یعنی حاکم عدل و انصاف قائم کریں، باہمی معاشرت ایسے اخلاص اور پائیدار جذباتِ محبت پر قائم ہو کہ اسی پر ملنا ہو اور اسی پر ایک دوسرے سے جدا ہوں، غیبت و حضور کا فرق نہ رہے۔ ذوقِ عبادت اس قدر قوی ہو کہ وہ جوانی کا دور جس میں طبعی خواہشات اور لہو و لعب انسان کو غافل و لاپروا بنائے رکھتا ہے، وہ نوجوان عبادتِ خداوندی ہی میں مست رہے۔ خوفِ خدا اس قدر ہو کہ تنہائیوں میں اللہ کو یاد کر کے روتا ہو۔ عفت و پاک دامنی کا یہ مقام ہو کہ نفس کے بڑے سے بڑے دواعی اور تقاضوں کو ٹھکرا دے۔ ایثار اور خدمت کا یہ رنگ ہو اور ایسے اخلاص و تواضع کے ساتھ ہو کہ گویا بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا کیا ہے۔ یہ سات شعبے ہیں جو تمام نظامِ حیات پر محیط ہیں۔ ان کی تکمیل و تحسین کی یہ تعلیم بتا رہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے دونوں رُخ نہایت اعلا و مکمل فرمائے۔ زندگی کا وہ رُخ جو خالق کی طرف ہے وہ ایسا اعلا و اکمل ہو کہ ایمان و تقویٰ کا پیکر بنا ہوا ہو۔ اور مخلوق کی طرف جو رُخ ہے وہ ایسا پاکیزہ ہو کہ اخلاص، ایثار و محبت اور اعانت و خدمت کا مجسم پیکر بنا رہے۔

بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی وہ نظامِ حیات ہے جو انسانوں کو مادی کثافتوں سے پاک کر کے ملائکہ مقربین کے زُمرے میں داخل کر دیتا ہے، بلکہ اُس عالی مقام پر پہنچا تا ہے کہ فرشتوں کو اُن پر رشک ہوتا ہے اور بارگاہِ خداوندی میں اُن کے اعمال پیش کرنے میں فخر کرتے ہیں۔

خداوندِ عالم تعلیماتِ نبویہ سے ہمیں ایسے ہی نظامِ حیات سے آراستہ و مزین فرمائے اور دنیا و آخرت کی سعادتوں سے ہم کنار فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

نظامِ تمدّن و مدنیت

جناب محترم مولانا محمد سعید

جب بنی نوعِ انسان میں ظلم و عدوان اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں اور اللہ کی مخلوق کے اپنے بُنے ہوئے جال ہر جنبشِ تازہ کے ساتھ اُس کی کھال میں گھُستے چلے جاتے ہیں اور جس مقصد کے لیے تخلیقِ آدم ہوئی، اولادِ آدم اُس سے دُور ہٹتی چلی جاتی ہے تو اللہ اپنی مخلوق میں سے کسی خاص بندے کو منتخب کرتا ہے کہ وہ بھٹکے ہوئے ہجومِ خلق کو پھر سیدھی راہ پر لے آئے۔

ایک ایسی زندگی جب حرا کی تنہائیوں میں سے نکل کر تاریخ کے دھارے میں قدم رکھتی ہے اور وہ لمحہ یادر کھیے تاریخِ انسانی کے لیے بڑی خوش بختی کا ہوتا ہے تو اس کے پیشِ نظر ذاتی علو یا منفعتیں نہیں ہوتیں بلکہ دوسروں کو اپنے روپ میں ڈھالنے کی تمنّا ہوتی ہے۔

پیغمبرانہ زندگی ہر شاہکار کی طرح خونِ جگر کی طالب ہوتی ہے۔ اس میں درد و کرب، حزن و یاس، بیم و رجا، کوششِ پیہم، شب بیداری اور نالۂ نیم شبی سبھی کچھ ہوتے ہیں یہ زندگی خدائی کا دردِ سر نہیں ہوتی، بندگی کا دردِ جگر ہوتی ہے۔ اور بندگی ہی کو انسان کی تقدیر بنایا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ط الذاریات:۵۶

"جنّ و اِنس کو پیدا ہی عبادت کے لیے کیا گیا ہے۔"

جب زندگی کا مقصدِ اوّلی یہی ٹھہرایا گیا ہو پھر زندگی کا ہر بندھن اس مقصد کا تابع ہوجاتا ہے۔ رہن سہن، لین دین کا تمام کاربار، تعلقاتِ باہمی کا پُورا تانا بانا، محبت و نفرت کی پُوری دنیا۔ غرض یہ کہ پُورا تمدّن ایک ہی جذبے کے تحت ہوگیا اور وہ جذبہ ہے خدا کی بندگی کا اور اس کے لیے بہترین نمونہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی مقدّر ہوئی اور پھر نبیؐ نے زندگی کو سنوارنے کے کام میں محض دو چار باتیں ہی نہیں کہیں۔ کسی چھوٹی بڑی تفصیل کو نظر انداز نہیں کیا۔ ایک اچھا مصوّر صرف قد و قامت یا دست و بازو کے حُسنِ تناسب ہی کو کاغذی پیرہن نہیں پنہاتا بلکہ ابرو و مژگاں تک کا ہر ہر بال اُس کے مُوئے قلم کے پیچ و خم کی رعنائی کا مظہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ، نگاہِ نبویؐ سے اوجھل نہیں رہا۔

اچھا تمدن ہے کیا چیز؟ انھیں جزئیات کی نگہداری۔ معاشرتی زندگی ہر ہر قدم پر دوسروں کی احتیاج اور اُن سے تعاون کا نام ہے۔ ہر شخص دوسرے کا محتاج ہے اور کوئی قدم بغیر تعاون کے ممکن نہیں۔

دیکھا جائے تو انسان، اپنی پیدائش سے موت تک، محتاجیوں کے ایک طویل سلسلے میں سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے تو بقائے حیات کے لیے ماں کے دودھ کا محتاج ہوتا ہے، آگے بڑھتا ہے تو باپ کے کمائے ہوئے رزق کا محتاج۔ علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اساتذہ کے علم کا محتاج، بیمار ہو تو طبیب کے دستِ شفا بخش کا محتاج۔ اور جب کارزارِ حیات میں اُترتا ہے تو پھر تو اُس کی محتاجیوں کا کیا پوچھنا! پھر احتیاج کم اور ہوس زیادہ۔ الغرض، کوچے کوچے، گلی گلی رسوا ہوتا پھرتا ہے۔ تاآں کہ اُس کے قلب و ذہن پر خواہشاتِ نفسانی کے اندھیرے چھانے لگتے ہیں، اور وہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوصف شجر و حجر کے سامنے سرافگندہ ہو جاتا ہے۔

ایسے میں ایک آواز گونجتی ہے۔ کہو!

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۝ الفاتحہ: ۴

کیا کر رہے ہو؟ مانا احتیاج ہے۔ پھر بھی حاجت روا تو ہم ہیں۔ حاجتیں ہم پوری کریں گے۔ تمھیں ہر ہر قدم پر جوشِ بندگی میں خدا تراشنے کی ضرورت نہیں۔ تمھارے کرنے کا کام البتہ باہمی تعاون ہے اور تعاون بھی نیکی اور خدا خوفی پر، نہ کہ بُرائی اور عصیان پر۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۝ المائدہ: ۲

اب تعاون کا انحصار کس شے پر ہے؟ یاد رکھیے تعاون سے زیادہ نازک اور کوئی معاملہ نہیں۔ یہ جذبہ دودھ کی طرح ہے جب تک خالص ہے، جب تک برتن صاف ہے، جب تک گندے ہاتھوں سے محفوظ ہے یہ زندگی بخش اجزا کا بے مثال مجموعہ ہے جو رگ و پے کو تر و تازہ کرتا چلا جاتا ہے، لیکن جُوں ہی اس میں کھٹائی پڑی یہ پھٹ گیا۔ چناں چہ تعاون کے شیرِ جاں بخش کو کھٹائی سے بچانے کی بہترین صورت وہ ہے جس کا حکم یوں قرآنِ کریم میں دیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۝ النساء: ۵۸

"امانتیں حق داروں کو لوٹا دیا کرو۔"

میرے علم میں مدنیت کے قیام اور اس کے فروغ کے لیے اس سے زیادہ جامع اور کوئی حکم یا نصیحت انسان کے پورے علمی سرمایے میں نہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ اس حکم کے تحت ہم سب کے اعزاز میں گراں قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے امانت دار ٹھہرائے گئے ہیں۔ آپ کی

کچھ امانتیں مجھے ادا کرنا ہیں اور میری کچھ امانتیں آپ کے ذمّے ہیں، ہم میں کا ہر شخص صاحبِ امانت ہے۔ گویا ہر جج کی ڈِگ، ہر قاضی کا عمامہ، ہر معلّم کی مسند، ہر تاجر کا ترازو، ہر سرمایہ دار کی تجوری، ہر مزدور کا کدال، ہر کسان کا ہل، ہر سپاہی کی تیغ، ہر قلم کار کا قلم، ہر خطیب کا نُطق، ہر طبیب کی مسیحا نفسی، ہر شوہر کی وفاداری، ہر بی بی کی عصمت، ہر باپ کا جذبۂ پدری اور ہر فرزند کے آدابِ فرزندی، اسی امانت کے مختلف روپ ہیں جو ہمیں، جہاں کہیں ہم ہیں، متواتر ادا کرتے رہنا ہے۔ یہ امانتیں ادا ہوتی رہتی ہیں تو معاشرتی نظام چلتا رہتا ہے۔ تمدّن نمو پذیر ہوتا رہتا ہے۔ جہاں نیتوں میں فتور آیا، وہیں فساد کی صورت پیدا ہو گئی۔

اب ذرا حضورؐ کے زمانے کو پیشِ نظر رکھیے۔ مکّی زندگی میں اسلام یوں رُونما ہو رہا تھا کہ جیسے خشک سالی کے بعد رحمتِ خداوندی کا چھینٹا۔ مکّے کی سنگلاخ وادیوں میں دُور و نزدیک اِکّا دکّا پھُول کھِل اٹھے۔ ان کی بہار اپنی جگہ، ان کی باصرہ نوازی اپنے مقام پر لاجواب، لیکن جس بستی کو دامانِ باغبانؐ بننا تھا وہ یثرب کی بستی تھی جہاں سب کے پھول ایک ہی دامن میں بھر گئے اور ان میں گُلِ سرسبد حضورؐ کا اپنا گھرانہ تھا اور یہی وہ سرچشمہ تھا جہاں سے تمدّنِ اسلام کے سوتے پھُوٹنے والے تھے۔ یہیں سے امّت کی شیرازہ بندی ہونا تھی اور یہی مقام اسلام کی پُوری کائنات تھا۔ ادائے امانت کے سب آداب یہاں سکھائے جانے والے تھے۔

اب ذرا گرد و پیش کے معاشروں پر بھی نظر ڈالیے۔ انسان تمدّن کی زندگی کتنی صدیوں سے گزار رہا تھا۔ مشرقِ بعید میں دیوارِ چین، ہندُستان میں ایجنٹا کے غار، افریقہ میں اہرامِ مصری، بابل و نینوا میں قصرِ شیریں۔ اور انہار کا سلسلہ اور ان سے قبل، سرزمینِ پاکستان پر موہنجو ڈرو اور ٹیکسلا سب انسان کے تمدّن کی دلیلیں تھیں۔ فکری اور رُوحانی دنیا میں ہومر کا ایلڈ، کالی داس کے ڈرامے، زرتشت کے ملفوظات، بُدھ کی تعلیمات، منو کی سمرتیاں، افلاطون اور ارسطاطالیس کے رشحاتِ قلم سب انسانی تمدّن کے شاہکار تھے، لیکن ان سب کو یکے بعد دیگرے کھنگال جائیے اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود ان کے خیال کی حد یا ذاتِ شاہ تھی یا سنگِ صنم۔ یا نمرود و فرعون کی طرح بادشاہ تھے۔ یا ہندرابن اور اولمپیا پر بسنے والے کھلندرے دیوتا۔ اور ان کے درمیان انسانیت جو اشراف و رذائل میں منقسم تھی برابر پس رہی تھی۔

افلاطون، یونان کا نامور فلسفی، اور منو، ہندُستان کا نامور مقنن۔ انسانوں کو تہ در تہ بانٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ افلاطون کا عمرانی فلسفہ تو مدّت ہوئی ختم ہو گیا، لیکن منو کے نخچیر آج بھی سوادِ ہند میں انسانی شرف کو ترس رہے ہیں۔

چناں چہ اسلام کے تمدّن کی بنیاد، دو چیزوں پر رکھی گئی ۔ خداوندِ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور اُس کے بندوں کی تکریم پر ۔ اپنے بارے میں ذاتِ خداوندی نے کہا " لاالہ الاھو" اور اس کا اعلانِ کامل ہوا اُس روز جب کعبہ بتوں سے پاک کیا گیا ۔ اور بندوں کے بارے میں کہا "وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیٓ آدَمَ" الاسراء : ۷ ۔ تکریمِ آدم کی تکمیل جب ہوئی جب جبلِ رحمت کی بلندیوں پر سے ہر بلند و پست کو برابر کر دیا گیا ۔ گورے کالے، عربی عجمی کی تفریق مٹا دی گئی ۔

بہرکیف حاکمیتِ حق اور تکریمِ آدم دو ایسے بنیادی اصول تھے کہ جن پر اسلامی تمدّن کی عمارت اُٹھائی گئی ۔ شخصی جواب دہی، اور قومی مشورت کا پورا نظام اسی بنیادی فلسفے کی ایک جھلک ہے ۔

تکریمِ آدم کی ضمناً ایک بات یاد آگئی ہے آج متمدن دنیا میں اگرچہ نسلی تفاخر کے مٹنے کے نعرے لگ رہے ہیں اور اقوامِ متحدہ کو خلقِ خدا کے سامنے مساواتِ بشر کے عملی نمونے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے تاہم اقوامِ غالب کی تجربہ گاہوں میں کچھ اور ہی نوع کے علوم ایجاد ہو رہے ہیں ۔ جہاں کل تک کتابوں کی دکانوں کے شیلفوں میں GENETIC. ENGINEERING کی دو چار کتابوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا آج وہاں الماریوں پر الماریاں اس علم کی کتابوں سے بھری جا رہی ہیں ۔ اور یہ علم ہے کیا؟ سادہ الفاظ میں یوں سمجھیے کہ انسانی جسم سے بیماری خارج کرنے کے بہانے انسانیت کو ابدی آقاؤں اور ابدی غلاموں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ ۔ خدشہ ہے کہ اقبال کا شاہین تو منقار زیر پر رہ جائے گا اور نیٹشے کا سپرمین کیلئے نو رنیا کی لیبارٹریوں میں تیار ہو جائے گا ۔

آج کوشش ہو رہی ہے کہ انسانی جسم کی ساخت میں ایسی تبدیلی لائی جائے کہ ایک نسل کے اندر آقاؤں کی بلند نگاہی، اور دوسروں میں غلاموں کی خاک بسری بھر دی جاتے ۔ کچھ لوگ مستقل آقا ہوں اور کچھ مستقل غلام ۔ جب سرشت بدل گئی ۔ جبر و تعلیم سے نہیں بلکہ جسمانی ساخت سے تو پھر تسخیرِ آدم کا کام مکمل ہو گیا ۔ خدائے کعبہ نے تکریمِ آدم کی بشارت دی ۔ اور خداوندانِ مغرب نے تسخیرِ آدم کی ۔

اب پھر آئیے ارضِ مدینہ کی جانب حضور ؐ کے مدینہ منورہ تشریف لانے پر جب اسلام کو ایک خطۂ ارضی میسر آگیا (اور لفظ مدینہ خود مدنیت کا ضامن ہے) تو اس کی ہئیت کا تعین ان ہی دو جذبوں کے تحت کیا گیا ۔ عربستان کا قبائلی معاشرہ چند خوبیوں کے ساتھ ساتھ جس سب سے بڑی لعنت میں گرفتار تھا وہ ان کی خود سری تھی ۔ لاقانونیت ۔ چند رسمیں اور روایات ضرور قائم تھیں، لیکن سب کی سب اُن کی خواہشات کے تابع ۔ یہاں تک کہ جب لوٹ مار منظور ہوتی یا دشمن سے انتقام

لینا ہوتا تو مقدس مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے۔ خود سری کا یہ عالم تھا کہ جب قبیلے کا بُت کہ جس کے سامنے شب و روز سجدہ ریز رہتے اُن کی منشا کے مطابق فال نہ نکالتا تو تیروں کا مٹھا اُس کے مُنہ پر دے مارتے۔ بھائی بھائی کا دشمن۔

مدینے کے اندر یہود اپنے سرمایہ داری نظام کے تحت بس رہے تھے۔ بخت نصر کی گرفت سے بھاگے ہوئے تھے۔ انھیں جب نخلستانِ یثرب میں پناہ ملی تو اُن کی ریشہ دوانیاں پھر سے جاگ اُٹھیں۔ اوس و خزرج مدینے کے دو مشہور قبیلے یمن کے مارب بند کے بے قابو پانیوں سے بچ کر یہاں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ یہ سب عناصر باہم پس تو رہے تھے، لیکن ان کے اندر ایک ترقی یافتہ تمدن کا تصور قطعی نہیں تھا۔

چناں چہ اُن کی وحشت پسندی اتنی رُسوا ہو چکی تھی کہ جب عرب سے نکل کر پرچمِ اسلام ایران کی سرحدوں کی جانب بڑھا تو فردوسی کی زبان میں وہاں کے باشندے پُرانے تعصبات کی بنا پر پکار اٹھے۔ ع تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو۔

ایسے معاشرے کو متمدن کرنے کے لیے دو باتوں کا اہتمام کیا گیا۔

امن اور تعلیم

امن کے لیے حضورؐ نے اوس و خزرج کے صدیوں پُرانے بیر ختم کرا دیے اور یہود سے وہ مشہورِ انام معاہدہ کیا جسے تاریخِ تمدن میثاقِ مدینہ کے نام سے یاد کرتی ہے اور جو نمونہ بنا بعد میں آنے والے تمام بین الاقوامی معاہدات کا۔ اس معاہدے کے تحت یہود کو مذہبی آزادی اور جان و مال کی حفاظت دی گئی۔

(i) مدینے پر حملے کی صورت میں دفاع کے لیے یہود اور مسلمانوں کا مشترکہ محاذ تجویز ہوا۔

(ii) اگر جنگ مدینے سے باہر ہو تو یہود کو لشکرِ اسلام کے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(iii) ہر فریق کی خواتین کی عفت و عصمت کی حفاظت کی جائے گی۔

(iv) اور جب کوئی تنازعہ پیدا ہو تو وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے احکام کے مطابق طے ہوگا۔

تعلیم کے لیے مسجدِ نبویؐ مرکز بنی۔ اور یہ مقام محض عبادت گاہ نہیں تھا اسے ایک چانسری کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ یہیں سے وفود باہر بھیجے جاتے۔ یہیں سے شاہانِ وقت سے نامہ و پیام ہوتا۔ یہیں لشکروں کی ترتیب طے پاتی۔ اور یہیں باطن کے وہ پردے چاک ہوتے جن کا دُور کرنا اسلامی تصوف کا مطمعِ نظر ٹھہرا۔ اسی مسجد کا گارا، بالآخر مغرب میں جامعۂ قرطبہ اور مشرق میں جامعۂ شاہ جہانی

کا غازہ بنا۔ مسجدِ نبویؐ گویا تمدّنِ اسلام کا اوّلین گہوارہ بنا۔ خدا کی قدرت ملاحظ ہو کہ جس سرزمین کو اسکندر کی ہوسِ ملک گیری نے اپنے لیے سزاوارانہ سمجھا ہو اور وہ اس سے دامن بچا کے نکل گیا ہو وہیں سے شاہانِ وقت کے نام پیغامِ ہدایت جاری ہوئے۔ یہ مکتوبات ایک بشارت تھی کہ ایک نیا دین، ایک نیا تمدّن، ہدایتِ خداوندی پر مبنی، اُبھرنے والا ہے۔ جس کے دائرۂ اثر و نفوذ میں محض قبائلی حد بندیاں ہی نہیں ہوں گی قیصر و کسریٰ کی مملکتیں بھی ہوں گی۔

چناں چہ بعید نہیں تھا کہ مخالفت اور دشمنی کے جھکڑ بھی اغیار ایسے مثالی گھر کے سقف و بام کو اُڑانے کے لیے چلائیں۔ اس بستی کے یہود ہوں یا منافقین۔ اس کے پڑوس کے رؤسا ہوں یا فرماں روا سب کی نگاہیں کاشانۂ نبوت پر مرکوز تھیں اس لیے کہ یہاں سے ادائے امانت کی جو روشنی پھوٹ رہی تھی وہ ان اندھیروں کو پسپا کرنے والی تھی جو ان مفادات نے اپنے گرد و پیش اس غرض سے پھیلا رکھے تھے کہ وہ ان کے اندر انسانوں کے ضمیروں کا بے باکانہ شکار کرتے رہیں، امانتیں غصب ہوتی رہیں اور شرفِ انسانیت پامال ہوتا رہے۔ بقائے تکریم کے لیے ضروری تھا کہ ان اندھیروں کو شکست دی جائے اور اپنی شمع کی حفاظت کی جائے۔ اس کے لیے معاشرتی نظام میں ایک اور پہلو کا از خود اضافہ ہو گیا اور وہ مستحدی اور عسکریت کا پہلو تھا۔

آج کل اکثر لوگ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے ہیں کہ ہم مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے اندر اور باہر ہم پر فکری یورشیں ہو رہی ہیں اور عسکری یورشوں کی دھمکیاں برابر چلی آ رہی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اسلام کو کب دھمکیاں نہیں دی جاتی رہیں۔ مکّے میں طوفانِ سب و شتم تھا۔ مدینے میں سازشیں تھیں۔ پھر قیصر و کسریٰ کے عساکر کا ہجوم۔ پھر اندرونی خلفشار۔ پھر حروبِ صلیبیہ پھر فتنۂ تاتار۔ پھر مغربی استعمار۔ غرض یہ کہ ہمارے چراغوں کو گُل کرنے کے لیے کیا کیا آندھیاں نہیں اٹھائی گئیں۔

ان پے بہ پے اُبھرنے والی آندھیوں کا مقابلہ ناممکن ہو جاتا اگر امّت کے روبرو حضورؐ کا اسوۂ حسنہ نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اگر ایک طرف انسان کے دل میں جستجوئے حق کا جذبہ ہے تو دوسری طرف اسی دل کے اندر جستجوئے عافیت بھی ہے بلکہ عامۃ الناس کی اکثریت دوسری نوع کی جستجو کی جانب زیادہ رغبت رکھتی ہے اور جب بھی حق جوئی اور عافیت کوشی کے تقاضوں میں تصادم ہوا ہم میں سے اکثر نے گوشۂ عافیت کو ترجیح دی۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی ملاحظ ہو جب بھی کسی معاشرے نے عافیت کوشی کو اپنا مطمحِ نظر بنایا اسے عافیت کہیں میسر نہ آئی۔

مدنی معاشرے کی پہلی صفت چناں چہ یہ مقرّر کی گئی کہ وہ ہمہ وقت مستعد رہے۔ نفسیاتی طور

پر بھی اور بدنی طور پر بھی۔ نفسیاتی طور پر اندرونی ریشہ دوانیوں اور وساوس کے خلاف اور بدنی طور پر خارجی جارحیت کے خلاف۔ جنگِ احزاب، میں سمجھتا ہوں، اسلام کا شدید ترین معرکہ تھا۔ اس سے بدر و اُحد کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں جب اصحابِ بدر کے مدارج کی گواہ خود ذاتِ خداوندی ہو اُس کی اہمیت کیوں کر کم ہو سکتی ہے؟ میں افواج کی تعداد، حالات کی ناسازگاری اور کفر کی آخری بڑی کوشش کے پیشِ نظر جنگِ احزاب کو شدید ترین معرکہ کہہ رہا ہوں۔ افواج کی تعداد پر خود لفظ "احزاب" گواہ ہے۔ محاصرہ، سردی کا موسم، یہود کی اندرونی فتنہ انگیزیاں، مسلمانوں کی بے سرو سامانی، ان سب نے مل کر جو کیفیت پیدا کر دی تھی وہ خود قرآنِ حکیم کی زبان میں یوں بیان ہوئی ہے۔

"جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے اور جب وہ اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے۔ اور جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں۔ کلیجے مُنہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والوں کا خوب امتحان ہوا۔ بڑی ابتلا میں ڈالے گئے اور بڑی طرح ہلا مارے گئے۔" (۳۳:۸،۹،۱۰)

جب حالت یہ تھی تو اس وقت ارشادِ خداوندی ہوا کہ نبیؐ کے اسوہ کو پیشِ نظر رکھو۔ تمہاری تقلید کی وہ شے۔ دیکھتے نہیں کہ نفسیاتی طور پر وہ یقین و ثبات کا پہاڑ ہیں اور بدنی طور پر ہر دشوار چٹان اُن کی ضرب کے تحت ریزہ ریزہ ہو رہی ہے۔ پُر امید اتنے کہ سنگ و آہن کے تصادم سے بکھرنے والی چنگاریوں کے درمیان قیصر و کسریٰ کے در و بام کو زمیں بوس ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، پُر ہمت اتنے کہ پورے شہر کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے کہ دشمن کسی ناکے سے نقب نہ لگا سکے۔ مسلمان معاشرہ گویا ایک امانت تھی جس کی نگہداشت اُن کا فرض تھا۔ رُوحانی طور پر بھی، جس امت کے لیے وہ دعائے نیم شبی میں آنسو بہاتے ہوں اُس پر دشمن کا شب خون پڑتا ہوا کیسے گوارا کر سکتے تھے؟

کیا جنگِ احزاب سے بڑی دشواریاں آج ہمارے معاشرے کو درپیش ہیں؟ معاف کیجیے گا، دشواریاں بڑی نہیں۔ ہمتیں پست ہیں۔

اخلاقِ نبویؐ پیشِ نگاہ نہیں۔ یاد رکھیے اخلاقِ نبیؐ کا ایک اہم جزو، عسکریت تھی۔ آج "جنگِ ہمہ گیر" (TOTAL WAR) کا تصور عام سننے میں آتا ہے کہ کس طرح قوم کا ہر فرد اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے دائرۂ عمل میں شریکِ حرب و ضرب ہوتا ہے۔ بتائیے کہ ابتدائی دور میں اسلام کی کون سی جنگ ہمہ گیر نہیں تھی۔ کیا بچے اور خواتین گھروں کی زینت بنے رہے؟ کیا نبیؐ کے اپنے گھرانے کی خواتین پیش پیش نہیں تھیں؟

کہتے ہیں کہ نیپولین کے خلاف واٹرلو کی جنگ ایٹن اور ہیرو کے کرکٹ کے میدانوں میں جیتی گئی یعنی جو ڈسپلن ان درس گاہوں کے کھیل کے میدانوں میں سیکھا گیا وہ ضبط و نظم جنگ کے میدان میں کام آیا۔ تو کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بدر و احزاب کے معرکے، مسجدِ نبوی میں جیتے گئے کہ وہاں کی تربیت، مسلم معاشرے کو اتنا مستحکم و مربُوط بنا گئی کہ پھر کوئی معرکہ ناقابلِ تسخیر نہ رہا؟ معاشرہ جتنا مربُوط ہوگا اُس کی ضرب اتنی کاری ہوگی۔ مربُوط معاشرے سے مُراد تنگ و محبوس معاشرہ نہیں۔ تنگی اور حبس نشو و نما کی دشمن ہوتی ہے مربُوط سے مراد یک قدم و یک منزل ہونا ہے "قبیلے کے خیمے خواہ جُدا جُدا ہوں دل یکجا ہوں"؛ دلوں کو یک جا کرنے کی منجملہ اور کے ایک سبیل اسلام نے جو پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ خُلق کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ انفرادی خُلق اور اجتماعی خُلق۔

انفرادی خلق کا تقاضا یہ ہے کہ انسان، زندگی کو عطیۂ خداوندی سمجھے۔ زندگی کا احترام کرے۔ اس کی حفاظت کر کے بھی اور اسے کسی ارفع و اعلا مقصد پر قربان کر کے بھی۔ اور چُوں کہ یہ بات اٹل ہے کہ زندگی ہوگی تو مقصد حاصل ہوگا، اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ جسم کی حفاظت اور اس کی تربیت کرے تاکہ فعال زندگی بسر کر سکے۔ مختلف علّتوں کا شکار ہو کے صحت تباہ کرنے کو اسلام نے سخت ناگواری سے دیکھا ہے۔ اسی طرح غار و کوہ کی زندگی اختیار کرنے کو منع کیا ہے، اس لیے یہ دونوں طرح کی زندگیاں ادائے امانت سے فرار ہیں۔ انسان اگر کیلاش پربت پر سمادھی لگا کے بیٹھ جائے اور خود گیان دھیان کا انند اُٹھا تا رہے تو یہ خود غرضی کے سوا کچھ نہیں۔ ایسا شخص نیچے میدانوں میں رینگنے والی دُکھی مخلوق کے کسی کام کا نہیں۔ ایسا شخص بہ ظاہر اپنی اغراض سے قطعِ تعلق کیے ہوتا ہے، لیکن یہی شخص جو بیوی بچوں کے تعلق کو موہ مایا سمجھتا ہے صرف اپنی ہی جیو کی مکتی کے لوبھ میں پھنسا ہوتا ہے۔

اجتماعی خُلق سے ربط و ضبط اور نظم و ہم آہنگی آتی ہے اور یہ صفات پیدا ہوتی ہیں مساوات سے، اسلام فی الواقع فرد کے کمال کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کا کمال بھی چاہتا ہے، کیوں کہ اسے ایک ہمہ گیر اور عالمی مشن لے کے آگے بڑھنا ہے اور یہ کام جبھی انجام پا سکتا ہے جب انسان جماعت کا رُکن ہو۔ اور یہ رُکنیت ایمان پر مبنی ہو۔

ایمان ابدیت کے ابعاد (DIMENSIONS) کو پھیلا دیتا ہے اور جماعت کے ساتھ ایمان کی بہ دولت جو نسبت انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ انسان کو ایک ہمہ گیر پیغام کی رو میں شامل کر دیتی ہے۔ چناں چہ ایمان انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے خلق کا بنیادی عنصر بن کر مختلف نوع کے

انسانوں کو ایک معاشرے میں پروتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر ایمان چُوں کر خود ناقابلِ تقسیم ہوتا ہے، اس لیے اس کے احاطے میں داخلہ نیم دلانہ نہیں ہوتا، چُناں چہ مکمّل طور پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ اس معاشرتی نظام کی جو اخلاقِ نبویؐ کی روشنی میں تشکیل پاتا ہے چند خصوصیات یہ ہیں۔

(i) ہر شخص عبدیت کا پیکر ہوتا ہے۔

(ii) اس کا دائرۂ محبت پوری نوعِ انسان پر حاوی ہوتا ہے۔ وہ ہر کافر کو بھی ہونے والا مسلم سمجھتا ہے۔

(iii) ہر شخص خود کو امین سمجھتا ہے اور ادائے امانت میں ہمہ وقت کوشاں ہوتا ہے۔

اس میں حضورؐ کا امین کا لقب پانا، دلیلِ راہ ہے۔

پھر حضورؐ کی ہجرت کی رات اور اُن کا عرفہ کا دن کسے یاد نہیں۔ علی المرتضیٰؓ سے فرمایا کہ بھائی یہ امانتیں ادا کرتے آنا۔ امانتیں ایسے لوگوں کی جنھوں نے ترکِ وطن پر مجبور کیا اور جو خون کے پیاسے تھے۔ یہ ایفائے عہد کی لاثانی مثال ہے، لیکن ایک بات اور ذہن میں رکھنے کے قابل ہے۔ درست ہے کہ حضورؐ، چاندی اور سونے کے کچھ سکوں کو اُن کے حق داروں تک پہنچانے کا حکم دے آئے تھے، لیکن خود سب سے بڑی امانت ادا کر کے تشریف لے جا رہے تھے، اور وہ امانت تھی پیغامِ خداوندی کی ترسیل، اس لیے کہ جب دس برس بعد عرفات کے میدان میں ایک جمِ غفیر سے پوچھا کہ کیا میں نے امانت ادا کر دی ہے تو لوگوں نے گواہی دی کہ ہاں حضورؐ کر دی ہے۔ اس کے بعد اللہ کو گواہ بنایا۔

سُبحان اللہ! ادائے امانت میں یہ ذمّہ داری، یہ لگن، یہ اضطراب، ان میں کے ہر جذبے کا یوں حسین ہوناکہ 'کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست'۔

ادائے امانت کے عمل میں ہر شخص یوں مستعد ہوتا ہے کہ بدن ملّت کی امانت ہوتا ہے اور یوں جاں سپار کہ جان، مولیٰ کی امانت ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان جان سے بھی گزر جاتے تو یہ کہتا ہوا جائے۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

غرض یہ کہ، اسلامی تمدّن تمام تر ایک ہی نُکتے کی تفسیر ہے۔ ادائے امانت کی۔

اسلامی نظامِ عدل و احسان

جناب محترم ڈاکٹر سید محمد حیدر

اسلامی نظریۂ عدل کا افہام اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک خالق و مخلوق اور حیات و ممات کا ادراک نہ کیا جائے۔ اسلامی فلسفے نے صحیح اور جامع طور پر ان رشتوں کا تجزیہ کیا ہے جو عبد و معبود، کائنات و افراد کو مربوط کرتے ہیں۔ اس فلسفے سے ان رشتوں کی بھی عکاسی ہوتی ہے جو ہر مملکت کے شہریوں کے آپس کے تعلقات اور بین الاقوامی تنظیم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان رشتوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلامی نظریۂ عدل میں ویسی ہی جامعیت اور وضاحت موجود ہے جو فلسفۂ اسلام کے تحت تمام زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔

اسلامی نظامِ عدل زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہے۔ یہ محض اقتصادی امور کو زیرِ بحث نہیں لاتا بلکہ اس کے دائرۂ کار میں وہ خیالات اور احساسات و رجحانات بھی شامل ہیں جو بنی نوعِ انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ و رتبہ دے کر ممیز و ممتاز کرتے ہیں۔ دراصل اسلامی نظامِ عدل مختلف اقدار کے امتزاج سے معرضِ وجود میں آیا ہے جو دنیوی و دینی زندگی، روحانیت و مادیت، اخلاقیات و معاشیات کو مربوط کرتا ہے۔ اسلامی تصورات کے تابع انسانی زندگی حقیقی معنوں میں ایک وحدت ہے جس میں جسمانی خواہشات و روحانی ضروریات ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہیں کہ اُن کو کسی صورت میں علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے محبت و یگانگت، تعاون و اشتراک کے خیالات و رجحانات انسانی زندگی کی اساس ہیں۔ اسلامی فلسفہ انفرادی و اجتماعی مفادات میں توازن پیدا کرتا ہے۔ انسانی آرزوؤں، تمناؤں اور حوصلوں کے ساتھ ساتھ فلاحِ عامہ کی منصوبہ بندی اسلامی سماج میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اسلامی اعتقادات نہ تو افراد کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ اپنی حرص و طمع سے سماجی زندگی کے شیرازہ کو درہم برہم کریں نہ سماج کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ انفرادی قابلیت و اہلیت، ذکاوت و ذہانت کو کچل کر اُن کی شخصیات کو غیر موثر بنا دیا جائے۔

اسلام عبادت اور کاروبار، عقیدہ اور عمل، روحانیت اور مادیت، دُنیا اور آخرت اور زمین و آسمان سب کے درمیان وحدت کا قائل ہے۔ اسی عظیم وحدت سے اسلام کے فرائض و قوانین، ہدایات و حدود کی راہیں اُبھرتی ہیں۔ اس کی روشنی میں حقوق و فرائض کا تعین ہوتا ہے۔ نفع و نقصان کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ الغرض اس کے سارے اجزائے ترکیبی و اصول اسی اصل میں پنہاں ہیں۔

اسلامی نظامِ عدل مساوات کا نام ہے جس میں تمام اقدارِ حیات کی متوازن اور ہم آہنگ تخصیل عمل میں آتی ہے۔ البتہ فطری صلاحیتوں میں عدم مساوات ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ بعض افراد جسمانی و دماغی صحت، قوتِ برداشت اور جسمانی و ذہنی معراج حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ کچھ لوگ لاغر، نحیف، کمزور و بیمار پیدا ہوتے ہیں۔ تمام صلاحیتوں اور ہر طرح کی استعداد کو مساوی کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

غیر معمولی بلند اور اعلا و ارفع ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے وجود سے انکار بے معنی ہے۔ اسلام ان کی پوری رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ لہٰذا غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے افراد کو مواقع بہم پہنچاتا ہے کہ اپنے ثمرات بروئے کار لائیں۔ ان ثمرات میں سے اجتماعی مفادات کی خاطر جن اشیاء کی ضرورت ہو انہیں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام اطبا حکیم محمد سعید نہیں بن سکتے، البتہ جن اطبا میں حکیم سعید بن جانے کی خواہش مضمر ہو انہیں تقویت اور ساز گار ماحول بہم پہنچایا جا سکتا ہے تاکہ وہ فلاحِ عامہ کے لیے زیادہ موثر کردار ادا کر سکیں۔

اسلامی نقطۂ نظر نے سعیٔ پیہم اور جدوجہد کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے کھلے مواقع فراہم کیے ہیں۔ البتہ یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ ترقیاں و کامرانیاں حاصل کرنے کی یہ پرواز اس طور پہ جاری رہے کہ انسان غیر متقی نہ بننے پائے، کیونکہ اللہ ان ہی کو بلند مراتب سے سرفراز فرماتا ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ہنگامہ آرائی ہیں۔ اللہ کے نزدیک باقی رہ جانے والی نیکیاں و تقویٰ ہی بہتر ہیں اور انھیں سے معقول امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

اسلامی نظامِ عدل کی لازمی شرط یہ ہے کہ سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں۔ کسی شخص کی راہ میں حسب و نسب، رنگ و نسل، ذات و جماعت سے متعلق خیالات رکاوٹیں پیدا نہ کریں۔ ضمیرِ انسانی کو خالص مادی و معاشی اقدار کی خلافِ عقل پیروی سے آزاد کر دیا جائے۔

مال و دولت کو قدراً عملاً یا قدر کل کی صورت میں پیش کرنے کی اجازت نہیں زندگی محض روٹی کپڑے اور مکان کے گرد طواف نہیں کرتی۔ انسانی زندگی کا نصب العین معاشی ذمہ داریوں کو قبول کرتے ہوئے کسی بالاتر منزل کی جانب گامزن ہونے کی رہبری کرتا ہے۔

اسلام دولت کے سلسلے میں مالداروں پر غریبوں کا ایک حق واجب کر دیتا ہے۔ اس حق کا تعین سوسائٹی کے مفادات و مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سماج میں عدل قائم ہو۔ ایک حد تک مساوات کے قیام کے لیے فضا سازگار ہو۔ ترقی کی نئی شاہراہیں کھلیں۔ اس طور پر اسلام مادی و معنوی، دینی و دنیوی تمام پہلوؤں کی پوری طرح رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔

اسلام دنیا میں مکمل طور پر نظامِ عدل قائم کرنے کا آرزو مند ہے لہٰذا کسی نوبت پر محض اقتصادی عدل کو فوقیت نہیں دی گئی، اور یہ بھی مناسب متصور نہیں کیا گیا ہے کہ قانونی ذمہ داری ہی اس عدل کے قیام کا واحد ذریعہ بنے۔ چنانچہ اسلام نے اس نظامِ عدل کو ایک وسیع اور ہمہ گیر انسانی نظامِ عدل کی شکل دی۔ فرد کی سطح پر انسانی ضمیر اور سماج کی سطح پر قانونی ضابطہ بندی، اسلامی نظامِ عدل نے دونوں کو مربوط کیا اور ان دونوں سے کام لیتے ہوئے ایک طرف تو وہ آدمی کے وجدان میں راسخ تاثرات اور جذبات کو اُبھارتا ہے اور دوسری طرف وہ انسان کی فطری کمزوری سے بھی غافل نہیں رہتا۔

اسلام نے بنی نوع انسان کو ہدایت کی ہے کہ جس طرح اللہ نے ان کے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح وہ بھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ احسان کریں۔ والدین سے نیک برتاؤ قرابت داروں، مسکینوں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین قرآنِ حکیم میں مندرج ہے۔ ہمسایوں سے، رشتہ داروں سے اور مسافروں سے احسان کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو محبوب نہیں رکھتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ جو کنجوسی کرے اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرے۔ حکم ربی ہے کہ؛

> "تم میں جن لوگوں کو مال اور مالی فراخی نصیب ہے ان کے لیے مناسب نہیں کہ قرابت داروں، مسکینوں اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کرنے کی قسم کھا بیٹھیں۔" (النور : ۲۲)

اسلام انسانی شعور کو عدل کے علاوہ احسان کے اعتبار سے بھی ایک بلند سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ شعور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانیت کے عز و شرف کا باعث بن جاتا ہے۔ اللہ

تعالیٰ احسان کے تصور میں بھی بلندی پیدا کرتا ہے اور اسے خود اللہ کے ساتھ احسان قرار دیتا ہے۔ صدقہ کے لیے ایسے آداب مقرر کیے گئے ہیں کہ وہ صاحبِ مال کی طرف سے غریب پر تفوق و برتری کا اظہار نہیں بننے پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صدقہ کے محرکات لپیٹ ہوں اور جو شخص صدقہ قبول کرے اس کو احسان کا احساس دلایا جائے تو صدقہ بے معنی بن کر اپنے نیک اثرات زائل کر دیتا ہے۔ اسلام، دینے والوں اور لینے والوں دونوں کی طبیعت میں علو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ربّ العزت قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے: (ترجمہ)

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سَو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزائش عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے (اور) نہ دکھ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج و خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی، اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بُردباری اس کی صفت ہے۔ اے ایمان لانے والو اپنے صدقات کو دُکھ دے کر اور احسان جتا کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض نمائش کی خاطر لوگوں کو دیتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ (البقرہ ۲۶۴-۲۶۱)

غرضیکہ اسلامی نظامِ عدل کا تعلق زندگی کے ہر پہلو اور ہر طرح کے اعمال سے ہے جن میں تنظریات احسان بھی شامل ہیں۔ یہ نظام روحانی اور مادّی دونوں طرح کی قدروں پر حاوی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرتا ہے۔ یہ نظام قوانین کو ان کی اصل شکل میں نافذ کرتا ہے، معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی نگرانی کرتا ہے، اسلامی اصولوں کے مطابق دولت کی تقسیم کراتا ہے۔ اسلامی نظامِ عدل کی بنیاد صرف اس اصول پر ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور وہی شریعت وضع کر سکتا ہے جبکہ اسلام کے علاوہ دوسرے نظام ہائے عدل کی اساس اس اصول پر قائم ہے کہ حاکمیت انسان کی ہے اور وہ اپنے لیے شریعت وضع کرنے کا مجاز ہے۔

اسلامی نظامِ عدل کا گہرا تعلق تحفظِ عزتِ نفس سے ہے یہ وہ نظریہ ہے جس نے

تمام اقوامِ عالم کو متاثر کیا ہے۔ دنیا میں اسلام کا وقار بڑھانے میں اس خیال نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلامی فلسفہ سے ماخوذ تحفظِ عزتِ نفس کے نظریہ نے ثابت کر دیا ہے کہ دُنیا میں بیشتر مسائل اور تعلقات میں کشیدگی صرف اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ اکثر ممالک نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر تحفظِ عزتِ نفس کا خیال نہیں کیا۔ اب باوجود اس کے کہ مالی و اقتصادی وسائل میں کئی گنا اضافہ ہوا لیکن عزتِ نفس کے مجروح ہونے سے ذہنی انتشار اور اُلجھنیں بھی بڑھ گئیں، نہ صرف مختلف ممالک، ایک دوسرے کے درپئے آزار ہو گئے بلکہ ترقی پذیر ممالک کے شہری بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ اندرونی طور پر ان کی عزتِ نفس کا معقول خیال نہیں رکھا جاتا۔ اسلامی حکومتوں نے ایسی صورت میں مؤثر نظامِ عدل سے حالات پر قابو حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نظامِ عدل کو دیرپا بنانے کے لیے کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس کے تقرر کی فوری ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس پاکستان میں ضلع کی سطح پر مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ یہ مستقل سرکاری ملازم نہیں ہوں گے بلکہ اعزازی طور پر کام کریں گے۔ ان کی خدمات کے صلے میں انہیں معقول الاؤنس دیا جا سکتا ہے۔ کمشنران کا انتخاب عوام الناس کریں گے جو اس ضلع کے مستقل باشندے ہیں جہاں انتخاب عمل میں آتا ہے۔ وہی شخص بحیثیت کمشنر منتخب ہو سکے گا جو اپنی دیانتداری، غیر جانبداری، منصف مزاجی، حب الوطنی، اسلام دوستی اور شہری حقوق کے احترام کے لئے مثبت شہرت رکھتا ہو۔ بالغ ہو، صاحب نظر ہو، مجرم نہ ہو، ملزم نہ ہو، عوام اور انتظامیہ دونوں سے معقول رشتہ رکھتا ہو اور دونوں کے مسائل پر اسے دسترس حاصل ہو۔ کمشنر کے فرائضِ منصبی میں یہ بات شامل ہو گی کہ وہ مواضعات اور ضلع کے قصبات کا دورہ کر کے معلوم کرتا رہے کہ اس علاقے میں عوام کے بنیادی حقوق کو تو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اگر بنیادی حقوق تلف ہوئے ہیں تو کیا کسی شخص کے اختیارِ تمیزی کے غلط استعمال سے یہ صورت ظہور پذیر ہوئی ہے؟

کمشنران کو اس بات کی تحقیق کا بھی حق ہونا چاہیے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ ارکینِ انتظامیہ ایسے فیصلے تو نہیں کرتے جن کی موجودگی سے ضلع کے عوام اپنے بنیادی حقوق کو صحیح طور پر بروئے کار نہ لا سکتے ہوں۔ کمشنران کے لیے ان واقعات اور معاملات کا نوٹس لینا ضروری ہے جن سے عوام کو اپنی فریاد حکام بالا تک پہنچانے سے روک دیا جاتا ہو، یا اپنے مقدمات کی وکالت کی اجازت نہ ہو، یا مکانات کی ناجائز تلاشی لی جاتی ہو، یا آزادئ گفتار و کردار سے محروم

کیا جاتا ہو۔ یا جائیداد ناجائز طریقے پر ضبط کی گئی ہو، یا غیر معقول وجوہ کی بنا پر گرفتاری عمل میں آئی ہو، یا جبر و تشدد کے ذریعہ سے اقبال جرم کرایا گیا ہو، یا رشوت بالجبر حاصل کی گئی ہو، یا کسی شخص سے بیگار لی گئی ہو، یا کسی شخص کو اس کی خدمات کا معقول معاوضہ نہ دیا گیا ہو، یا رشوت لینے کی نیت سے کسی معاملہ کے فیصلہ میں غیر معمولی تاخیر کی جاتی ہو، یا کسی شخص کی عزت نفس کو بدکلامی سے مجروح کیا گیا ہو، یا کسی شخص کو اس کے استحقاق سے محروم کیا گیا ہو یا محروم کیا جاتا ہو، یا کسی درخواست گزار کو اہلکاران ہراساں و پریشان کرتے ہوں، یا نجی دشمنی کی بنا پر کسی شخص کے خلاف انتقامی کارروائی کی گئی ہو، یا کسی شخص کو اس چیز کی قیمت ادا نہ کی جاتی ہو جو اس نے انتظامیہ کو فروخت کی ہو، یا کوئی ایسی کارروائی کی جاتی ہو جس سے شکایت کنندہ کے احساس خودی و خود اعتمادی کو شدید تکلیف پہنچتی ہو تو کمشنران برائے تحفظ عزت نفس اس معاملے کی رپورٹ ممبران (اراکین) مجلس شوریٰ کو کریں گے تاکہ ایسے معاملات کا سدباب ہو سکے۔

حکومت وقت کو عوام کی شکایات کا ہر وقت ادراک ہو جس کے نتیجے میں حکومت وقت ہر دلعزیز بن جائے اور مضبوط سے مضبوط تر ہو۔

کمشنران برائے تحفظ عزت نفس اسلامی سماج میں نظریۂ عدل کو موثر بنانے میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ طریق عدل کو زیادہ موثر بنانے کے لیے انتظامی ضابطوں کی تشکیل کی فوری ضرورت ہے۔ انتظامی ضابطوں کی تشکیل کے پس پشت یہ خیال کارفرما ہے کہ جن افراد کو انتظامی فیصلوں سے صدمہ پہنچا ہے وہ ان ضابطوں کی مدد لے کر ان افسران پر پابندیاں عائد کرا دیں جو اپنے معقول حدود سے متجاوز ہو کر عوام کی ایذا رسانی کا سبب بن جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی طرح ان ضابطوں کو قانونی شکل حاصل ہونی چاہیے۔ ان ضابطوں کا مقصد اولین یہ ہونا چاہیے کہ تمام سرکاری ملازمین کو اسلامی قوانین کا اس حد تک تابع بنا دیا جائے کہ وہ اپنے اختیارات تمیزی کا استعمال ان اختیارات و دفعات کے باہر نہ کر سکیں جو مروجہ قوانین نے فرائض متعلقہ کی انجام دہی کے لیے انھیں تفویض کیے ہیں۔

ان ضابطوں کے تحت اہلکاران انتظامیہ کو اس بات کا عادی بنایا جا سکتا ہے کہ وہ مختتم نتائج پر پہنچنے سے قبل امور زیر غور سے متعلق تمام دستاویزات و زبانی شہادت یکجا کر کے ان کی صحت کا اندازہ کر لیں۔ صحیح بات معلوم کرنے کے لیے اہلکاران کو اس بات کے لیے بھی آمادہ کیا جائے کہ وہ فریقین مقدمہ کی پیش کردہ شہادت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی ان واقعات

کی صحت کا اندازہ کرلیں جو معاملاتِ زیرِ غور سے متعلق ہیں۔

ہر انتظامی فیصلہ کے خلاف کم از کم ایک اپیل کی اجازت ہر صورت میں ہونی چاہیے۔ انتظامی ضابطوں میں اس بات کی ضمانت ہونی چاہیے کہ اراکینِ انتظامیہ ایسے فیصلے نہیں کریں گے جن سے قانون شکنی ہوتی ہو، مفادِ عامہ کو صدمہ پہنچ سکتا ہو، یا کسی شہری کے آئینی حقوق تلف ہوتے ہوں۔ انتظامی ضابطوں کے یہ مقاصد بھی ہوتے ہیں کہ انتظامیہ کے طریقِ کار میں عوام کا اعتماد قائم رہے۔ تعلیم نہ ہونے کی بنا پر یا لاعلمی کی وجہ سے کسی شخص کو نقصان نہ پہنچے۔ ان ضابطوں سے تمام اہلکاران انتظامیہ کو پابند کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہر اس فیصلے کا جواز، اسباب وعلل بھی تحریر کریں جو انتظامی فیصلہ کے محرک بنتے ہیں۔ یہ انتظامی ضابطے اراکینِ انتظامیہ کو ایسی خفیہ کاروائی سے باز رکھ سکتے ہیں جن کی خفیہ نوعیت سے مفادِ عامہ کو صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ انتظامی ضابطے ان اہلکاران کو فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے جو متبادل خیالات کو صحیح طور پہ وزن کرکے ان میں توازن نہ پیدا کرسکتے ہوں۔

ان انتظامی ضابطوں سے انتظامیہ کی سطح پہ پیدا شدہ بدنیتی، بغض وحسد اور تعصب کو بھی ختم کیا جاسکتا ہے۔ غرضیکہ کمشنران برائے تحفظِ عزتِ نفس کی تقرری اور انتظامی ضابطوں کی تشکیل سے اسلامی نظام مضبوط بنیادوں پہ قائم ہوسکتا ہے۔ ایسی بنیادیں جن میں فلاحی مملکت کا راز مضمر ہے، جن سے حکومتِ وقت کی عزت، شہرت اور وقار میں غیر معمولی اضافہ ہوسکتا ہے، جن سے اخلاقیاتِ نبوی کے اثرات تمام سوسائٹی کو محیط کرسکتے ہیں۔ جن سے عوام میں خود اعتمادی پیدا ہوسکتی ہے اور وہ اپنے خالقِ حقیقی کے ایماء کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہوسکتے ہیں۔ اس طور پر اسلامی نظام کے خطوط واضح ہوں گے اور اس کے نقوش تمام عالم کو تابناک بنادیں گے۔

تربیت فرد کا نبوی طریق

جناب محترم ڈاکٹر خالد علوی

آج کا انسان منظم معاشرتی زندگی بسر کر رہا ہے، اسے اس امر کا شاید احساس نہیں کہ اس تنظیم کے حصول تک اسے کن مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ منظم معاشرتی زندگی نے انسان کو بے پناہ منفعتیں عطا کی ہیں۔

انسانی کاوشوں نے جو اجتماعی ادارے تخلیق کیے اور پروان چڑھائے ہیں وہ ان کی فکری وسعتوں اور علمی عظمتوں کا احساس دلاتے ہیں۔ اجتماعی شعور رکھنے والا جب گرد و پیش میں معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور تفریحی ادارے (انسٹی ٹیوشنز) دیکھتا ہے تو اسے اطمینان ہوتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور علائق کا ایک گونہ تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ منظم معاشرے نے انسان کو تحفظ دیا ہے لیکن اس کی بعض انفرادی خوبیاں اور شخصی حسن کی رعنائیاں سلب کر لی ہیں۔ معاشرہ ایک غیر مرئی وجود ہے اور اس کے تمام اجتماعی مظاہر افراد ہی کے ذریعہ سے افراد ہی کے خلاف یا حق میں استعمال ہوتے ہیں۔ فرد اور اجتماع کی یہ کشمکش تخریب و تعمیر کا قابل توجہ منظر پیش کرتی ہے۔ شکست و ریخت اور بناؤ اور بگاڑ کی پوری انسانی تاریخ انسان کے عزم و ہمت کی داستان ہے۔ بظاہر تو فرد اجتماعی حالات اور معاشرتی ماحول میں جکڑا نظر آتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد کی باغیانہ حرکت، پرسکون سمندر میں طوفانی لہروں کی شکل اختیار کرتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا اجتماعی ڈھانچا ڈولتی کشتی کا نظارہ پیش کرنے لگتا ہے۔ نورِ وحی کی کرنوں سے محروم علمائے عمرانیات ابھی تک فرد اور اجتماع کے رشتے کو سنوارنے میں مصروف ہیں اور تاہنوز آخری اور قطعی فیصلہ دینے کے قابل نہیں۔

غیر مومنانہ طریق شک کے بجائے علم حقیقی کی صداقتوں کو بنیاد بنانے والوں کے ہاں فرد اور اجتماع کے مابین تعلق کا ایک حیرت انگیز توازن پایا جاتا ہے۔ اسلام انسان کے اجتماعی شعور کو ملحوظ رکھتا ہے اور باہمی میل جول سے پیدا ہونے والی اجتماعیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے نشو و نما میں معاونت کرتا ہے۔ وہ ایسے فطری اصول دیتا ہے جن سے اجتماعیت کو تقویت ملے۔ وہ اس کے لیے صالح بنیادیں فراہم کرتا ہے اور ایسے عوامل کا قلع قمع کرتا ہے جو اسے بگاڑ دیں۔ وہ مفید اور غیر

مفید جمعیتوں میں تمیز کا دستور دیتا ہے۔ اسی لیے آنحضورؐ نے فرمایا:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

یعنی: سنو تم میں سے ہر ایک نگراں اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے ماتحت افراد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

یہ امر ملحوظ خاطر ہے کہ اسلام فرد کی انفرادیت کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اجتماعیت کو بالآخر فرد ہی کی اصلاح و صلاح کا وسیلہ قرار دیتا ہے[1]

تمام انبیاءؑ کے مشن میں بالعموم اور خاتم النبیینؐ کے پروگرام میں بالخصوص فرد کی اصلاح و تربیت سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مدینہ کی مثالی ریاست کی تنظیم اور آئیڈیل معاشرے کی تشکیل انھی تربیت یافتہ افراد کی بدولت ہوسکی۔ حضورؐ کی تعلیمات میں فرد کو اس امر کا احساس دلایا گیا کہ وہ اپنے گناہوں کا تنہا ذمہ دار ہے۔ جو سزا اسے ملنی ہے اسے کوئی اور نہیں اُٹھائے گا۔

معاشرتی جرائم کی ایک سزا تو اجتماعی ہے جسے معاشرہ ہی نافذ کرتا ہے لیکن فرد کا انفرادی معاملہ اس کے رب کے ساتھ ہے جسے اس کو ہی نمٹانا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوگا۔ لہٰذا اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے اور اپنا فرض پورا کرنے میں دوسرے کا منہ نہیں تکنا چاہیے۔ اسے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ فلاں شخص نیکی نہیں کر رہا تو میں کیوں کروں؟ اسے صرف اپنا دامن گناہوں سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس کا معاشرتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک شخص اپنا احتساب کرتا ہے، اپنی اصلاح کرتا ہے اور اپنی برائیوں کے لیے دوسرے کو نمونہ نہیں بناتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اکا دکا کہیں کسی نازیبا حرکت کا ارتکاب ہوتا ہے تو مرتکب اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے، عریاں سمجھتا ہے اور اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اس اصولی قاعدے کو اس طرح بیان کیا:

علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم[2]

یعنی: اپنی فکر کرو جب تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں۔

فرد کی اس ذمہ دارانہ حیثیت کو مختلف پیرایوں میں اس طرح بیان کیا:

ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ[3]

یعنی: اور جو کوئی (بُرا) فعل کرتا ہے تو اس کا نقصان اسی کو ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔

---

[1] اسلام کا معاشرتی نظام ص ۲۷ [2] القرآن، ۵: ۱۴ [3] القرآن ۶: ۱۶۴

ان احسنتم احسنتم لانفسکم دان اساتم فلھا[1]

یعنی: اگر اچھے کام کرتے رہو گے تو اپنے ہی نفع کے لیے اچھے کام کرو گے اور اگر بُرے کام کرو گے تو (ان کا) وبال بھی تمھاری جان پر ہو گا۔

یہ ایک مسلّمہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقار اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے، حقوق و فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں، امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں، طاعت و جزا کی اُمید فرد کو دلائی گئی ہے۔ اس نظام فکر میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتداء میں عامل کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے اپیل کی گئی ہے۔ اسی کو اپنی ہدایت اور رہنمائی کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ دین اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرا دے تو آخری فیصلے میں اس جماعت کی اجتماعی خوبی اس کے لئے کچھ نافع نہیں ہو سکتی جس کے ساتھ وہ دنیا میں اپنا تعلق رکھتا تھا[2]

مقصد

فرد کی یہی اہمیت ہے جس کے پیش نظر اس کی تہذیب و تربیت اور تعلیم و تزکیہ کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ آنحضور ؐ نے وحی ربانی کی روشنی میں تربیت کا ایک جامع پروگرام دیا جس میں فکر و عمل اور رُوح و جسد کے تمام پہلو آ جاتے ہیں۔ غیر الہامی معاشروں نے اپنے افراد کی تربیت کا مقصد "اچھا شہری" بنانا قرار دیا ہے لیکن اچھا شہری ایک ایسی اصطلاح ہے جسے ہر اجتماع اپنے معیار پر جانچے گا۔ اس کے لیے کوئی ہمہ گیر اصول یا ضابطہ نہیں بنایا جا سکتا۔ وطن پرستی، نسل پرستی، قوم پرستی، ترک دنیا اور قومی مفاد کی خاطر دوسروں پر ظلم و تشدد تک سب کچھ اچھے شہری کے اوصاف میں آ سکتا ہے۔ اس کے برعکس نبوی پروگرام کا مقصد فرد کو ایک اچھا انسان بنانا ہے۔ وہ اس کے جوہر انسانیت کے نشو و نما ارتقا کا اہتمام کرتا ہے اور اُسے رحمت کا پیغامبر بنا کر معاشرے میں بھیجتا ہے۔ اس نے اعلان کیا ہے:

وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[3]

یعنی: تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

1۔ القرآن: ۱۷: ۷ 2۔ اسلام کا نظام حیات 3۔ القرآن: ۴۹: ۱۳۔

نبوی نقطۂ نظر سے فرد کی تربیت کا مقصد اس کی شخصیت کی ایسی متوازن تعمیر ہے جس سے نہ صرف یہ کہ وہ صالح ہو بلکہ معاشرے میں صالحیت کے نشو ونما کا باعث و داعی بنے۔ یہ صالح و متقی انسان وہ ہے جو اللہ کی بندگی کرتا ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ ہی کی رہنمائی حاصل کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس ارشاد خداوندی کا مصداق بنانا ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون[1]

یعنی: میں نے جنوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے نہیں پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔

اس تقویٰ شعار اور صالح انسان کی تیاری کے لئے رسول اللہؐ نے جو جامع پروگرام دیا ہے یہاں اس کے صرف دو بنیادی اصولوں کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ایک تعلق باللہ اور دوسرے خدمت خلق۔ فرد کی تربیت میں ان دو اصولوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

تعلق باللہ

انسانی اعمال کا انضباط منحصر ہے فکری یکجہتی و پاکیزگی پر۔ رسول اللہؐ نے تربیت فرد کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شعوری تعلق کو بنیاد بنایا ہے۔ قرآن وسنت کی نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ توحید معبودیت اور توحید ربوبیت کے ساتھ معیت الٰہی مقصود قرار دیا گیا ہے۔ اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ تعلق باللہ، ذات کے شعور و لاشعور کا حصہ بن جائے۔ مسلمان معاشرے میں بچے کے کان میں اذان دینے کا عمل اس بات کی علامت ہے کہ توحید ربوبیت کا وہ احساس تازہ ہو جائے جو عہد الست میں پیدا ہوا تھا۔ تعلق باللہ ہی وہ واحد اساس ہے جو فرد کی حیات کا رُخ صحیح رکھتی ہے اور یہی نبوی طریق تربیت کی بنیاد ہے۔ حضورؐ انسان کو ایسی تربیت مہیا کرتے ہیں کہ ہر لمحہ و ہر لحظہ اس کا تعلق اپنے رب سے برقرار رہے، اس کا تعامل اللہ کے ساتھ ہو، اس میں خشیت الٰہی[2] ہو، اس میں حب الٰہی کی لہریں اٹھتی رہیں اور رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے منہاج زندگی کی جانب رجوع کا جذبہ موجود ہو۔ وہ اپنی خلوت میں مصروف ہو یا اپنے ہم جنس انسانوں کے ساتھ ہو، عبادت میں مشغول ہو یا عملی جدوجہد میں لگا ہوا ہو، صنعت و تجارت میں منہمک ہو یا کار ریاست انجام دے رہا ہو، صلح و آشتی کے لمحات میں ہو یا نزاع و جنگ کے اوقات میں، وہ اپنے رب

۱۔ القرآن، ۵۱: ۵۶ ۲۔ القرآن، ۲: ۱۶۵

سے بے تعلق نہ ہو۔ اس تعلق کی معراج یہ ہے کہ اللہ کی محبت تمام محبتوں پر غالب آ جائے۔ ارشاد خداوندی ہے:

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حبا للہ [1]

یعنی: اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہمسر ٹھہراتے ہیں جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے، لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل اس آیت میں بیان فرما دی تاکہ کوئی ابہام باقی نہ رہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ [2]

یعنی: اے رسولؐ مسلمانوں سے کہہ دیں اگر تمھیں اپنے باپ، دادا، بیٹے، بھائی، بیوی اور رشتہ دار اور وہ اموال جو تم نے (بڑی محنت سے) کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم بہت ڈرتے ہو اور وہ مکانات جنھیں تم بہت عزیز رکھتے ہو۔ اگر ان میں کوئی چیز بھی تمھیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہو تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہو جائے۔ اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

کتب حدیث میں "الحب فی اللہ" کے ابواب میں آنحضورؐ کے مختلف ارشادات منقول ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حب الٰہی کمال ایمان و دین ہے اور فرد مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ جذبہ حب الٰہی سے سرشار ہو۔ مثلاً:

عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما وان یحب المرء لا یحبہ الا للہ تعالیٰ وان یکرہ ان

---

[1] القرآن، ۲: ۱۶۵ [2] القرآن ۹: ۲۴

یعیود فی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار۔

یعنی: حضرت انسؓ رسول اللہؐ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: تین صفات ایسی ہیں جس میں پائی گئیں وہ ایمان کی لذت پا گیا۔ یہ کہ اللہ اور اس کے رسولؐ ان کے علاوہ ہر چیز سے محبوب تر ہوں، یہ کہ انسان کسی سے صرف اللہ کے لئے پیار رکھتا ہو، اور یہ کہ کفر کی جانب لوٹنا اسے ایسا ہی مکروہ لگے جب اُسے آگ میں ڈالا جانا ناپسند ہو۔ (مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ ص۴۲۶)

اس محبت کے نتیجے میں انسان کو اللہ کی معیت و محبت حاصل ہوتی ہے جو بندے کے لئے بے مثال کیفیت ہوتی ہے کسی عاشق نے کہا ہے:

نسیت کل طریق کنت اعرفہ — الا طریقا یئودینی مرجبکم

اللہ تعالےٰ نے اپنی معیت اور بندے کی محبوبیت کا برملا ذکر کیا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ؀[1]

یعنی: بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور محسن بھی۔

حضرت موسیٰؑ نے اس معیت کا اظہار اس طرح فرمایا:

اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ؀[2]

یعنی: بلاشبہ میرے ساتھ میرا رب ہے یقیناً میری رہنمائی کرے گا۔

حضور اکرمؐ نے بھی ہجرت کے موقعہ پر اسی معیت کا ذکر کیا تھا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ؀[3]

یعنی، تم غمگین نہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

آنحضورؐ نے حب الٰہی اور معیت رب کا جو احساس پیدا کیا اس کے حصول و استحکام کا ذریعہ بھی بتا دیا۔ بلاشبہ یہ نعمتیں توفیق الٰہی اور فیض ربوبیت ہی سے حاصل ہوتی ہیں لیکن انسانی سطح پر جو کوشش ہو سکتی ہے اس کی جانب رہنمائی سے محروم نہیں رکھا گیا۔ باری تعالےٰ فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰہُ ؀[4]

یعنی: آپ کہہ دیں اگر اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

---

[1] القرآن، ۱۶: ۱۲۸ [2] القرآن، ۲۶: ۶۲ [3] القرآن، ۹: ۴۰ [4] القرآن، ۳: ۳۱

آنجنابؐ نے محبت خداوندی، معیت الٰہیہ اور قرب ربانی حاصل کرنے کے طریقے بیان فرمائے:

مایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احبتہ فاذا احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بھا و رجلہ التی یمشی بھا و ان سألنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لأعیذنہ۔[1]

یعنی: بندہ برابر طاعت وعبادات کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اُسے محبوب بنا تا ہوں اور جب میں اس سے پیار کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں ہی اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے طلب کرتا ہے تو میں دیتا ہوں۔ وہ میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔

معاذ اللہ اس کا مطلب حلول نہیں ہے، یہ بندہ کی اس کیفیت کا ذکر ہے جس میں وہ مرضئ الٰہی کے بغیر جنبش نہیں کرسکتا۔ تعلق باللہ کو مستحکم کرنے کا مفصل پروگرام دیا گیا ہے۔ آنحضور نے وحی الٰہی کی رہنمائی میں چند اصول بتائے جو اس تعلق کو مستحکم کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن وسنّت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت، ذکر الٰہی، مصاحبتِ صالحین، استحکام کا ذریعہ بنتے ہیں۔ عبادت انسان کی معراج ہے، اسی کے ذریعہ سے انسان عبدیت میں پختہ ہوتا ہے، شرک فی المعبودیت سے نجات حاصل کرتا ہے اور اللہ کی معیت وقرب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ[2]

یعنی: اے رسولؐ سجدے کئے جائیے اور قربِ حق حاصل کئے جائیے۔

یہ موقع عبادت کے مفہوم کو بیان کرنے کا نہیں، صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ عبادت الٰہی کی تاثیر ہے کہ انسان مادی قوتوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ مادی قوت جو منہاج ربانی سے ہٹی ہو باطل ہے، اور باطل سے مقابلہ لازمی ہے۔ یہ عبادت کا اثر ہے کہ انسان باطل کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس سے وہ بے پناہ قوت اور ناقابل شکست اعتماد حاصل کرتا ہے اور قرآن پاک کی اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے:

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ، ۱۹۷ ۔ [2] القرآن، ۹۶: ۱۹

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝[1]

یعنی: دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

عبادت کے ساتھ ذکر و فکر کا عمل اس استحکام میں مدد دیتا ہے۔ اللہ کی آیات میں غور و فکر اور اس کی یاد تربیت نفس کا موثر ذریعہ ہیں۔ ان کے باعث انسان اللہ تعالےٰ کے جلال کا شعوری احساس رکھتا ہے اور نفس کے فریب میں نہیں آتا۔ کبر و غرور اور ظلم و فرعونیت جیسے رذائل سے محفوظ رہتا ہے۔ قرآن پاک نے مومنین کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝[2]

یعنی: بے شک آسمان اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے اختلاف میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیئے (یہ وہ ہیں) جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اور فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور غور و فکر کرنے کے بعد پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے یہ کائنات بے قاعدہ نہیں پیدا کی۔

حکم ہوتا ہے واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون۔ یعنی: اور یاد کرو اللہ کو بہت تاکہ تم فلاح پاؤ۔

حضورؐ فرماتے ہیں:

اَلا ادلک علی ملاک ھٰذا الامر الذی تصیب بہ خیر الدنیا و الآخرۃ علیک مجالس اھل الذکر واذا خلوت فحرک لسانک ما استطعت بذکر اللہ واحب فی اللہ وابغض فی اللہ[3]

یعنی: کیا میں اس معاملہ کی بنیاد نہ بتاؤں جس کے ذریعے تم دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کرو؟ اہل ذکر کی مجالس میں بیٹھو اور جب خلوت میں جاؤ تو اپنی زبان کو حسب استطاعت ذکر الٰہی سے متحرک رکھو اور اللہ ہی کے لئے محبت کرو اور اللہ ہی کے لیے نفرت کرو۔

ذکر نہ صرف یہ کہ تعلق باللہ کو مستحکم کرتا ہے بلکہ روح انسانی کو ایسا رنگ دیتا ہے کہ پھر کوئی اور رنگ اس پر غالب نہیں آتا۔ ذکر کے بغیر تکمیل ذات ممکن نہیں۔ اقبال نے کہا:

---

[1] القرآن ۳: ۱۳۹ [2] القرآن ۳: ۱۹۰-۱۹۱ [3] مشکوٰۃ، کتاب الآداب باب حب فی اللہ (۲ ۴)

فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر　　فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

مصاحب

اچھے انسانوں کی مصاحبت انسان کے اندر تعلق باللہ کا احساس، عبودیت کا شعور اور حسن خلق کا انضباط پیدا کرتی ہے۔ قرآن پاک نے اپنے حکیمانہ انداز میں کفار کی حسرتوں کا ذکر کیا ہے:

يَاوَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ[1]

یعنی: ہائے افسوس، کاش میں فلاں کو دوست نہ بناتا اس نے مجھے ذکر سے منحرف کیا۔

قرآن کا حکم "کونوا مع الصادقین" کی تفسیر و توضیح میں رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصاحبت و معیت کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ حضور فرماتے ہیں:

لا تصاحب الا مؤمنا ولا یاکل طعامک الا تقی[2]

یعنی: مومن کے سوا کسی سے مصاحبت اختیار نہ کر اور تیرا طعام صرف متقی ہی کھائے۔

مصاحبت، فکری تربیت اور عملی تنظیم پر گہرے اثرات ڈالتی ہے، اسی لیے رسول اللہؐ نے حلقاتِ ذکر کی طرف توجہ دلائی۔ کتب حدیث کے ابواب الدعوات و الذکر ارشادات نبوت سے بھرے پڑے ہیں۔

دُعا

تعلق باللہ کو پختہ کرنے اور رُوح کی صحیح تربیت میں دعا کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ دعا انسان کی عبودیت اور حاجتمندی کے اظہار کا ذریعہ اور اللہ کی قدرت کاملہ، حاکمیت علی الاطلاق اور رحمت و غفران کا اقرار و اعتراف بھی ہے، نیز دعا تشکر و امتنان کا وسیلہ بھی اور عجز و نیاز کا اظہار بھی ہے۔ جس طرح ذکر روح کی بالیدگی کا باعث بنتا ہے، اسی طرح دعا بھی باطن کے گداز کا سبب بنتی ہے۔ دُعا کبر و غرور اور خود پسندی جیسے مہلک روحانی امراض کا علاج بھی ہے۔ دُعا کی وجہ سے جہاں انسان کو عزتِ نفس کے تحفظ کا احساس ہوتا ہے وہاں توجہِ الٰہی کے باعث بے پناہ اعتماد بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ کی ربوبیت و رحمت کے ساتھ ایسا گہرا ربط پیدا ہوتا ہے کہ انسان منقطع کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ دُعا کی لذّت اور قلب پر اس کی تاثیر کے احوال صرف وہی جانتے ہیں جنھیں اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلانے، سر جھکانے اور پرنم آنکھوں کے ساتھ کچھ عرض کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ قرآن و سنّت کی نصوص میں

---

[1] القرآن، ۸: ۴۵　　[2] مشکوٰۃ: کتاب الاداب، الحب فی اللہ، ۴۲۷۔

اس کی بے پایاں تاثیر کا ذکر موجود ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ[1]

یعنی: جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (کہہ دیں) کہ میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

کتب حدیث میں دعا پر مفصل ابواب میں مربئ اعظمؐ نے دعا کا طریق، اس کے آداب اور اس کی تاثیر کو بہ دلائل سمجھایا ہے۔ آنحضورؐ سے جو دعائیں منقول ہیں ان کے الفاظ پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک مسلمان کو کیسا انسان بننے کی ترغیب وتعلیم دے رہے تھے۔ دعا کے بارے میں فرمایا" الدعاء مخ العبادۃ" پھر فرمایا " الدعاء ھو العبادہ"۔

حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا یرد القضاء الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا البر[2]

یعنی: قضا کو صرف دعا ہی لوٹا سکتی ہے اور احسان و بھلائی کے سوا کوئی چیز عمر میں اضافے کا باعث نہیں بنتی۔

عبادت، ذکر الہٰی، مصاحبت اور دعا، وتشکر کے ذریعہ سے مستحکم تعلق باللہ فرد کی تربیت کا اولین ذریعہ ہے۔

خدمت خلق

نبوی طریق تربیت کا دوسرا بنیادی عنصر خدمت خلق ہے۔ فرد کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک لحاظ سے وہ اپنے خالق سے جڑا ہوا ہے اور دوسرے کے اعتبار سے وہ مخلوق سے متعلق ہے۔ خالق کے حوالے سے وہ احساس عجز ونیاز اور عبودیت وبندگی کو پروان چڑھاتا ہے اور مخلوق کی نسبت سے خدمت، نفع بخشی وفیض رسانی کو شعار بناتا ہے۔ خلق خدا اللہ تعالےٰ کا کنبہ ہے۔ اس کی خدمت اور اس سے حسن سلوک دنیا کی فلاح اور آخرت کی کامرانی کی ضامن ہے۔

نبی مکرمؐ کا ارشاد ہے:

عن عبد اللہ وابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ[3]۔

یعنی: عبداللہ اور ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا، مخلوق اللہ کا کنبہ

---

[1] القرآن: ۲: ۱۸۶ [2] مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، ۱۹۵۔ [3] مشکوٰۃ، باب الشفقہ والرحمۃ علی الخلق، ۴۲۵۔

ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو اس کے کنبے سے اچھا سلوک کرتا ہے۔

خدمت خلق ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں جسمانی خدمت، اخلاقی رویہ، مالی اعانت اور ممکنہ تحفظ شامل ہے۔ قرآن وسنت کی ہدایت سے پتہ چلتا ہے کہ حُسن خُلق دین کی روح ہے۔

قرآن پاک نے نیکی کے تصور کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ [1]

یعنی: نیکی یہی نہیں کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو۔ بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود اپنا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا۔ اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور جو لوگ وعدہ کرکے اپنے وعدے کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت، تکلیف اور لڑائی (میدان جنگ) میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہی وہ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

کتب حدیث میں "الشفقة والرحمة علی الخلق" اور "حسن الخلق" کے ابواب بھی موجود ہیں جن سے عملی زندگی کی پوری تصویر بنتی ہے۔ آپ حسن خلق ہی کو لیں، بیسیوں احادیث اس کی اہمیت و فضیلت اور تفصیلی حکمت عملی پر مل جائیں گی۔ آپؐ کی دعاؤں میں منقول ہے "اللهم احسنت خلقي فحسن خلقي" (یعنی: اے اللہ تو نے میرا سراپا اچھا بنایا ہے، میرے اخلاق کو بھی سنوار دے۔)

آپ نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

وَاهْدِنِي لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِف

[1]۔ القرآن: ۲: ۱۷۷۔

عنی سیئھا لا یصرف عنی سیئھا الا انت [1]

یعنی: اے اللہ مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور بُرے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو نہیں پھیر سکتا مگر تو۔

پھر فرمایا: اکمل المؤمنین ایمانا احسنھم خلقا۔

یعنی: مسلمانوں میں کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کا خلق سب سے اچھا ہے۔

مالی وجسمانی اعانت اجتماعی زندگی کی روح ہے اور فرد کے سکون کا ذریعہ جس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے مددگار رہتے ہیں وہ مادی طور پر خوشحال اور روحانی اعتبار سے مطمئن ہوتا ہے۔ اگر معاونت کی بجائے خودغرضی واستحصال کے اصول کارفرما ہوں تو وہ معاشرہ اسی دنیا میں جہنم بن جاتا ہے۔ میں یہاں حضور اکرمؐ کی چند احادیث پیش کرنا چاہوں گا جن سے پتا چلے گا کہ آپ کس طرح کے افراد تیار کرنا چاہتے تھے۔ ان احادیث میں ترغیب وترھیب کے شاندار نمونے ملیں گے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الساعی علی الارملۃ والمسکین کالساعی فی سبیل اللہ واحسبہ کالقائم لا یفتر وکالصائم لا یفطر (متفق علیہ) [2]

یعنی: ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں سعی کرنے والا، راوی کہتا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا جیسا وہ نمازی ہے، جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار ہے جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لا یؤمن عبد حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ [3]

یعنی: انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت کامل ایمان والا نہیں ہوتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ بھلائی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللّٰہ فی عَوْنِ الْعَبْدِ ما کان العبد فی عون اخیہ

---

[1] مسلم، باب الدعا فی الصلوٰۃ۔ [2] مشکوٰۃ، کتاب الادب باب فی الشفقۃ۔ ۴۲۲۔ [3] ۔ ۔ ۔ "

یعنی : اللہ اپنے بندے کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے ۔

پھر فرمایا :

عن عمران ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ ومن کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ و من فرج عن مسلم کربۃ فرج اللہ عنہ کربۃ من کربات یوم القیامۃ ومن ستر مسلماً سترہ اللہ یوم القیامۃ ۔

یعنی : حضرت عمرانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ تو خود اس پر زیادتی کرتا ہے نہ اسے کسی اور کے حوالے کر دیتا ہے اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں مصروف ہوگا اللہ اس کی حاجتیں پوری کرتا ہے ۔ جو شخص اپنے بھائی کی کوئی تکلیف دور کرے گا ، اللہ اس پر سے قیامت کی تکلیفیں کم کر دے گا اور جو اپنے مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کرے گا قیامت کے دن اللہ اس کے عیب لوگوں سے چھپا دے گا ۔

ارشاد خداوندی ہے کہ :

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۔ (القرآن ۷۰ : ۲۴-۲۵)

یعنی : جن کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے ۔

خدمت خلق تربیت فرد کا بڑا ذریعہ ہے کیوں کہ اس کے باعث انسان رذائل اخلاق اور نفس کے فریب سے نجات حاصل کرتا ہے ۔ اس دنیا میں فساد کا بڑا سبب فرد کی ہوس ، اس کی طبیعت کا بخل اور اس کا جبر و تشدد ہے ۔ یہ اُس کی ہوس کاری ہے کہ معاشرہ استحصال کا شکار رہتا ہے ۔ یہ اس کے نفس کا غرور ہے جو جبر و تشدد اور ظلم و وحشت کو جنم دیتا ہے ۔ اور یہ اس کا بخل ہے جو معاشی زندگی کے نشوونما کو روک دیتا ہے ۔ نبیؐ نے ان تمام اخلاقی بیماریوں کا علاج خدمت خلق سے کیا ہے ۔ خدمت خلق کے لیے محبت و شفقت اور نرمی و ہمدردی کے علاوہ ایثار و قربانی کا جذبہ بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے ۔ رسول اللہؐ کے تربیت یافتہ انصاری کا عمل وحی ربانی کا حصہ بن گیا ۔ جب رب کائنات نے فیض نبوت سے تربیت یافتہ انصاری کی تعریف کی ۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔

یعنی : یہ لوگ (مسلمان) ایسے ہیں کہ چاہے خود تکلیف میں ہوں مگر دوسروں

کے لیے ایثار کرتے ہیں۔

تعلق باللہ اور خدمت خلق تربیت فرد کے وہ بنیادی اصول ہیں جن کے بغیر کسی انسان کی نہ اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ تعمیر۔ حضورؐ نے ان اصولوں کو شخصیت کا جز بنانے کے لیے وعظ و نصیحت، جزا و سزا کے احساس اور سب سے بڑھ کر شخصی عملی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔

عہدِ نبوی کا نظامِ تعلیم و تربیت

جناب محترم ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

عہدِ نبوی کا نظامِ تعلیم و تربیت دنیا میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ انتہائی مبارک و مسعود ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین اور تقنین و تخطیط ابو الانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی نے فرمائی۔ اس سے ملت ابراہیمی اور امت محمدیہ کے درمیان دینی اور روحانی گہرے روابط استوار ہوئے۔

نظامِ تعلیم چار بنیادی عناصر پر مشتمل ہوتا ہے: (۱) مرکزِ تعلیم (۲) طلبہ (۳) معلّم (۴) نظامِ تعلیم و تربیت۔ سیدنا ابراہیمؑ کی لازوال عظمت و بصیرت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے نظامِ تعلیم و تربیت کے ان چاروں بنیادی عناصر کا تصوّر فرمایا اور انھیں معرضِ وجود میں لانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا فرمائی:

(۱) تعمیر بیت اللہ (۲) تخلیق امت مسلمہ (۳) بعثت محمدی۔ اور
(۴) نصاب تعلیم و تربیت۔

مرکزِ تعلیم و تربیت (بیت اللہ)

مرکزِ تعلیم و تربیت کی تاسیس و قیام کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ (القرآن ۲ : ۱۲۷)

ترجمہ: اور جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو دعا کیے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما، بیشک تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔

۲۔ اُمّت مسلمہ (طلبہ)

درس گاہ بیت اللہ میں عبادت اور حصول تعلیم و تربیت کے لیے آپ نے اُمت مسلمہ کی تخلیق کے لئے دُعا فرمائی:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔

(القرآن ۲ : ۱۲۸)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیے اور ہماری اولاد میں سے ایک اُمّت مسلمہ پیدا فرمائیے۔

اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور امت مسلمہ پیدا فرمائی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ

(القرآن ۲ : ۱۴۳)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔

۳۔ معلّم (رسولؐ)

درس گاہ بیت اللہ میں امت مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے معلّم کے فرائض انجام دینے کے لیے ایک رسولؐ کی بعثت کے لیے دُعا فرمائی:

ربنا وابعث فيهم رسولاً منهم۔ (القرآن ۲ : ۱۲۹)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار اس اُمّت میں انھیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔

اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی اور اُمّت مسلمہ میں اپنے فیض وکرم اور فضل واحسان سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ

(القرآن ۲ : ۱۶۴)

ترجمہ: خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا۔

۴۔ نصاب تعلیم و تربیت

اُمّت مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ایک نصاب تعلیم و تربیت تجویز

فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں منظوری کے لیے پیش فرمایا:

يتلوا عليهم اٰيٰتك و يعلمهم الكتٰب والحكمة ويزكيهم

(القرآن ۲: ۱۲۹)

ترجمہ: وہ ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے مجوزہ نصاب تعلیم و تربیت کو شرف قبولیت بخشا اور اس کے مطابق امت کی تعلیم و تربیت کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا:

هوالذى بَعَثَ فِى الاُمّيّينَ رسولاً منهم يتلوا عليهم اٰيٰته ويزكيهم ويعلمهم الكتٰب والحكمة۔ (القرآن ۶۲: ۲)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان مباحث سے معلوم ہوا کہ تعمیر بیت اللہ، تخلیق امت مسلمہ، بعثت محمدی اور تجویز ترتیب نصاب تعلیم و تربیت ایک ہی مقدس و مذہب سلسلے کی مضبوط و مرصوص کڑیاں ہیں۔ اس کا آغاز سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ابوالانبیاء سے ہوا اور تکمیل سید المرسلین، رحمۃ للعالمین اور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔

عہد نبوی کا نظام تعلیم و تربیت انھیں عناصر اربعہ پر استوار تھا جن کی تجویز و ترتیب اور تاسیس و تشکیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ اب ان چاروں عناصر کی مختصر طور پر اہمیت بیان کی جاتی ہے۔

مرکز تعلیم

انسانیت کے لیے اولین مرکز تعلیم و تربیت اور اسلامی درس گاہ بیت اللہ کو دنیا کے تمام مراکز اور تمام درس گاہوں پر جن خصوصیات کی بنا پر فوقیت حاصل ہے قرآن نے ان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مباركاً وَّ هُدًى لِّلعٰلَمين (القرآن ۳: ۹۶)

ترجمہ: پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکے میں ہے مبارک اور دنیا

کے لیے موجب ہدایت۔

اس آیت میں بیت اللہ کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں (۱) مبارک (۲) ہدی للعالمین۔ ایک جگہ بیت اللہ کی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس میں داخل ہونے والے کو امن وسکون نصیب ہوتا ہے۔

ومن دخلہ کان آمنا ط (القرآن ۳: ۹۷)

ترجمہ: جو اس میں داخل ہوا اس نے امن پالیا۔

ایک جگہ بیت اللہ کو انسانیت کی اجتماع گاہ اور امن گاہ قرار دیا گیا ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط۔ (القرآن ۲: ۱۲۵)

ترجمہ: اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے جگہ مقرر کیا۔

قرآن وسنت اور سیرت وتاریخ میں بیت اللہ کی اور بھی کئی صفات بیان ہوئی ہیں۔ مذکورہ آیات میں بیت اللہ کی صفات یہ ہیں: مبارک، ھدی للعالمین، اجتماع گاہ انسانیت اور امن گاہ انسانیت۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی تعمیر فرمائی۔ یہ مسلمانوں کا دوسرا بڑا تعلیمی وروحانی مرکز قائم ہوا اور یہ بھی انسانیت کے لیے برکت، ہدایت، اجتماع اور امن کا موجب ثابت ہوا۔ اسی طرح جیسے جیسے خلقت دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی گئی اور اسلام اکناف واطراف عالم میں پھیلتا چلا گیا ویسے ہی ویسے ان اولین اسلامی تعلیمی وروحانی مراکز کی طرز پر تعلیم وعبادت گاہیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ مسلمانوں کی درس گاہیں بابرکت ہوتی تھیں کیوں کہ ان کے بانی سیدنا ابراھیم علیہ السلام اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں خلوص، نیک نیتی اور تقویٰ کی بنیاد پر ان کی تعمیر کرتے تھے۔ ان میں رشد وہدایت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں برکت وہدایت کی موجودگی انسانیت کو اپنی طرف کھینچتی تھی اور متلاشیانِ حق اور تشنگانِ علم جوق درجوق ان اجتماع گاہوں کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ان کا پُر امن اور پُر سکون ماحول علم وتحقیق کے لیے مہمیز اور تعقل وتفکر کے لیے تحریک وتشجیع کا باعث بنتا تھا۔

درحقیقت اسلامی درس گاہوں میں برکت اور ہدایت کا ماحول طلبہ کی خداداد صلاحیتوں کو اُبھرنے پر آمادہ کرتا اور امن واجتماع کی معتدل، خوشگوار اور سازگار فضا انھیں بڑھنے، پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کے وسیع ووافر مواقع فراہم کرتی تھی۔ اگر مسجد نبوی پر درس گاہ کی حیثیت سے نگاہ دوڑائیے تو یہ نظم ونسق کے اعتبار سے مثالی، امن وسکون کے اعتبار سے

نمونہ، برکت و ہدایت کے اعتبار سے بے مثل نظر آئے گی۔ صحابۂ کرامؓ علوم و فنون کی ہر نوع کا علم حاصل کرتے۔ مختلف مسائل حیات پر اجتہاد و تحقیق کی تربیت پاتے، تلاش و جستجو کی تڑپ کے تحت بہت سے علمی، فکری اور تحقیقی سوال کرتے تھے۔ اس آزادانہ علمی ماحول میں ان کی علمی و فکری تربیت ہوتی۔ درس گاہ میں نظم و ضبط کا سب سے بڑا اور اہم ترین قاعدہ اور قانون معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور سیرت و کردار تھا۔ جبر و اکراہ اور تحکم و تسلط کی جگہ معلم کی اخلاقی قوت اور اس کی ذات کی عظمت و رفعت تھی۔ یہ فضا صحابہؓ کی صفات عالیہ کو پروان چڑھاتی اور شر و شرارت کو دخل اندازی کا موقع نہ دیتی۔

ان اسلامی درس گاہوں اور ان کے اوصاف و صفات کا موازنہ جب عہد حاضر کی درسگاہوں اور ان کی صفات سے کیا جاتا ہے تو ان کے مقصد و مدعا، ان کے ماحول اور ان کی فضا کا آپس میں کوئی ربط و تعلق نظر نہیں آتا۔ عہد نبوی کے تعلیمی و روحانی مراکز کی صفت قرآن نے یہ بیان کی ہے:

لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى۔ (القرآن ۹: ۱۰۸)

ترجمہ: مسجد جس کی بنیاد تقوٰی پر رکھی گئی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری درس گاہوں کی بنیاد بھی تقوٰی ہی ہے؟ کیا ان کا مقصد و مدعا اور ان کا ماحول اور فضا وہی ہے جو عہد نبوی کی تعلیم گاہوں کی تھی؟

آج دو قسم کی درس گاہیں قائم ہیں۔ ایک جدید نظام تعلیم کی درس گاہیں اور دوسری قدیم نظام تعلیم کی درس گاہیں۔ جدید نظام تعلیم کی درس گاہوں کا اصل الاصول تو مغربی فکر و فلسفہ ہے اگرچہ فروعات میں "لازمی دینیات" کے نام سے بھی ایک مضمون مختلف تعلیمی سطحوں پر شامل نصاب ہوتا ہے۔ مغربی فکر و فلسفہ اپنی مبادیات اور قواعد و کلیات کے اعتبار سے اسلامی معاشرتی نفسیات، تہذیب و تمدن اور دین و عقیدہ سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ حال ہی میں اشتراکیت و اشتمالیت نے بھی ہماری درس گاہوں پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اس صورت حال سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان درس گاہوں کے سامنے ملک و ملت کے حوالے سے کوئی بنیادی مقصد و مدعا موجود نہیں، اس نظام کے داعی اس کے حق میں اگر کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں تو فقط یہ کہ اس سے خواندگی کی شرح بڑھتی ہے اور نوکری مل جاتی ہے اور بس! اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب ہماری درس گاہوں کا مقصد و مدعا ہی متعین نہیں تو ان میں برکت و ہدایت اور اجتماع و امن کا ماحول کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اگر ان میں انتشار و

افتراق، فساد و طغیان اور قتل و بغاوت ہے تو یہ اسی صورت حال کا منطقی نتیجہ ہے۔ اگر وہ مبارک کی جگہ نامبارک، ہدایت کی جگہ ضلالت، اجتماع کی جگہ انتشار اور امن کی جگہ فساد کا نقشہ پیش کرتی ہیں تو یہ نتیجہ ہے اس نفاق کا جو تقویٰ کی جگہ ان درس گاہوں کی بنیاد ہے۔ یہ بغاوت ہے نوجوان نسل کی اس طبقہ کے خلاف جو اس نظام پر حاوی ہے جو یا تو نفاق کی وجہ سے مثبت تبدیلی کے حق میں نہیں یا نا اہلیت کے سبب بہتر نظام کے قیام کے قابل نہیں۔

دوسری درس گاہیں قدیم نظام تعلیم کی درس گاہیں ہیں۔ ان میں عربی اور مذہبی نصاب تعلیم رائج ہے۔ ان میں خلوص و تقویٰ موجود ہے مگر بہ حیثیت مجموعی فرقہ واریت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ مختلف فرقوں کی درس گاہوں کے احاطوں میں امن و سکون رہتا ہے۔ مگر ان کے بیشتر فارغ التحصیل جب مستند ہو کر باہر نکلتے ہیں تو ان میں کشیدگی پائی جاتی ہے جس کا اندازہ مساجد و محافل کے مختلف اجتماعات اور ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر قبضہ کرنے سے ہوتا ہے۔

ہماری جدید و قدیم درس گاہوں کو بامقصد اور تعمیری خطوط پر قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد عہد نبوی کی تعلیمی و روحانی درس گاہوں کی طرح تقویٰ پر رکھی جائے۔ انھیں برکت و ہدایت کا سرچشمہ اور امن و اجتماع کا مرکز بنایا جائے۔

طلبہ

نظام تعلیم کا دوسرا عنصر طلبہ ہیں۔ عہد نبوی کے طلبہ کی صفات قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ میں موجود ہیں جن کے سرسری مطالعے سے یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ ان کا سب سے بڑا مقصد اپنی سیرت کی تشکیل، کردار کی پختگی، دنیاوی امور میں مہارت اور اخروی مقاصد کا حصول تھا۔ خشیت الٰہی کے تحت حقوق و فرائض کی تعیین اور ادائی میں توازن اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ایثار، قربانی، محبت، شفقت، ہمدردی، غمگساری، محنت، دیانت، قابلیت سے کام لینا تھا۔ مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے لیے انتہا درجے کا شوق و ذوق، محنت و مشقت، احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے حق گوئی و بیباکی ان کے اوصاف تھے۔

قرآن حکیم نے عقل و فکر، تدبر و تعقل پر بڑا زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی کی درس گاہوں میں اندھی تقلید اور جمود کی جگہ اجتہاد کا دور دورہ تھا۔ طلبہ اپنی ذہنی، فکری، قلبی اور روحانی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے تھے۔ ان میں افراط و تفریط کی جگہ اعتدال پایا جاتا تھا۔ وہ دینی اور دنیاوی اُمور میں توازن برقرار رکھتے تھے۔ علوم و فنون میں انہماک انھیں اپنے خالق

و مالک کے حقوق کی ادائی سے غافل نہیں کرتا تھا نہ زہد وتقویٰ دنیاوی امور میں مہارت کی راہ میں مانع ہوتا تھا۔ ان کے سامنے نظام تعلیم کا مقصد ومدعا واضح تھا، اس لیے وہ اس کے حصول کے لیے ہمہ تن مصروف ومشغول رہتے، اپنی تمام تر توانائیاں اس کو حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیتے اور پورے امن وسکون کے ساتھ تحصیلِ علم میں لگے رہتے۔ پوری دلجمعی کے ساتھ اعلا مقاصد کا حاصل کرنا ان کا مطمحِ نظر ہوتا، بلند وبالا امور کی طلب وجستجو کی لگن، غیر ضروری، فضول اور بیکار کاموں کے لیے وقت ہی نہ چھوڑتی۔

یہی وہ صفاتِ عالیہ تھیں اور اوصافِ حمیدہ تھے کہ جن کی بدولت قلیل ترین مدت میں اس دور کے طلبہ نے وہ کار ہائے نمایاں انجام دیے جن کی مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے فقہ و قانون میں وہ اجتہادات کیے جن کی روشنی رہتی دنیا تک انسانیت کو آئین و قوانین کی ترتیب میں رہنمائی دیتی رہے گی۔ تعمیر وتشکیلِ شخصیت میں انھوں نے ایسی مثالیں قائم کیں جو قیامت تک انسانوں کے لیے رہبر و رہنما کی حیثیت سے موجود رہیں گی۔ علم وفضل اور عقل وتدبر کے ایسے شاہکار سامنے لائے جو تاریکی و جہالت سے نکلنے والوں کے لیے مشعل کا کام دیتے رہیں گے۔

معلّم

نظام تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت معلّم کو حاصل ہوتی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کے حقیقی معلم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: انما بعثت معلماً[1] (ترجمہ: مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے)۔ منصبِ معلم پر فائز ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلے اپنی قبل از نبوت سیرت وکردار کے بارے میں اپنے اہلِ شہر سے دریافت کیا اور پوچھا کہ میں چالیس برس تک آپ لوگوں میں زندگی بسر کر چکا ہوں آپ نے مجھے کیسا پایا؟ سب لوگوں نے شہادت دی کہ آپ سیرت وکردار کے بلند وبالا مقام پر فائز ہیں، آپ صادق وامین ہیں ہم نے آج تک آپ سے سوائے سچ کے کچھ نہیں سنا۔ اہلِ شہر کی اسی شہادت کو قرآن حکیم نے اس آیت کریمہ میں بیان کیا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (القرآن ۱۰:۱۶)

ترجمہ: میں قبل ازیں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم سمجھتے نہیں۔

آپ کے خلقِ عظیم کی شہادت سب سے آخری آسمانی وحی قرآن حکیم نے اس آیت میں

---

[1] ابن ماجہ، سنن، مقدمہ، ۱۷

بیان فرمائی ہے :

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿ (القرآن ۶۸ : ۴)

آپ یقیناً خلق عظیم رکھتے ہیں۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصبِ نبوت کے متعلق ارشاد فرمایا :

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ ۔ (امام مالک الموطا باب حسن الخلق)

ترجمہ : میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمی کے فرض کو جس حسن و خوبی سے انجام دیا وہ ایک ابدی و سرمدی نمونۂ عمل ہے ۔ اس فریضے کی انجام دہی کے لیے آپ نے جس خلوص، جذبے، محنت، محبت اور ہمدردی کو اپنایا اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی بصیرت افروز انداز میں اس آیت میں بیان فرمایا :

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿ (القرآن ۶ : ۱۸)

ترجمہ : (اے پیغمبر) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ ان کے پیچھے رنج کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر دیں ۔

جب تک معلم کو اپنے مقصد و مشن کے ساتھ ایسی ہی وابستگی نہ ہو اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں تعلیم و تبلیغ کے منصب پر فائز ہونے کا حق نہیں رکھتا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، اعمال، افعال اور سیرت و کردار کا جو نمونہ بحیثیت مجموعی اُبھر کر نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اُسے قرآن حکیم نے تمام انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا اور قیامت تک تعلیم و تبلیغ سے وابستہ انسانوں کو اسے اپنانے کا حکم دیا ۔ چنانچہ قرآن حکیم کی تعلیم ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (القرآن ۲۱ : ۳۳)

ترجمہ : تحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے ۔

تاریخ عالم اس بات پر شاہد ہے کہ معلمینِ اسلام نے فرائضِ تعلیم سنبھالنے سے پہلے اپنی سیرت و کردار کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالا ۔ پورے جذبے، شوق اور مشن کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کی ۔ بکمال خلوص، محنت اور جانفشانی اپنے تلامذہ میں علم و ہنر کی جستجو اور تحقیق و اجتہاد کی تڑپ پیدا کی ۔

عہد حاضر میں اخلاق و کردار کی پستی اور سیرت و اعمال کی گراوٹ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم

ہوگا کہ بہ حیثیت مجموعی اس کی تہہ میں معلمین کا کردار پوشیدہ ہے۔ ان کی مقصد ومدعا سے لا پرواہی، محنت وجانفشانی سے پہلوتہی، طلبہ سے بے رغبتی وہ عوامل ہیں جن کا پرتو ان کے زیر تعلیم طلبہ کی ذات و شخصیت پر پڑتا ہے۔ جب تک معلمین اپنی سیرت وکردار اور اعمال وافعال کو اسوۂ حسنہ کے مطابق نہیں ڈھالتے اور اپنے اعلا اخلاق اور عمدہ کردار کو طلبہ کے لیے نمونے کے طور پر پیش نہیں کرتے اس وقت تک قومی وملی اخلاقی گراوٹ کا رخ تعمیر وترقی کی طرف نہیں موڑا جا سکتا۔

عہد نبوی کا نصاب تعلیم وتربیت

قرآن حکیم کی سورۂ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورۂ جمعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد اور آپ کی نبوت و رسالت کے فرائض منصبی بیان ہوئے ہیں۔ ان ہی مقاصد نبوت کے مطابق آپ نے امت مسلمہ کی تعلیم وتربیت فرمائی اور یہی بنیادی تعلیمی اصول عہد نبوی کا نصاب تعلیم وتربیت تھے۔

یہ نصاب تعلیم چار بنیادی اصولوں پر مشتمل تھا: (۱) تلاوت آیات (یتلوا علیھم آیاتک) (۲) تعلیم کتاب (یعلمھم الکتٰب)، (۳) تعلیم حکمت (والحکمۃ)، (۴) تزکیہ نفوس (ویزکیھم)

تلاوت آیات

سب سے پہلے اصول تلاوت آیات کو لیجیے: امام راغب اصفہانی تلاوت کے معنیٰ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "والتلاوۃ تختص باتباع کتب اللہ المنزلۃ (ترجمہ: تلاوت اللہ تعالٰے کی طرف سے نازل کردہ کتب کی اتباع کے لیے مخصوص ہے) اس کے ساتھ ہی تلاوت کا یہ معنیٰ بھی ہے: یقال فی القرآن فی شیٔ اذا قرأتہ وجب علیک اتباعہ: (ترجمہ: قرآن حکیم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب تو نے اس میں سے کچھ پڑھا تو تیرے اوپر اس کی اتباع واجب ہوگئی)۔

تلاوت سے مراد قرآن حکیم کے اوامر ونواہی، احکام وتعلیمات کی تلاوت، ان پر عمل کے نقطۂ نظر سے کرنا ہے۔ تلاوت کے دو مفہوم ہیں:

۱۔ قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور ان کا تقدس

۲۔ قرآنی احکام وقوانین اور اخلاقی وروحانی تعلیمات کا اتباع،

اس سے ظاہر ہے کہ " یتلوا علیھم ایتک " کا مفہوم یہ ہوا کہ قرآنی آیات کو عام کیا جائے ، انھیں نہایت دل سوزی کے ساتھ تلاوت کر کے ذہن نشین کیا جائے ' اور قلب و روح پر ان آیات کو نقش کیا جائے ۔ ملک و معاشرے میں موجود ہر فکر و فلسفہ پر ان آیات کا غلبہ ہو ، شعر و ادب پر قرآنی آیات کی چھاپ ہو ، معاشرے میں تمام افکار و خیالات ان کے تابع ہوں اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان کا چرچا ہو ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے وصال تک مسلسل تلاوت آیات کی ۔ آپ نے قرآنی آیات کو اس طرح تلاوت فرمایا کہ وہ روزمرہ کا موضوع بن گئیں ۔ موافق و مخالف سب ان ہی کے متعلق گفتگو کرتے ۔ آپ نے تلاوت کے ذریعہ سے قرآن کو اتنا عام کر دیا کہ قبل از اسلام کا شعر و ادب دب کے رہ گئے ۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر قرآنی آیات کے مختلف پہلوؤں پر مباحث و مذاکرات ہونے لگے ، حتیٰ کہ قبل از اسلام عرب تہذیب و ثقافت کا سرمایہ " سبع معلقات " بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھا اور ان کی جگہ قرآنی آیات نے لے لی ۔

آج اگر عہد نبوی کے نصاب تعلیم کے پہلے جزو " تلاوت آیات " پر مبنی ملک کے نظام تعلیم کو ترتیب دیا جائے تو نہایت صدق اور اخلاص کے ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں " تلاوت آیات " کو نصاب تعلیم میں پوری پوری اہمیت دینی ہوگی ۔ ایک مقررہ مدت کے اندر اندر ملک کے ہر فرد میں تلاوت آیات کی استعداد پیدا کرنا ہوگی ۔ اس کا عملی طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے نظام تعلیم کے درجۂ ابتدائیہ (پرائمری) میں پورے قرآن ناظرہ کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ ملک کا ہر پرائمری پاس بچہ پورے قرآن حکیم کو ناظرہ کے طور پر پڑھنے کی استعداد رکھتا ہو ۔ دوسرا بڑا کام یہ کیا جائے کہ قرآن حکیم کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ مختلف موضوعات کے تحت آسان اور عام فہم اردو زبان میں طلبہ کو پڑھایا جائے ۔

تعلیم کتاب

عہد نبوی کے نصاب تعلیم کا دوسرا بڑا اصول تعلیم کتاب ہے ۔ کتاب سے مراد ' اللہ تعالیٰ کی سب سے آخری وحی ، کتاب اللہ ، قرآن حکیم ہے ۔ اس کی تعلیم سے مراد اس کے احکام ، تعلیمات ، ارشادات ، ہدایات ، اوامر و نواہی کی تعلیم ہے ۔ پوری کتاب کو سمجھنا ، اس کے معانی و مفاہیم کو جاننا ۔ اس میں دیے گئے احکام کا علم حاصل کرنا ، اس کی تعلیمات ، ارشادات اور ہدایات کا فہم و ادراک پیدا کرنا اس کے اوامر اور نواہی کو سیکھنا ، تعلیم کتاب ہے ۔ قرآن حکیم ، خالق کی طرف سے مخلوق کے لیے آخری ، مکمل ، تمام و کمال ، غیر متغیر ، غیر متبدل ، ابدی ، سرمدی ہدایت

ہے۔ ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اسے پڑھے، اسے سیکھے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرے۔
تعلیم کتاب میں فرد سے زیادہ معاشرے پر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کا اہتمام کرے۔ عام حالات میں ہر فرد کو خود بخود تعلیم کتاب کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے یہ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظامِ تعلیم معرضِ وجود میں لائے جس کی بنیاد "تعلیم کتاب" پر ہو۔ قرآنی آیات کو پڑھنا اور ان کی تلاوت کرنا، تلاوت آیات ہے تعلیم کتاب سے مراد ان آیات میں دی گئی تعلیمات کو سیکھنا، انھیں جاننا اور ان پر عمل کرنا ہے۔ یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے کہ تلاوت کے علاوہ قرآنی آیات کا معنی اور مفہوم بھی سمجھا جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ملک وملت کے ہر فرد کو اس کا اہل بنانا کہ وہ قرآن حکیم کی جملہ تعلیمات کو سمجھ سکے اسلامی معاشرے کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اسلامی معاشرہ اپنے اس فریضے کو اپنی حکومت کی وساطت سے انجام دیتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی حکومت پر اس فریضے کی اصل انجام دہی عائد ہوتی ہے۔ حکومت تمام مسلمانوں کو "تعلیم کتاب" کا اہتمام اپنے نظام تعلیم کے ذریعے سے کر سکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک ومسعود عہد میں جو نصاب تعلیم ترتیب دیا تھا اس میں تعلیم کتاب ہی کو بنیادی، محوری اور مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کی حکومت کے جملہ ذرائع و وسائل تعلیم کتاب کے لیے وقف تھے۔ سربراہ حکومت اور تمام اعیان واعوان مملکت، تعلیم کتاب میں مصروف تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے خصوصی تربیت گاہیں برائے اساتذہ قائم فرمائیں۔ تربیت یافتہ اساتذہ کو ملک کے طول وعرض میں تعلیم کتاب کے لیے مامور فرمایا۔ مسجد سب سے بڑی درس گاہ قرار پائی۔ ملک کی تمام مساجد تعلیم کتاب کے لیے وقف تھیں، اور تمام مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ مسجد میں حاضر ہوں اور کتاب کا علم حاصل کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کا نظام تعلیم ایک مثالی نظام تھا۔ اس نظام کے ذریعے سے ہر مسلمان میں اتنی استعداد پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ اللہ تعالےٰ کے احکام، اس کی کتاب' قرآن حکیم' کو پڑھ کر خود سمجھ سکتا تھا۔ کتاب اللہ کی اس وسیع پیمانے پر تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت کے تمام شعبے خود بخود اسلامی سانچے میں ڈھلتے چلے گئے۔ معیشت، معاشرت' سیاست، عدالت، حکومت، تہذیب، تمدن، ثقافت تمام شعبے نہایت آسانی، دلی رغبت اور سہولت کے ساتھ اسلامی رنگ اختیار کرتے چلے گئے تعلیم کتاب مسلمانوں کے اخلاق و کردار پر اثر انداز ہوئی اور مسلمان کتاب اللہ کی تعلیمات کے زیر اثر انسانیت کے لیے نمونہ بن گئے۔ ان کے اعمال، افعال، سیرت، کردار، تہذیب اور اخلاق انسانیت کے لیے معیار قرار پائے۔ اللہ تعالیٰ

کی کتاب سے کو سیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ نظام حکومت کو چلانے والے عمّال اور حکام دیانت، امانت، محنت اور خدمت کا شاہکار بن کر سامنے آئے۔ عوام صدق، خلوص، ایثار، ہمدردی، اخوت، محبت، اتحاد و اتفاق کا مجسمہ بن کر ساری انسانیت کے سچے محسن و غمخوار ثابت ہوئے۔ شر، فساد، فحش، منکر مغلوب ہو گئے اور خیر، معروف، صلاح، فلاح غالب ہو گئے۔ بزدلی، چوری، دغا، فریب، مکاری، عیاری کی جگہ شجاعت، اولوالعزمی، بلند ہمتی، عزم صمیم، صدق اور خلوص ایسے صفات اسلامی معاشرت کا طرہ امتیاز قرار پائے۔ یہ وہ نتائج ہیں جو صرف ایک درست قدم سے برآمد ہوئے اور یہ درست قدم "تعلیم کتاب" کو نظام تعلیم کا مرکز قرار دینا تھا۔

"تعلیم کتاب" کو موجودہ نظام تعلیم میں رائج کرنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ درجہ ثانویہ (میٹرک) تک اسے لازمی قرار دیا جائے۔ ان پانچ سالوں میں "تعلیم کتاب" کو نصاب کا حصّہ اس طرح بنایا جائے کہ میٹرک پاس کرنے تک ہر طالب علم لازمی طور پر پورے قرآن مجید کا ترجمہ سیکھ جائے۔ اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ جائے۔ جس طرح حصّہ پرائمری میں پورا قرآن ناظرہ پڑھا دیا جائے۔ اسی طرح حصہ میٹرک میں پورے قرآن کا ترجمہ سکھا دیا جائے۔

تعلیم حکمت

قرآنی نصاب تعلیم و تربیت کا تیسرا بڑا اصول تعلیم حکمت (والحکمۃ) ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا حکمت سے مراد دین کی معرفت، اس کی فقہ اور اس کی اتباع ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک حکمت سے مراد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ کتاب سے مراد قرآنی احکام ہیں اور حکمت سے مراد ان احکام و شرائع کی حکمت اور ان میں انسانیت کے لیے مصالح و منافع کا بیان ہے۔ ان ائمہ مجتہدین و مفسرین کی آرا سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی نصاب تعلیم کا اصول ــــ "والحکمۃ" ــــ ایک نہایت جامع اصطلاح ہے جس میں وہ تمام علوم سمٹ آتے ہیں جن کا تعلق کتاب و سنّت کی تعلیمات سے ہے۔ کتاب و سنّت کی تعلیمات پر ایک سرسری نظر سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دینی و دنیاوی امور پر مشتمل ہر وہ چیز جو دنیا و آخرت میں انسانیت کے لیے فائدہ مند اور نفع بخش ہے ان تعلیمات میں موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکمت اسرار و رموز دین الٰہی کی گرہ کشائی بھی ہے اور کتاب و سنّت کی تعلیمات سے موافق اور ان کے مطابق تمام علوم و فنون بھی ہیں۔ یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ آپؐ کے ارشادات، فرمودات، تقاریر، اقوال، افعال و اعمال

پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے "الدین یسر" کی بڑی تلقین فرمائی، اور ساتھ ہی انسانیت کی فلاح و بہبود کا خیال فرمایا۔ حکومت، عدالت، قانون، تعلیم، معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب، تمدن، اخلاق، کردار، سیرت کی تشکیل و تعمیر میں آپ نے جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کیا وہ حکمت کی عمدہ تفسیر ہے۔" والحکمۃ" چوں کہ نظام تعلیم کی بنیاد ہے اس لیے اسے نظام تعلیم میں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ حکمت قرآن و سنت پوری طرح اجاگر ہو۔

" حکمت" قرآن حکیم کی بڑی جامع اصطلاح ہے جس سے بالعموم اسرار و رموز شریعت مراد لیے جاتے ہیں۔ فقہ اسلامی میں" حکم" کی علت بیان کی جاتی ہے جو اس کی حکمت ہوتی ہے۔ حکمت روحِ دین واسلام ہے اسے موجودہ نظام تعلیم میں بی۔ اے، بی۔ ایس سی تک لازمی طور پر پڑھایا جائے۔ تاکہ ڈاکٹر، انجینیر، ماہرین معاشیات، سیاسیات، معاشرت، عدالت اور تعلیم حکمت دین سے پوری طرح سرشار ہو کر دنیا میں پھیل جائیں۔ قرآن کی تعلیمات کی غایت اور ان کی روح پر مبنی نصاب تیار کیا جائے جس میں اسلامی عقائد، عبادات اور معاملات کی حکمت اور ان کا فلسفہ بیان کیا جائے، تقابل ادیان، تقابلِ قوانین اور تقابلِ افکار و نظریات کی تعلیم کے ذریعہ سے اسلام کی حقانیت اور فوقیت ثابت کی جائے۔ مخالفین کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے اور صدق و یقین کی دولت سے طلبہ کو مالا مال کیا جائے۔ اس سلسلے میں غزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ اور اقبال و دیگر مفکرین اسلام نے حکمتِ دین کے بیان میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کی روشنی میں لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔

تزکیہ نفس

اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کا چوتھا بنیادی اصول تزکیہ نفس ہے (وَیُزَکِّیْھِمْ)۔ تعمیر سیرت و کردار میں تزکیۂ نفس کو محوری حیثیت حاصل ہے۔ اذہان و قلوب کی تمام اخلاقی بیماریوں نیتوں اور ارادوں کے تمام فسادات کا علاج تزکیہ نفس ہے۔ سرکاری، عدالتی، تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، جملہ امراض اور ان کے انسداد و تدارک کا واحد حل تزکیۂ نفس ہے۔ عہدِ رسالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انتہائی گمراہ، بدعنوان اور حیوانی صفات و اوصاف کی حامل قوم کو تزکیۂ نفس کے ذریعہ سے دنیا کی سب سے بڑی بااخلاق، مہذب، متمدن اور صاحب سیرت و کردار قوم بنا دیا تھا۔ خلفائے راشدین رضؓ نے اسلام کے نظامِ تعلیم اور اس کے بنیادی اصول، تزکیۂ نفس کی بدولت ایران، عراق، شام، فلسطین، مصر، شمالی افریقہ کے انسانوں کو انسانیت سکھائی اور بعد کے ادوار میں یہ سلسلہ پوری دنیا میں پھیلتا چلا گیا۔

تزکیۂ نفس کو نظام تعلیم کا حصہ کیسے بنایا جائے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ تزکیۂ نفس کا عمل نظام تعلیم کے تمام مدارج کا لازمی جز ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ جو لوگ سمجھے بغیر بھی اس کی تلاوت کرتے ہیں وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور جو لوگ قرآن مجید کو ترجمہ کی مدد سے پڑھتے ہیں وہ تو یقیناً اس کا واضح اثر قبول کرتے ہیں۔ مگر تزکیہ کا تعلق علم و تعلیم کے بجائے عمل سے زیادہ ہے۔ تلاوت اور تعلیم کتاب وحکمت کا تعلق تو زیادہ تر تدریس سے ہے مگر تزکیئے کا تعلق خالصتہً عمل سے ہے۔ تزکیۂ نفس میں معلم کی ذات، سیرت و کردار اور نمونۂ عمل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ استاد ایک طرف قرآنی تعلیمات کی تدریس کے فرائض انجام دے اور دوسری طرف ان تعلیمات کا عملی مجسمہ بن کر اپنی سیرت و کردار کے اعلا، عمدہ اور پاکیزہ نقوش طلبہ کے صاف اذھان و قلوب پر ثبت کرے۔ قرآن حکیم میں تطھّر اور تزکیہ کی اصطلاحات ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں تطھر کا مفہوم ہے رذائل سے پاک کرنا، اور تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ فضائل سے آراستہ کرنا۔ رذائل سے پاکیزگی اور فضائل سے آراستگی معلم کے فرائض منصبی کا لازمی جز ہے۔ تزکیۂ نفس کا مطلب ترکِ دنیا ہرگز نہیں۔ تزکیۂ نفس کی افضل و اکمل ترین مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جتنی بھرپور زندگی آنحضرتؐ نے گزاری اس کی مثال تلاش کرنا دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو حضورؐ کی زندگی ہی کو اسوۂ حسنہ قرار دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

تربیت گاہیں

عہد نبوی کے نظام تعلیم و تربیت کا جو اجمالی خاکہ پیش ہوا اور اس کی روشنی میں موجودہ نظام تعلیم کی ترتیب و تدوین نو کے لیے جو تجاویز پیش ہوئیں ان پر عمل کی صورت میں آئندہ نسل سے اخلاق و کردار کی اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے۔ مگر موجودہ نسل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس طرز پر مدوّنہ و مرتبہ نظام تعلیم کے لیے اساتذہ کہاں سے میسر آئیں؟ انھی تقاضوں کے پیشِ نظر یہ تجویز ہے کہ اس نظام کا نقطۂ آغاز تربیت گاہیں قرار دی جائیں۔ اس وقت ہر درجۂ تعلیم میں تعیناتی سے قبل اساتذہ کو تربیت قبل از ملازمت دی جاتی ہے۔ اگر ان تربیت گاہوں کو فعال بنا کر ان کے نظام تعلیم و تربیت کو دینی و ملی تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایک مختصر مدت میں مطلوبہ معیار و قابلیت کے اساتذہ ہر سطح تعلیم کے لیے میسر آ سکتے ہیں۔

اس مقصد کا حاصل کرنا تین اہم امور پر منحصر ہے:— اوّل تربیت گاہوں کو تعلیم گاہوں

پر ترجیح دی جائے۔ قابل ترین، دیانت دار، محنتی، جوش عمل اور عقیدہ سے سرشار اساتذہ کو تربیت گاہوں میں مقرر کیا جائے۔ اس صورت میں اگر ایسے اساتذہ کو زیادہ سے زیادہ مراعات بھی دینی پڑیں تو اس سے دریغ نہ کیا جائے تاکہ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ مستقبل کے اساتذہ کی تربیت کے فرائض انجام دے سکیں۔ دوم: نصاب تعلیم و تربیت میں کتاب و سنّت کی تعلیمات کو مرکزی و محوری حیثیت دی جائے۔ انھیں مغربی فکر و فلسفہ کی ذیل کی حیثیت حاصل نہ ہو۔ سوم: تربیت اساتذہ پر مامور معلّمین کے انتخاب میں جہاں ان کی فنّی مہارت علمی قابلیت، محنت اور جانفشانی کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں ان کے خود تزکیۂ نفس پر عمل پیرا ہونے اور اسوۂ حسنہ کو عملی طور پر اپنانے کو بھی لازمی شرط قرار دیا جائے۔

اُسوۂ "رحمۃ للعالمین" خلقِ عظیم ہے

جناب محترم ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

آپ اہل علم و نظر اور نکتہ ور و نکتہ سنج ہیں۔ میرے مقالے کا عنوان سنتے ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا مافی الضمیر کیا ہے۔ اور میں کیا کہنا چاہتا ہوں! لیکن پھر بھی میں اپنے مقالے کے عنوان سے متعلق دو ایک تصریحات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

سب سے پہلے میں اس نکتے کی صراحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے "اُسوۂ رسول" کے بجائے "اُسوۂ رحمۃ للعالمین" کو کیوں ترجیح دی؟ اس کا مختصر اور سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ میں اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول ہیں، آپؐ بلاشبہ خاتم النبیین و سید المرسلین ہیں اور بلاشبہ آپؐ کی سیرت طیبہ ہی میں حسین کامیاب انفرادی و اجتماعی زندگی بسر کرنے کا حسین نمونہ ہے۔ جیساکہ رب علیم و حکیم کا ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (القرآن ۳۳: ۲۱)

لیکن آپ بحیثیت رسول اللہ، رحمۃ للعالمین تھے اور رہیں، لہٰذا آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی حقیقت رحمۃ للعالمین ہے، اور اس حقیقت و واقعیت کو خود اللہ جل شانہٗ نے انتہائی قطعیت اور معجز نما ایجاز بلاغت سے اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (القرآن ۲۱: ۱۰۷)

لہٰذا جب میں اسوۂ رحمۃ اللعالمینؐ کہتا ہوں تو اس سے اس حقیقت کا اظہار و اعتراف مقصود ہوتا ہے کہ پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہے "رحمۃ للعالمین"۔ نیز میں اس حقیقت پر بھی زور دینا چاہتا ہوں کہ لفظ "رحمۃ للعالمین" کی تنگنائے میں قرآن حکیم کے فلسفۂ اخلاق کا دریائے ناپیدا کنار مضمر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس رب علیم و حکیم نے یہ فرمایا کہ آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں، اسی کا ارشاد ہے کہ آپ صاحب خُلق عظیم ہیں:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (القلم ۶۸: ۴)

اس سے ثابت ہوا کہ رحمۃ للعالمین اور خلق عظیم ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں اور دونوں

لازم و ملزوم ہیں، نیز آپ کا اسوۂ حسنہ رحمۃ للعالمین یا خلق عظیم ہے۔ اس تمہید سے اس امر کی بھی توضیح و توجیہہ ہو جاتی ہے کہ میں نے کیوں اپنے مقالے کا عنوان: اسوۂ رحمۃ للعالمین "خلق عظیم" رکھا ہے۔

اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ "رحمۃ للعالمین" کا معنیٰ و مفہوم کیا ہے؟ یہ مصطلح قرآن حکیم کی ان مصطلحات میں سے ہے جنہیں ہم ان کی معجز نما معنویت و بلاغت کے باعث "اعجازات قرآن" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہر حال ائمہ لغت اور مفسرین کے نزدیک "رحمت" ایسی رقت و سعادت اور عواطف شفقت و محبت سے عبارت ہے جس میں احسان بھی شامل ہو، اور احسان اسی حسنہ، خیر اور حسن سلوک کو کہتے ہیں جس سے وہ شخص یا اشخاص خوش ہو جائیں جن سے احسان کیا جائے۔ رحمت کا مفہوم معلوم کرنے کے بعد اب ہم لفظ "عالمین" پر غور کرتے ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، عالمین عالم کی جمع ہے، جس کا ترجمہ عموماً جہان کیا جاتا ہے۔ عالم بے شمار ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں: عالم انسانی، عالم حیوانی، عالم نباتاتی، عالم جماداتی، عالم بحری، عالم فضائی، عالم سماوی اور عالم زمانی وغیرہ۔ حیات و موت کے ان عوالم کے ماوراء ایک عالم بیکراں اور بھی ہے۔ جسے قرآن مجید نے دار الآخرت اور الحیوان کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ الحیوان جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ہے "حیات محض" کا عالم ہے، یعنی اس میں زندگی تو ہو گی مگر موت نہ ہو گی۔ اس کے پھر دو عالم ہیں: جنت اور جہنم۔ اہل جنت لذت موت سے نا آشنا حیات محض کی لذت سے سرشار سدا عالم کیف و سرور میں رہیں گے۔ برخلاف اس کے اہل جہنم لذت حیات و ممات سے نا آشنا، عالم سکرات میں رہیں گے۔ قرآن مجید کی زبان میں وَلَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ (۲۰: ۷۴، ۸۷: ۱۳)

جہاں تک خود فرد بشر کا تعلق ہے، اس کے دو عالم ہیں: ایک معروضی دوسرا موضوعی۔ معروضی عالم اس کا معاشرتی جہان ہے، جس میں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن اس کا ایک اور جہان بھی ہے، جسے موضوعی یا داخلی عالم سے تعبیر کرتے ہیں، یہ اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے، یہ اس اعتبار سے کہ وہ اس کی خود تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ اور اس میں اسی طرح رہنے اور زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ جس طرح معاشرتی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام جہانوں کے لئے "رحمت" ہیں۔

یہاں اس لطیف نکتے کی طرف وضاحتی اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ رب رحمٰن و رحیم نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ آپ رحیم ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ آپ رحمت ہیں۔ سوال پیدا ہوا کیوں؟ اس کی علت غائی یہ ہے کہ رب جلیل و جلیل اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہے کہ آپ اس غایت درجہ رحیم ہیں کہ آپ کی ذات و خلق میں "رحمت" کے سوا کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جو رحمت کے منافی ہو یا اس زمرے میں نہ آتی ہو۔ یہ بات اہل علم و نظر سے پوشیدہ نہیں کہ قریب قریب ہر زبان کا یہ محاورہ ہے کہ کسی موصوف کی تعریف بدرجۂ اتم بلکہ مبالغہ کی حد تک مقصود ہو، تو اسے اس کی صفت سے موصوف کرنے کے بجائے محض صفت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنے کے بجائے کہ فلاں شخص

بے حد حسین ہے، یہ کہتے ہیں کہ وہ "حسن" ہے؛ اس سے اس امر کی توجیہہ و توضیح ہو جاتی ہے کہ کیوں رب رحمٰن و کریم نے آپ کو "رحمت" کہا۔ پھر یہ بھی نہیں فرمایا کہ آپؐ رحمت عالم ہیں، یعنی صرف عالم انسانی کے لئے رحمت ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ آپؐ جملہ مخلوقات اور جہانوں کے لئے رحمت ہیں، یعنی رحمۃ للعالمین ہیں۔ اس سے مقصود اس حقیقت پر زور دینا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف بنی نوع انسان، بری، بحری، فضائی جانوروں اور نباتاتی، جماداتی، سماوی عوالم بلکہ جملہ مخلوقات کائنات کے لئے رحمت ہیں۔ بالفاظ دیگر، اللہ تعالیٰ کی جملہ مخلوقات آپؐ کے عالمگیر و ہمہ گیر اخلاق حسنہ یا خلق عظیم سے مستفید و مستفیض ہو رہی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔ اصل یہ ہے کہ رحمۃ للعالمین اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ آپؐ ہر عالم اور اس کی مخلوقات کے لئے محبت ہی محبت، شفقت ہی شفقت اور احسان ہی احسان ہیں اور یہ بات آپ اہل علم و بصیرت جانتے ہیں کہ "محبت" کو خلوص و صدق اور قربانی و وفا شفقت کو ہمدردی و غم گساری، حلم و بردباری اور عفو و درگذر؛ اور "احسان" کو فلاح و بہبود، حسنہ و خیر، جود و سخا اور حسن سلوک و ایثار مستلزم ہیں۔

نہ صرف تاریخ، کتب احادیث و سیر بلکہ خود کلام الٰہی آپؐ کی سیرت حسنہ کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کا شاہد ہے کہ آپؐ جس طرح رحمۃ للعالمین تھے اسی طرح صاحب خلق عظیم بھی تھے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس لطیف و اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ خلق اس خیر، حسنہ یا نیکی سے عبارت ہے، جو طبعی و اضطراری ہونے کے ساتھ ساتھ ارادی و اختیاری اور شعوری بھی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حسن نیت و شعور کے بغیر نیکی حقیقت میں نیکی نہ ہوگی۔ علاوہ بریں خلق بھی رحمت کی طرح ایسا لفظ ہے جسے گنجینۂ معانی کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا، اور اس میں خصلت و عادت، قول و فعل اور رویہ و کردار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کا مطلب ہوگا کہ آپؐ کی خصلت و عادت، قول و فعل اور رویہ و کردار میں حسن بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حسن کے باعث ہی آپؐ کے محاسن یا مکارم اخلاق میں لامحدود عظمت و رفعت اور لامتناہی آفاقیت و ہمہ گیری پائی جاتی ہے؛ بالفاظ دیگر، آپؐ کا حسن خلق آپؐ کی رحمت کی طرح کل عوالم کو محیط تھا۔

پیغمبر اعظم و آخر اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ایک ایک گوشے کا مشاہدہ بالحق کیجئے، آپ لامحالہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حضور اکرم بلا شبہ حامل خلق عظیم اور رحمۃ للعالمین تھے اور اپنی تعلیمات، حکمت آموزی اخلاق آفرینی، سنت حسنہ اور تبریک رحمۃ للعالمین کے باعث آج بھی رحمۃ للعالمین ہیں اور ابدالآباد تک رحمۃ للعالمین رہیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں سچ تھا، جھوٹ نہ تھا، حسن تھا قبح نہ تھا، عدل تھا ظلم نہ تھا، صدق و اخلاص تھا، کذب و نفاق نہ تھا، شفقت و محبت تھی، حسد و عداوت نہ تھی، حلم و رحم تھا، غصہ و انتقام نہ تھا، ہمدردی و غم گساری تھی، تغافل و جفاکاری نہ تھی، انکساری و تواضع تھی، غرور و تکبر نہ تھا، سعادت و رافت تھی، قساوت و شقاوت نہ تھی، احسان و ایثار تھا، حسد و بخل نہ تھا، شیریں کلامی تھی، تلخ کلامی نہ تھی، صبر و استقامت تھی، کم ہمتی و ناشکیبائی نہ تھی، شجاعت

تھی بزدلی نہ تھی، الغرض، آپؐ کی سیرت حسنہ جملہ محاسن و مکارم اخلاق سے اس طرح مزین تھی کہ تاریخ کا فیصلہ یہ ہوا کہ آپؐ نہ صرف عالم انسانی بلکہ سب جہانوں کے لئے رحمت تھے، ہیں، اور ہمیشہ رحمت رہیں گے۔

تاریخ ہمیں بار بار اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ آپؐ اس قدر فیاض و سخی تھے، مخیر و محسن تھے کہ آپؐ کے پاس جو کچھ ہوتا اہل احتیاج میں تقسیم کر دیتے۔ چنانچہ آپؐ نے نہ صرف اپنی متاع بلکہ اپنی مالدار زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت بھی پہلے رفاہی کاموں اور پھر تحریک اسلام پر صرف کر دی۔ بعثت سے پہلے مکہ مکرمہ میں دو مرتبہ اتنا سخت قحط پڑا کہ بقول شیخ سعدی "یاراں فراموش کردند عشق" آپؐ سے قحط زدہ لوگوں کی حالت زار دیکھی نہ جاتی تھی اور آپؐ نے دونوں مرتبہ ہزاروں درہم و دینار بلکہ جو کچھ آپؐ کے پاس تھا، ان میں تقسیم کر دیا، لیکن اس شعر بلکہ حقیقت کے مصداق کہ

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا،

آپ کا قلب سعید، جو معمورۂ رحمت تھا، اپنی غایت درجہ جود و سخا اور ایثار و قربانی پر نہ مطمئن ہو سکتا تھا اور نہ ہوا، کیونکہ اس کی حقیقی آرزو تو یہ تھی کہ نہ صرف عرب بلکہ کل دنیا میں نہ بھوک و پیاس رہے نہ فلاکت و احتیاج، کوئی بے گھر نہ رہے نہ بے کار، کوئی کسی کا محکوم و غلام نہ رہے اور نہ محتاج و دست نگر، نہ کوئی مظلوم و بے کس رہے نہ مقہور و مغضوب، ساری دنیا میں نہ ظلم و جہل رہے نہ شرک و بت پرستی۔ الغرض کسی انسانی معاشرہ میں نمرود رہے نہ آزر، فرعون و ہامان رہیں نہ قارون و ابو جہل رہیں نہ ابولہب۔

آپؐ مسلسل اس مسئلے پر تفکر بالحق کرتے رہے کبھی خانہ کعبہ میں تو کبھی خلوت کدہ خانہ میں، اور آخر کار اس مسئلے کو حل کرنے کی طلب و جستجو آپؐ کو تنگنائے غار حرا میں لے گئی۔ آپؐ کی یہ طلب و جستجو دراصل صرف اہل عرب یا افراد نسل انسانی کے لئے نہیں بلکہ کل جہانوں کے لئے رحمت تمام بننے کی آرزو تھی۔ بالفاظ دیگر یہ ایک عالم گیر و ہمہ گیر اور حسین و منفرد انقلاب کی آرزو تھی، جو وہ اولاد آدم کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ خود آگاہ و خدا آگاہ بن جائیں اور شرک و بت پرستی سے نکل کر توحید کی روشنی میں آجائیں اور اس طرح اپنے وقت کے نمرودوں، آذروں، فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کی غلامی و محکومی سے نکل کر مکرم و آزاد زندگی گزار سکیں۔ نیز نہ صرف اپنی ذات، اپنے اہل و عیال، اپنی قوم و ملت اور نوع انسانی کے لئے بلکہ جملہ مخلوقات کے لیے رحمت بن جائیں۔

آپؐ کی آرزو سچی تھی اور رب العالمین کی حسین مخلوقات کی دنیوی و اخروی زندگی کو حسین تر بنانے کی حسین آرزو تھی اور پھر جس رب حکیم و علیم نے آپؐ میں رحمۃ للعالمین بننے کی استعداد بھی بدرجۂ اتم ودیعت کی تھی، اسی نے آپؐ کی آرزو پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا، اور آپؐ کو نبوت و رسالت کے حسن المقام پر متمکن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ کو اس حقیقت نفس الامری سے آگاہ کر دیا کہ

وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین (۲۱: ۱۰۷) اور انک لعلیٰ خلق عظیم (۶۸: ۴)

لہٰذا آپؐ کی سیرت حسین ترین نمونہ یا ماڈل ہے اور اب آپؐ کا فریضۂ رسالت دعوت اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمین کو چلانا ہے کہ وہ قیامت تک چلتی رہے، اگرچہ اسلام کی روح توحید میں خود ایسی قوت جمال و جلال ہے جو اسے ابد تک محرک رکھنے کے لئے کافی ہے۔

ساتھ ہی رب علیم و حکیم نے رحمۃ للعالمین کی رہنمائی کے لئے قرآن مجید ایسی معجز نما زندۂ جاوید کتاب کی تنزیل کا سلسلہ شروع کر دیا جو نور و ہدایت اور رشد و شفا ہے، نیز جو علم و حکمت اور عرفان و معرفت کا سرچشمہ ہے اور اس میں قلب انسانی کا تزکیہ و تصفیہ اور اس کی خداداد و معجز نما قوتوں کا نشو و ارتقا کرنے کی تاثیر حسن بھی ہے۔ بالفاظ دیگر، یہ آخری و محفوظ کلام الٰہی اپنے مخلص و متقی تلامذہ کے اخلاق کی تعمیر و تحسین اور تکمیل بھی کرتا ہے۔ یہاں اس از بس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اسلام محض ایک دستور حیات نہیں بلکہ تحریک بھی ہے اور اس کے بانی رحمۃ للعالمینؐ کے حوالے سے تحریک رحمۃ للعالمینی ہے، جس سے کل عوالم کی مخلوقات نے ابد تک مستفید و مستفیض ہونا ہے۔

علاوہ ازیں، حامل خُلق عظیم کی نسبت سے اگر اسلام کو تحریک اخلاق سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ اسلام میں حسن خُلق کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن خُلق کو مومن کی بنیادی صفت قرار دیا ہے۔ لہٰذا رحمۃ للعالمین نے سب سے پہلے لوگوں کے اخلاق کی تعمیر و تزئین کرنے کی خاطر انہیں ایمان و توحید کی دعوت دی اور ان پر توحید کی حقیقت آشکارا کی تاکہ وہ خود آگاہ و خدا آگاہ بن جائیں، شرک و بت پرستی کی تاریکیوں سے نکل کر حسن و حق کی روشنی میں زندگی بسر کریں اور اپنے دشمن ازلی و پیدائشی شیطان الرجیم کو پہچانیں اور اس کی محکومی و غلامی سے محفوظ رہ سکیں۔ صرف فرعون و ہامان، قارون و ابولہب، نمرود و آزر اور عبداللہ بن ابی اور مسیلمہ کذاب ہی تو شیطان کے بہکائے ہوئے نہیں بلکہ ہر زمان و مکان میں دینی و سیاسی احوال و ظروف کے مطابق اپنے آپ کو مختلف اسماء و القاب سے موسوم کر کے اور محافظ دین و ملک کا خرقۂ سالوس پہن کر شیطان کے بہکائے ہوئے لوگ کارزار حیات میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمینی کا اصل الاصول توحید ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار و اعتراف ہوگا جو قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ توحید ہی اصل دین و ایمان ہے اور اس میں اپنی نوعیت کی ایسی قوت جلال و حق ہے، جس کی حریف کوئی باطل قوت نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں، اس میں دیگر تمام ادیان پر غالب آجانے اور اقوام عالم میں اتحاد و ائتلاف پیدا کرنے کی قوت حسن ہے۔ یہ عقیدۂ توحید ہی تو ہے جس سے انسان میں حیرت انگیز فطری قوتوں کا شعور اپنی پوری شدت سے بیدار ہوتا ہے، ان قوتوں ہی کی بدولت وہ ایک طرف کائنات کی تسخیر کر سکتا ہے اور دوسری جانب اپنے نور ذات اور مکارم اخلاق کی تکمیل کر کے احسان و رضوان کے حسن المقام پر متمکن ہو سکتا ہے جو کہ معراج انسانیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کو اپنی ذات میں جذب کر کے اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہی اصل دین ہے۔ یہی صبغۃ اللہ

یا رنگ الٰہی ہے۔ اور رنگ الٰہی میں اپنے آپ کو رنگنے کا مطلب تخلقوا باخلاق اللّٰہ ہے۔ یعنی اپنے اندر صفات الٰہیہ پیدا کرو، جنہیں محاسن و مکارم اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شخصیت انسانی پر رنگ الٰہی جس قدر چڑھا ہوگا اسی قدر خلق انسانی میں وسعت و گہرائی اور رفعت و عظمت کی نمود ہوگی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک رحمۃ للعالمینی کا مقصود افراد نسل انسانی کو رنگ الٰہی میں رنگنا یا بالفاظ دیگر خلق انسانی کی تعمیر و تحسین کر کے اسے عظیم بنانا ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اظہار حقیقت ہوگا۔ چنانچہ جیسا کہ تاریخ بلکہ قرآن حکیم اور احادیث طیبہ سے ثابت ہے آپ نے جب اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمینی کو انتہائی ناساز گار حالات میں انتہائی کامیابی کے ساتھ چلا کر اپنے رسالتی مشن کی تکمیل کر دی اور اپنی تحریک کے ہزاروں رفقائے کار کو رنگ الٰہی میں رنگ دیا، بالفاظ دیگر ان کے مکارم اخلاق کی تکمیل کر دی اور انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ آپ کے مشن یا تحریک رحمۃ للعالمینی کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکیں، تو آپ اپنے ان ہزاروں صحابہ کرامؓ کے ساتھ حجۃ الوداع کا فریضہ ادا کرنے میدان عرفات میں اپنے اللہ جمیل و رب جلیل کے حضور حاضر ہوئے۔ اہل مہر و فا کی لبیک، اللھم لبیک کی ایمان افروز و روح پرور صداؤں سے فضا گونجتی تھی اور آسمان سے نور و رحمت کی بارش ہو رہی تھی تو آپ نے یہ ندائے فردوس گوش سنی:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا ط (۵:۳)

ترجمہ: آج کے دن ہم نے تمہارے لیے دین کی تکمیل کر دی اور ہم نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

یہ ندائے روح پرور آپ کے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود رب العالمین کی تھی اور اس میں یہ نوید جاں فزا مضمر تھی کہ مبارک ہو آپ نے اپنا رسالتی مشن پورا کر لیا ہے اور آپ نے مکارم اخلاق کی تکمیل کر دی ہے لہٰذا اب آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد فرزندان توحید آپ کے مشن یعنی اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمینی کو جاری رکھیں گے اور یہ ہمیشہ قیامت تک چلتی رہے گی۔

ان مباحث کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اپنے اخلاق کی تعمیر و تکمیل اور تطہیر و تحسین کرنا اور آپ کی تحریک رحمۃ للعالمینی کو چلانا ہی مقصود قرآن و سنت ہے، نیز جس طرح آپ نے اپنے رسالتی مشن کی تکمیل کی اور اپنی یعنی اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمینی کو چلایا اور اس راہ میں جس طرح صبر و استقلال سے مصائب و شدائد برداشت کیے اور جس جرأت و پامردی سے اس وقت کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں، نمرودوں اور آزروں کا مقابلہ کیا، اس میں حسین و کامل بندگی کرنے کا حسین نمونہ ہے اور یہی مفہوم ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳: ۲۱) کا۔

چنانچہ جو شخص مؤمن بن کر رحمۃ للعالمینؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمینی میں برضا و رغبت شامل ہو جاتا ہے اور بھرپور حصہ لینے لگتا ہے، وہ بشمول نوع انسانی کے کل مخلوقات کے لیے رحمت بن جاتا ہے۔ پھر وہ نہ تو مشرک و بت پرست ہو سکتا ہے اور نہ ظالم و جابر۔ وہ نہ منافق و متکبر ہو سکتا ہے اور نہ ریاکار و سرکش۔ وہ نہ

مسرف وبخیل ہوسکتا ہے اور نہ سود خوار و سرمایہ پرست۔ نہ تو عیار و کاذب نہ مفسد و مفتن۔ وہ نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا ہے نہ سر ہی جھکا سکتا ہے۔ وہ جلب منفعت کی خاطر نہ تو لوگوں کا استحصال کرتا ہے نہ حرام و ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرتا ہے۔ وہ نہ تو ضمیر فروش و جسم فروش ہوتا ہے اور نہ نطق فروش و قلم فروش۔ وہ اکتناز و احتکار کرتا ہے نہ چور بازاری و جعل سازی۔ اس کے ہاتھ، زبان اور قلم سے نہ تو کسی کو گزند پہنچتا ہے اور نہ کسی کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ وہ نہ قوت و اقتدار کے نشے میں لوگوں کی آزادی تقریر و تحریر سلب کرسکتا ہے نہ ان پر اپنا حکم ہی چلا سکتا ہے، کیونکہ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ (یوسف ۱۲: ۴۰)۔

یہی نہیں، تحریک رحمۃ للعالمینی کا رضاکار انسان تو انسان کسی حیوان کو بھی بلاوجہ ایذا نہیں پہنچاتا بلکہ ان کی پرورش و نگہداشت کرتا ہے۔ وہ پالتو جانوروں کی طرح جنگلی، صحرائی، کوہستانی، فضائی اور آبی جانوروں کو بھی اپنے ربِ رحیم و جمیل کی مخلوقات سمجھ کر ان کی پرورش کا اہتمام کرتا ہے۔ عالم انسانی کی طرح وہ عالم نباتاتی و جماداتی کے لیے بھی رحمت ہوتا ہے۔ وہ شجر کاری تو کرتا ہے، مگر شجر براندازی نہیں کرتا۔ وہ درختوں، پودوں اور فصلوں کی نشوونما کے لیے ان کا تزکیہ تو کرتا ہے لیکن انہیں نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح وہ جنگلات کی حفاظت کرتا ہے۔ اور انھیں نہ تو برباد کرتا ہے نہ برباد ہونے دیتا ہے۔ وہ زمین سے پانی نکالتا اور اس سے مستفید تو ہوتا ہے مگر اسے ضائع نہیں کرتا چشموں، نہروں، کاریزوں، ندی نالوں، دریاؤں اور جھیلوں کی حفاظت کرتا اور ان سے آب و توانائی حاصل کرتا ہے اور انھیں ضائع نہیں ہونے دیتا۔ وہ ماحول کو صاف ستھرا اور حسین بنانے کی کوشش کرتا ہے، اسے گندہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ زمین سے تیل، گیس اور طرح طرح کی معدنیات نکالتا اور ان سے مستفید ہوتا ہے، غافل اور بے ہنر رہ کر کفران نعمت نہیں کرتا۔ وہ تو زمین کے ذروں کا جگر چیر کر ان سے جوہری توانائی حاصل کرتا ہے۔ وہ پانی سے بجلی پیدا کرلیتا ہے۔ وہ فضاؤں کو مسخر کرکے زمان و مکان کے فاصلوں کو کم کرتا اور انسانیت کے لیے رحمت بنتا ہے۔

الغرض رحمۃ للعالمین اور حامل خلق عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا پیروکار مخلوقات کے لیے رحمت بننے کی خاطر علم کی قوت یا اصطلاح قرآنی میں "سلطان" کے ذریعے سے کائنات کی نعمتوں سے تمتع و استفادہ کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ اصل میں مفہوم ہے یہی رحمۃ للعالمینی، خلق عظیم اور اسوۂ حسنہ کا، اور یہی مقصود ہے اسلام کی تحریک کا اور یہی مشیت ہے ربِّ ذوالجلال والاکرام کی۔

اسلامی نظامِ عدل کا نفاذ

مشکلات اور ان کا حل

جناب محترم مولانا سید محمد متین ہاشمی

الحمد للّٰہ وکفی وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ امابعد

مغرب کا نظام عدل کوئی سو ڈیڑھ سو برس سے ہمارے ہاں نافذ ہے اور اس سے مانوسیت اتنی بڑھ چکی ہے کہ اسلامی نظام عدل کا ذکر آتے ہی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تبدیلی کی ضرورت کیا ہے ؟ مغرب کے نظام عدل میں جو خرابیاں دکھائی دے رہی ہیں کیوں نہ بعض عملی اقدامات کے ذریعہ انھیں دُور کر دیا جائے ؟ لوگ یہ بات واضح طور پر کہیں یا نہ کہیں لیکن اسلامی نظامِ عدل کا معاملہ عام طور پر کسی سنجیدہ اور دُوررس اقدام کے بجائے ایک جذباتی خواہش بن چکا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیچھے ایک پیچیدہ نفسیات کارفرما ہے اور اسے سمجھے بغیر مسئلے کے حل کی طرف کوئی قدم اٹھانا تو درکنار ہم اس مسئلے کی نوعیت تک کو نہیں سمجھ سکتے۔

دنیا بھر میں انقلاب اور تبدیلی کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ لوگ کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کریں اور ظاہر ہے کہ تبدیلی کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب موجودہ صورتِ حال میں کسی کمی یا کسی بنیادی خامی کا احساس ہو۔ مغرب کے نظام میں ہمیں سب سے پہلے موجود صورت حال سے مطمئن رہنا سکھایا ہے۔ انسانی نفسیات میں "قدرِ اعلیٰ" کی طرف جو فطری میلان ہوتا ہے یہ نظام اسے تدریجاً اور منظم طور پر مٹاتا ہے اور اس کی سمت کو بدل کر اسے معاشی مسابقت کا رنگ دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم میں سے کچھ لوگ اس کا احساس بھی رکھتے ہوں کہ اسلام کا نظامِ عدل ایک بہتر اور ارفع نظام ہے جب بھی یہ خیال ان کے کسی عملی اقدام کی بنیاد نہیں بن سکتا اس لیے کہ عام طور پر ان کا یہ خیال ہے کہ موجودہ نظام اوّل تو اسلام کے نظام عدل سے متصادم نہیں ہے، اگر کہیں جزوی طور پر تصادم موجود بھی ہے تو اسے ترامیم کے ذریعہ سے دُور کیا جاسکتا ہے۔ اس فکر کے پیچھے دو مغالطے کام کر رہے ہیں جن میں سے ایک منطقی اور دوسرا علمی ہے۔

منطقی مغالطہ یہ ہے کہ اگر کوئی شے کسی دوسری شے سے متصادم نہیں ہے تو وہ اس شے

کا بدل بن سکتی ہے۔ حالانکہ کسی شئے کا کسی دوسری شے سے متصادم نہ ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ شئے ثانی شئے اوّل کا بدل بھی بن سکتی ہے۔ کیونکہ ایک شے متصادم نہ ہونے کے باوصف ناکافی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں پر غیر ضروری زور ہو سکتا ہے۔ اہم پہلو نظر انداز ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کا نظام عدل ان معنوں میں اسلام کے نظام عدل کا بدل نہیں بن سکتا۔

لیکن ہم اس امر کو اس کے پورے سیاق و سباق میں اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم اُس علمی مغالطے کو نہ سمجھ لیں جو درحقیقت اس پورے فساد کی جڑ ہے۔

مغرب اور اسلام کے نظام ہائے عدل میں فرق جزوی اور ثانوی حیثیت کا نہیں ہے، یہ فرق حتمی، اساسی اور فیصلہ کن ہے۔ وہ اس طرح کہ دنیا کے ہر نظام اور ادارے کی بنیاد اس چیز پر ہوتی ہے کہ کسی خاص نظام کے پیچھے کونسا تصورِ انسان کارفرما ہے۔ اسلام کا تصورِ انسان تو واضح ہے کہ انسان خلیفۃ اللّٰہ فی الارض ہے، چنانچہ جو چیز بھی انسان میں خلافت الٰہیہ کے عنصر کو مٹاتی ہے وہ اسے انسان کی تعریف سے بھی خارج کر دیتی ہے، چاہے اس کی شکل و صورت اور ہاتھ پاؤں وہی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نظام عدل میں شہادت کے سلسلے میں خصوصاً بعض ایسی بنیادی شرائط رکھی گئی ہیں جن کے بغیر انسانی حیثیت قائم ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس مغرب کے پورے نظام کے پیچھے جو تصورِ انسان کام کر رہا ہے وہ یونان سے آیا ہے اور جسے ارسطو نے سماجی حیوان (SOCIAL ANIMAL) کہہ کر بیان کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو نظام سماجی حیوان اور اس کی ضرورتوں کے مطابق وضع کیا گیا ہے وہ اپنے اس دائرۂ کار میں تو شاید کسی حد تک کفایت کرے جو اس تصور سے مطابقت رکھتا ہے لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں انسان کا بنیادی تصور ہی خلیفۃ اللّٰہ فی الارض ہے یہ تصور اور کچھ نہ سہی تو ناکافی ضرور ہے۔

مغرب میں نظامِ عدل کے پیچھے انسان کی بنیادی تعریف حیاتیاتی ہے یعنی جس مخلوق کو سائنسی زبان میں انسان قرار دیا جا سکے وہ قانون کے لیے کافی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا تصور انسان قدری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس میں انسانیت کا قدری پہلو پایا جاتا ہے تو پھر اسے انسان گنا جائے گا ورنہ قرآن کی اصطلاح میں اولٰئک کالانعام بل ھم اضل کا مصداق ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی فرق جو اس سارے مسئلے کی جڑ ہے۔

ایک اور بات ایسی ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مسلم معاشرے میں جب تک اسلامی قوانین نافذ رہے قانون کی خلاف ورزی کم سے کم ہوتی تھی اور جب

اسی معاشرے میں مغربی قوانین نافذ کیے گئے تو قانون کی خلاف ورزی بہت بڑھ گئی۔ اس کا اندازہ چودہ سو برس کی شرح جرائم اور ڈیڑھ سو برس کی شرح جرائم سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قانون کے پس پردہ تصورِ انسانی کے علاوہ اس قانون کے تحت زندگی گزارنے والوں کا مذہبی شعور کارفرما ہوتا ہے، کیونکہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کے فیصلے کی بابت اگر کسی کم سے کم درجے کا تصورِ عصمت اور تصورِ طہارت نہ ہو تو قانون موثر ثابت نہیں ہو سکتا، اور ظاہر ہے کہ یہ تصورِ عصمت و طہارت مذہب ہی سے میسر آسکتا ہے۔ لہٰذا جب مغربی نظامِ عدل مسلم معاشرے میں نافذ ہوا تو چونکہ وہ نظام معاشرے کے مذہبی شعور اور مذہبی رجحانات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اس لیے معاشرے کے باطن نے اسے قبول کرنے سے ابا کیا، جس کے نتیجے میں ذہنی بغاوت پیدا ہوئی اور جرائم کا ارتکاب بڑھ گیا۔

مغربی اور اسلامی نظامِ عدل کے بارے میں گفتگو کرتے وقت یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عدلیہ ہی اصل میں وہ چیز ہے جو معاشرے کے اعمال و افعال کو مخصوص خطوط پر استوار کرتی ہے۔ اسی لیے ہر ملک کا نظامِ عدل اس ملک کے اساسی نظریات و معتقدات کا عکاس ہوتا ہے اور اس حوالے سے صرف اسی ملک کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ اگر اس اصول کو مدِ نظر رکھا جائے تو ملک کے باشندے اس نظامِ عدل سے نہ صرف بے کرنا واقف رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کی زندگی اس نظامِ عدل سے متصادم ہو جاتی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بنیاد اسلام ہے اور ملک میں کم و بیش برطانوی قوانین نافذ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ برطانوی نظامِ حیات کی اساس دوسری ہے اور اسلامی نظامِ حیات کی دوسری، جس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے جرائم جو برطانوی قانون کی رو سے جرم ہی نہیں شمار کیے جاتے بلکہ بعض اوقات انہیں قانونی تحفظ بھی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً عمل ہم جنسی، یا کلب میں جوا کھیلنا، یا شراب نوشی، یا زنا بالرضا جبکہ اسلامی نظامِ عدل میں ان میں سے بعض جرائم کی سزا موت اور بعض کی کوڑے ہیں۔

مغربی اور اسلامی نظامِ عدل پر غور کرتے وقت یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ مغربی قانون کا ارتقاء استقرائی منطق پر ہوتا ہے جسے اگر شماریاتی کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، یعنی وہاں قوانین ہزار دو ہزار، لاکھ دو لاکھ انسانوں کے طرزِ عمل BEHAVIOUR کو دیکھ کر وضع کر دیے جاتے ہیں لیکن استقراء یا شماریات میں غلطی کا امکان ہے۔ جب کہ اسلامی نظامِ عدل کی اساس انسانی فطرت پر ہے۔ اسی وجہ سے مغربی قوانین میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے کیونکہ انسانی طرزِ عمل متبدل و متغیر ہے جب کہ اسلامی نظامِ عدل میں تبدیلی نہیں ہوتی اس لیے کہ

انسانی فطرت میں تبدیلی ممکن نہیں۔

دوسری بات یہ کہ وہ نظامِ عدل جو کسی خاص طرزِ عمل (BEHAVIOUR) کے انسانوں کے لیے وضع کیا گیا ہو عالمگیر نہیں ہو سکتا جب کہ وہ نظامِ عدل جو فطرتِ انسانی پہ مبنی ہو عالمگیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلامی نظامِ عدل کو اگر مغرب میں نافذ کیا جائے تو وہاں یہ کامیاب ہو سکتا ہے کیونکہ بہرحال وہاں انسان ہی بستے ہیں لیکن مغرب کا نظامِ عدل پاکستان میں کامیاب نہیں ہو سکتا اس لیے کہ مغربی باشندوں کے طرزِ عمل اور پاکستانیوں کے طرزِ عمل میں اختلاف ہے۔

مختصر یہ کہ ہمیں آخر کار پاکستان میں مکمل اسلامی نظامِ عدل نافذ کرنا ہو گا ورنہ ہمارا معاشرتی ارتقاء ہرگز اسلامی نہ ہو گا۔

اسلامی نظامِ عدل کی چند امتیازی خصوصیات

اسلامی نظامِ عدل کو جو چیز دیگر نظام ہائے عدل سے ممتاز کرنے والی ہے یہ ہے کہ:

۱۔ دیگر نظام ہائے عدل (وضعی قوانین) کو سوسائٹی کے افراد اپنے احوال و ظروف اور اپنی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر تیار کرتے ہیں جبکہ اسلام کا نظامِ عدل خود معاشرے کو اپنے خطوط اور اپنی اساس کے مطابق ڈھالتا ہے۔ بصورتِ اول سوسائٹی آگے آگے ہوتی ہے اور قانون اس کے پیچھے جب کہ اسلامی نظامِ عدل آگے ہوتا ہے اور معاشرے کو اس کے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔

۲۔ صفتِ دوام۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی نظامِ عدل وحی الٰہی پہ مبنی ہوتا ہے، یعنی اس کا صانع اور منزل اللہ تبارک وتعالیٰ ہے جب کہ وضعی قوانین انسانی ذہن کے نائیدہ ہیں اور چونکہ "الانسان مرکب من الخطاء والنسیان" اس لیے انسان کے وضع کردہ قوانین میں فطری طور پہ وہ ضعف، عجز، کم فہمی، نتائج سے عدم واقفیت، مستقبل سے بے خبری پائی جاتی ہے جو اس کی سرشت میں داخل ہے یہی وجہ ہے کہ قانون بنتے ہی اس میں ترامیم شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر اس اعتبار سے دیکھیں تو وضعی قوانین ہمیشہ ناقص اور ناقابلِ اصلاح رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی قوانین چونکہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں، ایک ایسے رب کے جو علیم وخبیر ہے، جس کے سامنے ازل اور ابد سب کھلے ہوئے، جو مستقبل کے تمام انقلابات سے آگاہ ہے اور جس کا علم ہر شے کو محیط ہے، اس لیے اس میں نقص کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور وہ اساسی طور پہ ہر تغیر اور تبدیلی سے بے نیاز ہے۔ لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ اسلامی نظامِ عدل اپنے اندر صفتِ دوام رکھتا ہے۔

مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں :

(الف) قرآن کریم میں ارشاد ہے :

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر ۱۸)

ترجمہ : کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا ۔

یعنی جو شخص کسی جرم کا ارتکاب کرے سزا اسی کو ملے گی یہ نہیں ہو سکتا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی ۔

(ب) یا ارشادِ باری ہے :

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ ۲۸۶)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ کسی بھی نفس پر اتنی ہی کلفت ڈالتا ہے جتنی کہ وہ برداشت کر سکے ۔

اس آیت سے یہ اصول متفرع ہوا کہ شرعی احکام میں تکلیف مالا یطاق کی گنجائش نہیں ۔

(ج) یا ارشاد ہوا :

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَ
یَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ (النحل ۹)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ تمہیں انصاف اور احسان اور رشتہ داروں کی مدد کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش باتوں ، ناجائز کاموں اور سرکشی اختیار کرنے سے منع کرتا ہے ۔

(د) یا فرمایا :

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَهْلِهَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ
بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء ۵۸)

ترجمہ : اے مسلمانو ! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرنا اور جب تمہیں لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا پڑے تو انصاف سے فیصلہ کرنا ۔

(ہ) ایک مقام پر حکم فرمایا :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ
لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (النساء ۱۳۵)

ترجمہ : اے ایماندار بندو ! انصاف پر قائم رہو اور اللہ سے ڈرتے ہوئے گواہی دو اگر وہ گواہی خود تمہارے خلاف ہی کیوں نہ ہو یا تمہارے والدین یا عزیز و اقارب کے خلاف ہو ۔

(و) سورہ مائدہ میں ارشاد ہوا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ

(المائدہ ۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے میں مستعد ہو اور ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی عداوت تم سے گواہی دینے میں بے انصافی کرائے۔ انصاف کرو کہ انصاف ہی پرہیزگاری تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ ہے اور اللہ سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے اعمال کی خبر رکھتا ہے۔

ان آیات کو نازل ہوئے آج چودہ سو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم مفکرین و مقننین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ثابت کر دیں کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود قانون سازی کی ان اساسیات میں معمولی سا نقص، معمولی سی کمی اور خفیف سی کجی پیدا ہوئی ہے؟ ہرگز نہیں۔ قانون سازی کی یہ بنیادیں انقلاب دہور و ایام سے قطعاً بے نیاز ہیں۔

۱۱۱ مساوات

اسلامی نظام عدل کی اہم ترین امتیازی خصوصیت اس کا عطا کردہ تصورِ مساوات ہے۔ یعنی قانونِ اسلامی کے آگے امیر، غریب، بادشاہ، فقیر، محکوم، حکمران برابر ہیں حتیٰ کہ نبی اکرمؐ نے اپنے یا اپنے اہل خاندان کے لیے بھی کسی قسم کا استثنا گوارا نہ فرمایا اور غزوۂ بدر میں جب آپؐ کی چھڑی حضرت سواد کے پیٹ میں لگ گئی اور انھوں نے قصاص کا مطالبہ کیا تو سید الکونین امام المرسلینؐ بدر کے سپہ سالار صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بطنِ مبارک سے کپڑا ہٹا کر کھڑے ہو گئے۔ چھڑی سواد کے ہاتھ میں تھما دی اور انھیں بطیب خاطر اجازت دی کہ وہ بدلہ لے لیں۔ اسلام کے نظامِ عدل میں جب شارعِ اسلامؐ اپنی ذاتِ گرامی کو انتقام کے لیے پیش کر سکتے ہیں تو پھر کون ایسا ہے جو خود کو قانون سے بالاتر سمجھے۔

آج تو دنیا بہت ترقی کر چکی ہے، قانون در قانون کی لاکھوں کروڑوں کتابیں تیار ہو چکی ہیں لیکن مغربی نظام عدل کی رو سے ایک عام شہری بادشاہ کو عدالت میں طلب نہیں کر سکتا اور عام عدالتیں وزیرِاعظم پر مقدمہ نہیں چلا سکتیں، اس لیے کہ "بادشاہ سے تو غلطی کا صدور ہی ممکن نہیں"۔ مگر قرآن کریم چودہ سو برس سے اعلان کر رہا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات ۱۳)

ترجمہ: اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے درمیان شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک اللہ کے نزدیک تو وہی عزت والا ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ جب مخزومیہ عورت نے چوری کی اور قریش نے محسوس کیا کہ اگر اس کا ہاتھ چوری کے مقدمے میں کاٹ دیا جائے گا تو قبیلے قریش کی بے عزتی ہوگی اور انھوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کرنے کے لیے بھیجا تو جواب ملا:

اتشفع فی حد من حدود اللہ ثم قام فخطب فقال یا ایھا الناس انما ضل من قبلکم انھم کانوا اذا سرق الشریف ترکوہ واذا سرق الضعیف فیھم اقاموا علیھم الحد وایم اللہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطع محمد یدھا[1]

ترجمہ: کیا تم اللہ کی حدود کے بارے میں مجھ سے سفارش کر رہے ہو پھر آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "لوگو! تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے گمراہ ہوگئیں کہ ان کا کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور شخص اس جرم کا ارتکاب کرتا تو اس پر حدیں جاری کرتے۔ اور خدا کی قسم اگر محمد ﷺ کی بیٹی چوری کرتی تو محمد ضرور بالضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتے۔

کیا اس مساوات کی نظیر تاریخ عالم میں مل سکتی ہے؟

خوفِ خدا اور تصورِ آخرت

اسلامی نظامِ عدل کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ معاشرے کی تربیت خوفِ خدا اور تصورِ آخرت کی بنیاد پر کرتا ہے۔ کیونکہ اگر انسان پر بظاہر بہت سی پابندیاں عاید کردی جائیں اور اس کے باطن کو نہ بدلا جائے تو عقل حیلہ ساز بے شمار راستے نکال لیتی ہے۔ اسلام درحقیقت

---

[1] بخاری: ۲: ۱۰۰۳ طبع دہلی

اپنے معاشرے کو اندر سے بدلتا ہے تاکہ قانون شکنی اور سرکشی کا موقع ہی نہ آئے۔ اس اندرونی تبدیلی کے لیے اسلام سب سے زیادہ خوفِ خدا اور تصورِ آخرت پہ زور دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی ابتدا کرتے ہی اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ

اس کتاب میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کتاب ہدایت ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔

پھر کہا گیا:

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ

کہ جس نے بھی ایک ذرے برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کے ثمرات قیامت کے دن دیکھ لے گا اور جس نے بھی ایک ذرے برابر برائی کی ہوگی وہ اس کے نتائج قیامت کے دن بھگت لے گا۔

قیامت کا دن کیسا ہوگا کہ:

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ لِکُلِّ امْرِیءٍ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ (عبس ۳۷)

جس روز انسان بھاگنے لگیں گے اپنے بھائی سے اور اپنے ماں باپ، بیوی اور بیٹے سے اس وقت ان میں سے ہر شخص کو اپنی ہی پڑی رہے گی اور وہ دوسرے سے بے توجہ ہوں گے۔

پھر ارشاد ہوا:

یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ فَمَا لَہٗ مِنْ قُوَّۃٍ وَّلَا نَاصِرٍ (الطارق ۹)

جس روز سب راز فاش ہو جائیں گے تو اس وقت انسان کو نہ خود قوت ہوگی نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا۔

قرآن کریم میں یہ اور اس طرح کی سینکڑوں آیات اور ان کے علاوہ احادیث انسان کے باطن کو بدلنے والی اور اسے خوف خدا اور تصور آخرت سے وابستہ رکھنے والی ہیں۔ اسی تربیت اور تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب ایک ماں اپنی بچی سے دودھ میں پانی ملانے کو کہہ رہی تھی تو بچی نے جواب دیا کہ حضرت عمرؓ نے منع فرمایا ہے اور جب ماں نے یہ کہا کہ کیا عمرؓ دودھ میں پانی ملاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں؟

تو معصوم بچی بول اٹھی : ماں ! عمرؓ تو نہیں لیکن عمرؓ کا خدا دیکھ رہا ہے۔" اسی طرح کے واقعات حضرت ماعزؓ اسلمی اور غامدیہؓ کے ہیں ۔ اگر ماعزؓ اسلمی اور غامدیہؓ دربارِ نبوت میں حاضر ہو کر بار بار اعتراف زنا نہ کرتے تو کون انہیں سزا دیتا ۔ واقعاتِ زنا کا کوئی گواہ بھی نہیں تھا ۔ مگر چونکہ باطن بدل چکا تھا اور ان حضرات نے یہ محسوس کیا کہ ہم سے گناہ سرزد ہو گیا ہے جسے اگرچہ ہم مخلوق کی نگاہوں سے چھپا سکتے ہیں تاہم خالق کی نگاہوں سے نہیں چھپا سکتے اس لیے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر پکار اٹھے "طهرني يا رسول الله" اے خدا کے رسولؐ ہمیں پاک کر دیجئے ۔ ماعزؓ اور غامدیہؓ یہ جانتے تھے کہ ہمیں سنگسار کر کے ہلاک کر دیا جائے گا ۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی لیکن آخرت کا تصور اور رب کا خوف تھا جو کشاں کشاں انہیں مقتل میں لے آیا ۔

یہی ہے وہ بنیاد جس پر اسلام کا نظام عدل معاشرے کی تشکیل کرتا ہے ۔ کیا دنیا کا ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ نظام عدل اس طرح کی ایک مثال بھی پیش کر سکتا ہے ؟ اس مقام پر اگر آپ مجھے طبی اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دیں تو میں عرض کروں گا کہ اسلامی نظام عدل کی دیگر بنیادوں میں سے ایک بنیاد PREVENTION IS BETTER THAN CURE ہے ۔ کہ ماحول ایسا بنا دیا جائے ، احوال اس طرح تبدیل کر دیے جائیں ، طبائع میں اس نوع کا انقلاب برپا کر دیا جائے کہ انسان خود بخود جرائم کے ارتکاب سے محترز رہے ۔

سخت ترین عقوبات

اسلامی نظامِ عادل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جرائم ثابت ہونے پر وہ مجرم کے ساتھ کسی رو رعایت کی گنجائش نہیں چھوڑتا کیونکہ موجودہ دور کی طرح اگر مجرم کے ساتھ رو رعایت کی جائے تو نظام تمدن میں خلل پڑے گا اور کسی شریف آدمی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں رہے گی ۔ لہٰذا اسلام کے نظام عقوبات میں سزائیں عبرتناک رکھی گئی ہیں ۔ نظام عقوبات کے فلسفے پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہورِ عالم تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں :

> بعض معاصی کے ارتکاب پر شریعت نے حد مقرر کی ہے ۔ یہ وہی معاصی ہیں جن کے ارتکاب سے زمین پر فساد پھیلتا ، نظام تمدن میں خلل پیدا ہوتا اور مسلمان معاشرے کی طمانیت و سکونِ قلب رخصت ہو جاتا ہے ۔ دوسری بات یہ کہ وہ معاصی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ دو چار بار ان کا ارتکاب کرنے سے ان کی لت پڑ جاتی ہے اور

اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے معاصی میں محض آخرت کا خوف دلانا اور نصیحت کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ ایسی عبرت ناک سزا مقرر کی جائے کہ اس کا مرتکب معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ساری زندگی سوسائٹی کے دیگر افراد کے لیے سامانِ عبرت بنا رہے اور اس کے انجام کو دیکھ کر بہت کم لوگ اس قسم کے جرائم کے ارتکاب کی جرأت کریں [1]

اصل میں اسلام نے جو نظامِ اصلاح قائم کیا ہے اس کی ابتدا ہی فرد کی اصلاح سے ہوتی ہے۔ کیونکہ جب تک کسی معاشرے کے افراد صالح نہ ہوں ان کا مجموعہ یعنی معاشرہ صالح نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا از روئے اسلام جو فرد اس قدر فاسد ہو چکا ہے کہ آزادانہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو توڑتا ہے وہ ایک فرد سارے معاشرے کو تباہ کر سکتا ہے۔ اور اس کی مثال اس دانت کی سی ہے جس میں پائیوریا کے جراثیم داخل ہو چکے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بھی دانتوں کے امراض کا ماہر ہوگا وہ فوراً اس جراثیم زدہ دانت کو دانتوں کے اجتماع سے الگ کر دینے کا حکم دے گا۔

حدود کے نفاذ میں شریعت نے جو دوسری مصلحت مدنظر رکھی ہے وہ ہے اس کا عبرت ناک ہونا۔ اسی لیے قرآن کریم میں جس مقام پہ حدِ زنا کا ذکر ہے وہاں یہ بھی حکم ہے کہ:

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (النور ۲)

ترجمہ: اور چاہیے کہ ان کی سزا کا مسلمانوں کی جماعت مشاہدہ بھی کرے۔ یہی مصلحت، معلوم ہوتا ہے سرقہ کی حد میں "قطع ید" کی بھی ہے۔ کیونکہ ایک دست بریدہ شخص جب ہر وقت مسلم معاشرے میں پھرتا ہے تو اس کے حشر کو دیکھ کر لاکھوں انسان ارتکابِ سرقہ کے خیال سے باز رہیں گے۔

اسلام میں قضا کا تصور

دیگر نظام ہائے عدل کی طرح اسلامی نظامِ عدل میں عہدۂ قضا، پھولوں کا ہار نہیں بلکہ کانٹوں کا ایسا تاج ہے جسے طلب کرنا بھی جائز نہیں۔

---

[1] شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ: ۲ : ۱۵۸ طبع سلفیہ لاہور ۱۹۷۵ء

صحیح بخاری شریف میں ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا نولّی ھذا من سالہٗ ولا من حرص علیہ [1]

ہم اس شخص کو حاکم نہیں بناتے جو اس عہدے کو طلب کرے یا اس کا لالچ کرے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من ولی القضاء او جُعل قاضیا بین الناس فقد ذُبح بغیر سکین۔ [2]

جو قاضی بنایا بنایا گیا کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔

اسی لیے اسلامی نظام عدل میں ہر کس وناکس کو قاضی نہیں بنایا جا سکتا کہ وہ کوئی امتحان پاس کرے اور اس کا تقرر عمل میں آجائے، بلکہ ضروری ہے کہ جسے عہدۂ قضا سپرد کیا جائے وہ متقی اور بے نفس ہو، اُسے ہر قسم کے خارجی اثرات سے بے پرواہ ہو کر صحیح فیصلے پہ پہنچنے کی خواہش ہو۔ ایسے قاضی کے بارے میں صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا حکم الحاکم فاجتھد فاصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتھد فاخطاء فلہٗ اجر واحدٌ [3]

ترجمہ: حاکم جب فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کرے اور اپنے اجتہاد میں صحیح ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر اس نے اجتہاد کیا اور اس سے خطا ہو گئی جب بھی ایک اجر ملے گا۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظام عدل میں قضا ایک عبادت ہے بشرطیکہ تمام مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت قاضی کی نیت درست ہو اور وہ حق والصاف کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

شہادت کا معیار

دیگر نظام ہائے عدل میں ہر للّو پنجو شہادت دینے کا مجاز ہے خواہ اس کا ذاتی کردار کتنا ہی

---

[1] البخاری: ۲ : ۱۰۵۸ طبع دہلی۔ [2] الترمذی : ۲۱۰ طبع نور محمد کراچی [3]

گھناؤنا کیوں نہ ہو۔ صرف ضروری یہ ہے کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں ہو اور خود اپنی بات کو جو وہ ادائے شہادت کے وقت منہ سے نکال رہا ہے سمجھتا ہو۔ لیکن اسلامی نظام عدل میں شہادت کا کڑا معیار مقرر کیا گیا ہے۔ اور اولین شرط یہ ہے کہ:

وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ

(الطلاق: ۲)

ترجمہ: اور اپنے میں سے دو عادل اشخاص کو گواہ ٹھہرالو اور گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے دو۔

قرآنِ کریم کا یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اسلامی نظام عدل میں ادائے شہادت درحقیقت ادائے امانت ہے، اسی لیے عادل کی شرط عائد کی گئی ہے جس کی فقہائے اسلام نے یہ تعریف کی ہے کہ:

"وہ کبائر سے مجتنب ہو، صغائر پہ اصرار نہ کرے اور اس کی نیکیاں اس کی برائیوں پہ غالب ہوں۔"

اس کے علاوہ اسلامی نظام عدل میں "تزکیۃ الشہود" کا نظام رکھا گیا ہے جو شاید دنیا کے کسی نظام میں نہیں ہے، اور ان سب پہ مستزاد یہ کہ شریعت میں جھوٹی شہادت پر سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اکبر الکبائر کہا ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ہے:

الا انبئکم باکبر الکبائر قال قول الزور او قال شهادة الزور[1]

ترجمہ: آپ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں سب سے بڑے کبیرہ گناہ کے بارے میں بتاؤں؟ وہ ہے جھوٹ بولنا یا جھوٹی شہادت دینا۔

مفت اور فوری حصولِ انصاف

ایک اسلامی حکومت کی دیگر ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذمے داری ہے کہ رعایا کو مفت اور فوراً انصاف مہیا کیا جائے تاکہ غریب سے غریب آدمی اپنا حق وصول کر سکے اور کسی شخص کی غربت حصول انصاف میں مزاحم نہ ہو، اور چونکہ اسلامی نظام عدل سیدھا

---

[1] صحیح مسلم: ۱: ۶۴ : طبع مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۹ھ

سادہ ہے اس لیے مقدمات کے فیصلے بھی جلد از جلد ہو جاتے ہیں اور اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ مغربی نظام عدل کی طرح انصاف میں اتنی تاخیر نہ ہو جائے کہ ظلم بن جائے۔ آج ہمارے ملک میں جو نظام عدل رائج ہے اس نے ہمارے غریب عوام کو جن مشکلات سے دوچار کر رکھا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وکلاء کی بھاری فیسیں، اسٹامپ کے اخراجات، ایک معمولی سے مقدمے میں بے ضرورت پچاس تاریخیں، آمدورفت کے اخراجات، عدالتوں کے لایعنی چکر۔ ان چیزوں کی وجہ سے اس وقت غریبوں کو انصاف میسر آنا اگر محال نہیں تو دشوار تر ضرور ہے۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے باعث اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اسلام کا عطا کردہ نظامِ عدل اس وقت بھی دنیا کے تمام نظام ہائے عدل سے فائق، آسان تر، مہذب، حیاتِ اجتماعی کے لیے انفع اور قابل عمل ہے۔ ضرورت اللہ پر بھروسا کر کے قدم بڑھا دینے کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راہ میں مشکلات بھی ہیں اور موانع بھی۔ سو سالہ دورِ غلامی نے ہم سے احساس زیاں تک چھین لیا ہے۔ ہم اپنے گریبانوں میں چھپے ہوئے آفتاب کو چھوڑ کر دوسروں کے چراغوں کی طرف دوڑنے میں مصروف ہیں، اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ کسی حد تک ہم احساس کمتری کے شکار ہیں۔ یہ سب کچھ تسلیم۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے ہم ضرور بالضرور انھیں اپنی راہیں دکھلائیں گے۔ مگر اس کے لیے شرط یہی ہے کہ

دررہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

ہمیں اللہ کے وعدے پر بھروسا کر کے اسلام کو من کل الوجوہ اس ملک میں نافذ کر دینا چاہیے۔ جب ریلوے کا محکمہ ہم سے ٹکٹ دیتے وقت عملاً یہ وعدہ کرتا ہے کہ ہم تمہیں کراچی بذریعہ ریل پہنچا دیں گے تو ہم اس کے وعدے پر اعتماد کر کے اسے ٹکٹ کی قیمت بھی ادا کر دیتے ہیں اور اس کی تیار کی ہوئی ٹرین میں بیٹھ بھی جاتے ہیں اور ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ شبہ نہیں ہوتا کہ پتہ نہیں یہ ٹرین ہمیں کراچی پہنچائے گی کہ نہیں؟ تو کیا اللہ کا وعدہ (العیاذ باللہ) پاکستان کے محکمۂ ریلوے کے وعدے سے بھی زیادہ مشتبہ ہے کہ ہم حیص بیص میں پڑے ہوئے ہیں اور تذبذب کے شکار ہیں اور کبھی کہنے لگتے ہیں کہ اسلام کا نظام عدل فرسودہ ہے، آج کے ماڈرن دور میں نہیں چل سکتا۔ کبھی

مغربی نظام عدل میں ان پہلوؤں کو تلاش کرنے لگتے ہیں جو اسلام سے متصادم نہیں تاکہ جیسے بھی ہو انگریز بہادر کا نظام ہمارے ملک کے غریب عوام پر مسلط رہ کر ان کا خون چوستا رہے۔ ان کے اسلاف کی بخشی ہوئی اقدارِ حیات کو مسخ کرتا رہے اور ان سے کولھو کے بیل کی طرح عدالتوں کے چکر پہ چکر لگواتا رہے۔ ہماری مثال اس بندریا کی سی ہے جس کا بچہ چونتیس سال ہوئے مر چکا ہے لیکن وہ اس کے سڑے ہوئے ڈھانچے کو سینے سے لگائے پھرتی رہنا چاہتی ہے۔

اللہ کے فضل و کرم سے ۳۴ سال کے بعد اب ملک میں اسلام کا بول بالا ہو رہا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پاکستانی عوام کو منزل مل گئی لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ملت پاکستانیہ جو طویل اور صبر آزما ۳۴ سالوں سے بھٹک رہی تھی اور اس کے سفر کی سمت متعین نہ تھی، اب اس کی سمت سفر متعین ہو چکی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا قیام، نظام زکوٰۃ کا نفاذ، بلاسود بنکاری کا آغاز، قومی زبان پر زور، نظریۂ پاکستان کی ترویج و اشاعت، حدود اسلامی کا نفاذ، یہ چیزیں ایک صبح نو کی خبر دیتی ہیں۔ لیکن کسی ملک میں کسی نظام کا نفاذ محض کسی حکومت کی ذمے داری نہیں ہوتی۔ یہ کام ہم سب کو مل کر کرنا ہے۔ علما، وکلا، جج حضرات، طلبا، اساتذہ تجار، صنعت کار، سرمایہ دار، مزدور، زمیندار، اطباء، پولیس، فوج، عمال حکومت اور ملک کے سارے عوام کا یہ فرض ہے کہ اس ملک میں جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اسلام کا نظام اپنی پوری جامعیت و مانعیت کے ساتھ نافذ کریں۔ جب تک سارے عوام کا تعاون نہ ہو یہ مرحلہ سر نہ ہوگا۔

مشکلات اور ان کا حل

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اسلامی نظام عدل کے نفاذ میں سب سے بڑی دشواری یقین کی کمی اور احساس کمتری ہے، اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ جو قوم ڈیڑھ سو برس تک انگریزوں کی غلام رہ چکی ہو اس کی طبیعت میں اس قسم کے عناصر کا پیدا ہو جانا فطری ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ہم مغربی نظام عدل کو ملک میں باقی رکھنا چاہتے ہیں اور ہماری تمام تر کوششیں اس کے لیے کی جا رہی ہیں کہ رائج الوقت مغربی نظام عدل سے ان شقوں کو خارج کر دیا جائے جو شریعت سے متصادم ہیں یہ نظریہ سرے سے غلط ہے، کیونکہ اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہر صورت و بہر حال ہم مغربی نظام عدل کو باقی رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اسلامی نظام عدل کو ملک میں یکسر نافذ کرنے کے لیے اقدامات تجویز

کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی نظامِ عدل کی جو اچھی اور مفید چیزیں ہیں اور اپنی نہاد میں اسلامی شریعت سے متصادم نہیں ہیں انہیں داخل کر لیتے۔ اس کی ہزاروں مثالیں اسلامی تاریخ میں موجود ہیں۔ مثلاً خندق کھود کر دشمن سے مقابلہ کرنا، مجوسیوں کے طرزِ حساب کو اپنانا، فلسفۂ یونان کو اسلامی عقائد کے اثبات کے لیے استعمال کرنا وغیرہ وغیرہ

لہٰذا اولین ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد کی حقانیت پر پختہ یقین قائم کریں اور پھر: اذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ کا طرزِ عمل اختیار کریں کیونکہ

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

معاشرے کو تیار کرنا

کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارا موجودہ معاشرہ اسلامی نظامِ عدل کو کما حقہٗ قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک اسلامی معاشرے کے لیے تقویٰ کا جو معیار ہونا چاہیئے وہ ہمارے معاشرے میں موجود نہیں۔

تبلیغ

ہمیں اس سوال پر دو زاویوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

(الف) ایک تو یہ کہ کیا نفاذ شریعت کو اس وقت تک معرض التوا میں رکھا جائے جب تک کہ معاشرہ اس کے لیے تیار نہ ہو جائے؟ یہ طرزِ فکر غلط اور منہاجِ نبوت کے خلاف ہے، اس لیے کہ اصلاحِ معاشرہ کے دیگر عوامل کے علاوہ قوی ترین عامل خود نفاذ شریعت ہے۔ آپ روشنی لائیے ظلمت خود بخود دُور ہو جائے گی۔ شریعت نور ہے اور معاشرے کے مفاسد ظلمت۔ نور کے آجانے کے بعد ان شاء اللہ العزیز ظلمت خود بخود کافور ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ یہ کہنا کہ پہلے معاشرہ صحت مند ہو جائے تب شریعت نافذ کی جائے گی بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کو کسی طبیب کے پاس لے جایا جائے اور طبیب کہے کہ اس وقت یہ بیمار ہے جب صحت مند ہو جائے تب میرے پاس لے کر آنا حالانکہ شریعت ایک بیمار معاشرے کی خود طبیب ہے۔ اسے اپنی تمام تر برکات کے ساتھ آنے دیجئے وہ خود اس معاشرے کو صحت بخش دے گی۔ اللہ کے فضل وکرم سے ہمارے پاس تو ہر مرض کے لیے سامانِ شفا بغیر کسی تخلف وتبدیل کے موجود ہے جو انسان کے ظاہری

وباطنی تمام امراض کے لیے دارُوئے شفا ہے۔ ارشاد باری ہے :

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَاءٌ (السجدہ ۴۴)

ترجمہ: آپ اے میرے نبی کہہ دیجیے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہوا :

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ إِلَّا خَسَارًا ۝ (بنی اسرائیل ۸۱)

ترجمہ: آپ کہہ دیجیے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا بیشک باطل تو مٹنے والا تھا۔ اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہیں۔ مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتے۔

(ب) دوسری بات یہ کہ اگر اسلامی نظامِ عدل کو نافذ کرنا ہو تو اس کی شکل کیا ہو گی؟ اور معاشرے کو کس طرح تیار کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظامِ عدل کو نافذ کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کو اسلامی نظامِ عدل کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔

اس کے طریق پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے حالات کا بالاختصار جائزہ لیں۔ چند سال پہلے ہمارے معاشرے کی حالت بالکل سعدی کی اس حکایت کی طرح تھی جس میں سعدی نے اس شاعر کا واقعہ بیان کیا ہے جو ایک سرد رات میں پوستین پہن کر ڈاکوؤں کے ایک قلعہ میں گیا تھا۔ اس نے حسب عادت ڈاکوؤں کے سردار کی شان میں قصیدہ مدحیہ پڑھا اور سردار نے انعام دینے کے بجائے شاعر کے کپڑے اتروا کر ننگ دھڑنگ قلعے سے باہر نکلوا دیا۔ رات کا وقت تھا۔ کتوں نے جب شاعر بے چارے کو اس حال میں دیکھا تو بھونکنے لگے اور کاٹنے دوڑے۔ شاعر جھکا کہ پتھر اٹھا کر کتوں کو مارے تو پتھر برف کے ساتھ جمے ہوئے تھے اس وقت شاعر نے کہا :

"ایں چہ ..... کہ سنگ را بستہ و سگ را کشادہ"

کہ یہ کیا کمینہ ہے کہ پتھر تو باندھ دیے ہیں اور کتوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔

اب سے چند سال پہلے ہمارے معاشرے کا یہی حال تھا کہ اکابر اصاغر اور اصاغر اکابر بن گئے تھے۔ لاکھوں کے مجمع میں فخریہ اپنی شراب نوشی کا تذکرہ ہوتا تھا اور مجمع اس پہ تالیوں کے ذریعہ داد دیتا۔ بالکل وہی صورت تھی جیسے بلقیس کی زبانی قرآن نے نقل کیا ہے کہ :

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۚ (النمل ۳۴)

ترجمہ: مطلق العنان ــــ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد پھیلاتے ہیں اور اس بستی کے شرفا کو ذلیل بنا دیتے ہیں۔

بحمداللہ موجودہ حکومت جب سے آئی ہے وہ صورت حال نہیں ہے، بایں ہمہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سنگ را بستہ وسگ را کشادہ والی شکل ضرور ہے یعنی بیک وقت ملک میں نیکی اور بدی کی قوتیں سرگرم عمل ہیں۔ ایں ہم غنیمت است۔ مگر فی الحال ہماری مثال اس شخص کی ہے جو اپنے سامنے ایک ایسی بالٹی دھرے بیٹھا ہے جس میں پانچ سو چھید ہیں۔ اس بالٹی میں وہ شخص آبِ خیر مسلسل ڈالے جا رہا ہے لیکن ان چھیدوں کی وجہ سے پانی بالٹی میں ٹھہرتا نہیں۔ لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ خیر کا پانی معاشرے کی بالٹی میں ٹھہرے تو ہمیں سب سے پہلے ان سوراخوں کو بند کرنا ہوگا جن کے راستے تمام اچھی تعلیمات باہر نکل جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے اس کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۞ (لقمان ۱۷)

ترجمہ: نیکی کا حکم دو برائی سے روکو اور اس راستے میں جو مصائب آئیں انہیں صبر سے برداشت کرو کیونکہ یہ بڑی باتوں میں سے ہے۔

ایک مقام پہ ارشاد ہے:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۞ (الحج ۴۱)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں با اختیار کر دیں تو یہ لوگ نماز قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں نیک کاموں کا حکم کریں برے کاموں سے روکیں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ۔ [1]

ترجمہ: تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے اسے چاہیئے کہ اپنی قوتِ بازو سے اُسے روکے۔ لیکن اگر اسے اس بات کی طاقت نہ ہو تو زبان سے اُسے روکے اور اگر اس کی بھی اس میں طاقت نہ ہو تو اپنے دل سے اس برائی کو بُرا جانے، لیکن یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

ان آیات و حدیث کی روشنی میں ضروری ہے کہ نفاذ عدل اسلامی کے ساتھ ساتھ اَمْر بِالْمعروف و نہی عن المنکر کا نظام باضابطہ طور پر قائم کیا جائے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ ایک طرف سے خیر کا حکم ہو رہا ہے لیکن عین اسی وقت فلمیں، فحش و منکرات کی تبلیغ کر رہی ہیں۔ ٹیلی وژن کے ذریعہ سے لوگوں کو مار دھاڑ کی تربیت دی جا رہی ہے، وی سی آر کے ذریعہ سے بے ہودہ اور گندی فلمیں دکھا کر عوام کا مذاق بگاڑا جا رہا ہے۔ اخبارات اور رسائل میں شہوت انگیز تصویریں شائع ہو رہی ہیں، جنسی ناول، جاسوسی ناول، بے ہودہ قسم کے ڈائجسٹ اور طرح طرح کے ناپاک رویوں کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں خیر کی آواز

"نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی ہے"۔

لہٰذا حکومت، دانشور طبقہ، ادبا، شعرا، صحافی، اساتذہ، علما، اور عوام سب مل کر معروف کی تبلیغ کریں اور منکرات کو اپنی استطاعت کے بموجب روکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرہ اصلاح پذیر نہ ہو جائے۔ اسلام میں اس طریق کو "طریقِ تبلیغ" کہتے ہیں۔

ترغیب

تبلیغ کے بعد جو چیز معاشرے کو بدلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے وہ ترغیب ہے۔ اسی بنا پر ابتدائے اسلام میں مستحقین زکوٰۃ کی فہرست میں مولفۃ القلوب کو رکھا گیا تھا تاکہ کفار اسلام قبول کرنے کے مادی فوائد بھی دیکھیں اور محسوس کریں۔ لہٰذا اگر کسی نظام

---

[1] - مسلم شریف: ۱: ۵۰ : طبع مصر

کو عوام میں مقبول بنانا مقصود ہو تو تبلیغ کے ساتھ ساتھ ترغیبات بھی رکھنی چاہییں۔ انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اپنی معاشرت، اپنے طرزِ فکر اور اپنے نظامِ تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے ترغیب ہی کا حربہ استعمال کیا تھا اور ان لوگوں کو بڑے بڑے مناصب سے نوازا تھا جنہوں نے ان کے نظریات و افکار کو اپنایا تھا۔ اب اگر کوئی چاہتا ہے کہ اسلامی نظام عوام میں مقبول ہو اور لوگ اسلامی نظامِ عدل کے مطابق زندگی گزاریں تو ضروری ہے کہ دینی علوم کے حاملین اور اہلِ اصلاح و تقویٰ کو معاشرے میں پُروقار حیثیت دی جائے۔ تاکہ لوگوں کو اس کی طرف رغبت ہو۔ سرکاری مناصب پر کسی کو مقرر کرتے وقت ضروری علمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ امیدوار دینی علوم سے حسبِ ضرورت واقفیت رکھتا ہے یا نہیں؟ نیز وہ اسلام کو موجودہ دور میں ایک مکتفی بالذات (مکمل) نظامِ حیات تصور کرتا ہے یا نہیں۔ اس رویہ سے انشاء اللہ العزیز خود بخود لوگوں کا رجحان دینی ماحول و معاشرت کی طرف ہو جائے گا۔

ترہیب

تبلیغ و ترغیب کے بعد تیسرا مرحلہ ترہیب کا آتا ہے یعنی اگر کوئی شخص ایسا دون فطرت اور کمینہ خصلت ہے کہ ابتدائی دونوں عوامل اس کی طبیعت کو بدلنے میں کامیاب نہ ہوں تو پھر اسلامی حدودِ عقوبات کو اس پر جاری کر دیا جائے اور از روئے قرآن:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النور - ۲)

ترجمہ: تم کو ان دونوں پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کسی قسم کا ترس اور رحم نہ آئے اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

حدود کے نفاذ کو دو سال ہونے کو آئے۔ خیال تھا کہ معاشرہ صالح ہو جائے گا اور جرائم کا انسداد ہو جائے گا۔ لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ جرائم کی شرح میں قابلِ ذکر کمی نہیں آئی۔ اس کی یوں تو اور بہت ساری وجوہات ہیں لیکن ان میں یہ وجہ بھی اہم ہے کہ آج تک ملک میں ایک شخص پر بھی شرعی حد پورے طور پر نافذ نہیں ہوئی۔ ان حالات کو دیکھ کر جرائم پیشہ طبقہ حدود کو مذاق سمجھنے لگا ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ ابتدائی دور میں غیر ضروری موشگافیوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ حد کا جرم ثابت ہوتے ہی حد نافذ کرنے کا حکم دے دینا چاہیئے۔

تفتیش

ہمارے ملک کے محکمہ پولیس کا جو حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، عاقلاں را اشارہ کافی است۔ اب صورت حال یہ ہے کہ حدود کے مقدمات تفتیش کے ابتدائی مراحل ہی میں اس قدر خراب کر دیئے جاتے ہیں کہ حاکم اپنے اس یقین کے باوجود کہ مجرم نے جرم کا ارتکاب کیا ہے اس پہ حد نافذ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ مقدمات کی تفتیش (بالخصوص حدود قصاص کے مقدمات کی) کسی دوسرے ادارے کے سپرد کر دی جائے۔ اس کے لیے بہت سے اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ چند ایک کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(الف) سارے ملک میں اسلام کا حقیقی نظام احتساب قائم کر دیا جائے اور حدود قصاص کے مقدمات کی تفتیش محکمہ احتساب کے سپرد کر دی جائے۔

(ب) اگر بالفرض پہلی صورت دشوار ہو تو تفتیش کی ساری ذمہ داری سی۔ آئی۔ اے پہ ڈالی جائے۔

(ج) انسب یہ ہے کہ گورنرز انسپکشن ٹیم یا ہائی کورٹ انسپکشن ٹیم کی طرز پہ ملک کے تمام افسروں میں سے بہترین افسروں کو چن کر تفتیشی افسر بنا دیا جائے اور انھیں تنخواہوں کا ایسا سکیل دیا جائے کہ رشوت ستانی کا امکان نہ رہے۔ اور اگر کسی محتسب یا تفتیشی افسر پہ رشوت ستانی کا جرم ثابت ہو جائے تو اسے سزائے موت مع ضبطئ املاک دی جائے۔

تدریب

اسلامی حدود و قصاص کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے جلد از جلد قاضیوں کی سرکاری سطح پہ تربیت کا انصرام کیا جائے۔ اور ضروری قرار دیا جائے کہ قضاۃ جدید قوانین کی ضروری واقفیت کے ساتھ شرعی قوانین کے ماہر ہوں۔ قاضیوں کی تربیت کے لیے ہر صوبے میں ایک ادارہ وفاق کے ماتحت قائم کیا جائے۔ تمام اداروں کا نصاب ایک ہو اور سب کا امتحان وفاقی ادارہ اپنے اہتمام میں لے۔ قاضیوں کے تقرر کے وقت صرف تعلیمی صلاحیت نہ دیکھی جائے بلکہ تقویٰ کا اعلا معیار بھی مدنظر رکھا جائے۔

تدوینِ فقہ

قرونِ اولیٰ میں جب کہ اسلام زیادہ تر عرب کے علاقے تک محدود تھا باضابطہ فقہ کی تدوین کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اسلامی نظام نہایت سیدھا سادہ تھا اور عرب کا ماحول بھی سیدھا سادہ۔ لیکن جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور مصری، ایرانی، کلدانی، ترکی، رومی اور جنوبی ایشیا کی اقوام دائرہ اسلام میں داخل ہوگئیں تو معاشرہ پہلے کی طرح سیدھا سادہ نہ رہ گیا بلکہ اب نئے نئے مسائل نے سر اٹھایا، عقلی موشگافیاں شروع ہوئیں اور اسلام کا نظام عدل ایرانی اور رومی نظامِ عدل کے بالمقابل آگیا تو ضرورت پیش آئی کہ اس عہد کے پیچیدہ معاشرے کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر باضابطہ طور پر فقہ کی تدوین کی جائے۔ اللہ تعالےٰ ہمارے فقہائے کرام کی قبور کو انوار و برکات سے بھر دے کہ انھوں نے نہ تو ہمت ہاری اور نہ لکیر کے فقیر بنے رہے بلکہ انہوں نے قرآن و سنت پر غور و فکر کر کے ان سے اصولوں کا استخراج کیا اور ان کی بنیاد پر فقہ کا ایک عظیم الشان سرمایہ جمع کر دیا، ایسا سرمایہ کہ جس کی بنیاد پر بنو عباسیہ کی جیسی عظیم الشان سلطنتوں کا نظام چلتا تھا۔ اور کبھی فقہ اسلامی کے بارے میں تنگئ داماں کی شکایت نہیں کی گئی۔

الحمدللہ کہ آج وہ سارا علمی اور تحقیقی سرمایہ اپنی تمامتر جامعیت کے ساتھ محفوظ ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ چونکہ چھٹی ساتویں صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا سلسلہ رک گیا اس لئے ہماری فقہ میں جمود آگیا۔ زمانہ تو ترقی کرتا رہا لیکن فقہ اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی لہٰذا ہماری فقہ کا بالخصوص وہ حصہ جو معاملات اور قضا و احکام سے متعلق ہے کسی قدر پیچھے رہ گیا ہے۔ اگرچہ فتاویٰ عالمگیری اور مجلۃ الاحکام العدلیہ جیسے کام ماضی میں ہوئے ہیں تاہم زمانہ جس تیزی سے پیچیدہ ہوتا جارہا ہے یہ کام بھی مکتفی نہیں کیے جاسکتے لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنی فقہ کے محولہ بالا حصے کا دوبارہ جائزہ لیں اور حالات حاضرہ کی روشنی میں اس کی تدوین جدید کریں۔ فقہ کی تدوین جدید کے وقت اگر مندرجہ ذیل امور کو مدنظر رکھا جائے تو کم سے کم غلطی کا امکان ہے:

(الف) اللہ تبارک تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۱۸۵)

ترجمہ: اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے وہ دشواری نہیں چاہتا۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا :

يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا [1]

ترجمہ : آسانی پیدا کرنا دشواری نہ پیدا کرنا، خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا۔

للہٰذا موجودہ دور میں جب فقہ کی تدوینِ جدید کی جائے تو سنت کے مطابق احکام کا آسان ترین پہلو اختیار کیا جائے۔ مثلاً گواہ پر فسق کا حکم لگاتے وقت صرف ظاہری شکل وصورت ہی کو معیار نہ بنایا جائے۔ اسی طرح زنا کی شہادت میں کالمیل فی المکحلہ پر بھی غور کرنا چاہیے اور موجودہ دور میں جو جدید قرائن پیدا ہو چکے ہیں انہیں بھی شرعی حیثیت دینی چاہیے۔

(ب) جدید دور میں جرم کے ثبوت کے لیے بہت سے سائنٹیفک ذرائع پیدا ہو چکے ہیں مثلاً خون کا امتحان، طبی معائینہ، بالوں کا امتحان، ہاتھ کے نقوش، فوٹو، ٹیپ ریکارڈ جیسی چیزوں سے حاصل ہونے والے ثبوت یا کسی واقعہ کو جانچنے کے لیے جو جدید آلات ایجاد ہو چکے ہیں انہیں بھی قرائن میں شمار کرنا چاہیئے۔

(ج) ہمارے فقہائے کرام نے تدوینِ فقہ کے وقت اپنے دور اور اپنے علاقے کے عرف کو اہمیت دی تھی۔ ہمارے علاقے اور ہمارے دور کا عرف دوسرا ہے اس لیے ضروری ہے کہ فقہ کی تدوینِ جدید کے وقت ہم متقدمین کی طرح اپنے عرف کو اہمیت دیں۔

(د) ضروری ہے کہ اول ملک کے جید اور مستند علماء کا ایک بورڈ بنایا جائے جو جدید دور کے مسائل پر غور کر کے قیاس، استحسان، استصحاب، استصلاح اور مصالح مرسلہ کے دائرہ کار کا آج کل کے حالات کی روشنی میں تعین کرے اور پھر اگر ضرورت محسوس ہو تو تدوینِ جدید کے وقت ان سے استفادہ کرے۔ اس کے بعد عالم اسلام کے علما کا ایک بورڈ بھی تشکیل دیا جائے۔ ان بورڈوں میں جدید قوانین کے ماہرین اور علمائے دین دونوں کو جمع کیا جائے۔ جب تک یہ رویہ نہ اختیار کیا جائے گا یقین کیجئے کہ فقہ کی تدوینِ جدید ممکن نہ ہو گی اور اگر بالفرض تدوینِ جدید نہ ہو تو ہماری فقہ کا موجودہ سرمایہ ناکافی ثابت ہو گا۔

آخر میں علما اور مفکرین کی خدمت میں اتنا عرض کروں گا کہ آج عالم اسلام بالعموم اور اہلِ پاکستان بالخصوص ایک اہم موڑ پر کھڑے ہیں۔ آج کی منتشت اور حیران دنیا جو تباہ کن جنگ کے دہانے پر پہنچ چکی ہے، رہبری و رہنمائی کے لیے رحمۃ للعالمین کی امت کی طرف

---

[1] البخاری : ۱ : ۱۶ : طبع دہلی۔

دیکھ رہی ہے۔ ستاروں کی گزرگاہوں کے ڈھونڈھنے والوں کی شبِ تاریک، تاریک سے تاریک تر ہوتی جا رہی ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافۃً للناس بشیراً و نذیراً تھے، ان کے اسوۂ حسنہ کے ہم امین ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خیر امت کے لقب سے نوازا ہے، ہم پر صرف اپنی ہی اصلاح کی ذمے داری نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے اخرجت للناس کی بھی تصریح ہے، اس لیے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں سیادت و قیادت کا فرض اسی امت کو ادا کرنا ہے۔ چودھویں صدی کے اختتام اور پندرھویں صدی کے آغاز میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے جو آثار نظر آرہے ہیں ان کے پیچھے غالباً تدبیر الٰہیہ کارفرما ہے۔ اب اس امت کو آگے بڑھ کر اسلام کو ایک فعال، متحرک اور انقلابی نظامِ حیات کی طرح پیش کرنا ہے۔ آج ہی کے دن صبح صادق کے وقت ہدایت کا آفتاب وادیٔ بطحا سے طلوع ہوا تھا، الحمد للہ کہ ہم آج پاکستان کے اس عظیم شہر سے آوازۂ اخلاقِ نبوی بلند کر رہے ہیں۔ خدا کرے ہمارا یہ آوازہ عصرِ رواں کے لیے حیاتِ نو کا پیغام اور ہماری یہ صدا کاروانِ ملت اسلامیہ کے لیے صلائے الرحیل ثابت ہو۔ آمین

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل، ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی، ورنہ سخن بسیار است

محنت کا ضابطۂ اخلاق
(سیرۃ نبوی کی روشنی میں)

جناب محترم مولانا عبدالقدوس قاسمی

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ علی رسولہ الذی کافۃ للناس وخاتم النبیین :

فخر مرسلین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور خلقِ عظیم کا مستند ترین مرقع وہ ہے جو قرآنِ کریم کے حوالے سے تیار ہو جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "کان خلقہ القرآن" (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت قرآنِ کریم تھی) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ قرآنِ کریم کی تعلیمات پر منطبق تھا۔

قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ محنت اور جدوجہد انسان کی فطرت ہے۔ ارشادِ باری ہے "لقد خلقنا الانسان فی کبد"[1] (انسان کو ہم نے سخت مشقت کے لیے پیدا کیا ہے) اس آیت کا مفہوم یہی ہے کہ محنت اور کام انسان کی زندگی کا لازمہ ہے۔ جب تک وہ زندہ رہے گا کسی نہ کسی جسمانی یا دماغی عمل میں مصروف ہی رہے گا۔

عمل اور کام کا ذکر قرآنِ کریم میں بڑی کثرت سے آیا ہے یعنی لفظِ عمل اور اُس کے مشتقات ۳۵۹ مرتبہ اور فعل اور اُس کے مشتقات ۱۰۹ مرتبہ ذکر ہوئے ہیں۔ کسب، ابتغاء وغیرہ کتنی اور ہم معنی الفاظ کا استعمال ان کے علاوہ ہے۔ ان آیات کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ انسان کوئی نہ کوئی عمل تو لازماً کرتا ہے جس کا نتیجہ اُس کے سامنے آکر رہے گا۔ اب یہ اُس کے انتخاب پر موقوف ہے۔ اگر اس کا عمل اچھا ہو تو نتیجہ اچھا رہے گا اور اگر عمل بُرا ہو تو نتیجہ بھی بُرا رہے گا۔ (فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ)[2]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں عمل سے متعلق تین امور نمایاں ہیں: اولاً یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی سراسر جدوجہد اور سعی وعمل کا نمونہ تھی۔ حضورؐ کے شب وروز کا ایک لمحہ بھی فراغت یا غفلت سے نہیں گزرا۔ ثانیاً یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال حسنِ انتخاب کا مثالی نمونہ تھے، جن میں سعادتِ اُخروی کا پہلو غالب تھا۔ ثالثاً یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں دنیوی زندگی سے متعلق اعمال کا پہلو بھی کسی حد تک شامل تھا۔ حضورؐ کی زندگی رہبانیت کی زندگی نہ تھی۔

عمل اور محنت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اُسوۂ حسنہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ محنت اور کام ایک قابلِ عزت عمل ہے جسے انبیاءؑ سر انجام دیتے رہے ہیں۔ کھیتی باڑی، شجر کاری، خیاطی، نجاری، آہن گری وغیرہ متعدد پیشوں کی صنعت گری انبیاء کرامؑ ہی کی طرف منسوب ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی سازی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی کا تذکرہ قرآنِ کریم نے بھی فرمایا ہے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از نبوت کی زندگی میں دو ایسے مواقع کا تذکرہ آتا ہے جہاں آپ نے اُجرت پر کام کیا۔ ایک وہ موقع جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کی بکریاں چرائی تھیں۔ سنن نسائی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بھی نبی گزرا ہے اُس نے شبانی کا عمل انجام دیا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ کیا آپ نے بھی ایسا کام انجام دیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وانا کنت ارعاها لاهل مكة بالقراريط"[۲۲] (میں بھی مکہ والوں کی بکریاں قراریط پر چرایا کرتا تھا) حدیث کے ایک راوی نے القراریط کی تشریح یہ کی ہے کہ ایک بکری کی چرائی کی اُجرت ایک قیراط تھی۔ بعض اور اصحاب کے خیال میں قراریط کسی چراگاہ کا نام ہے۔

دوسرا موقع وہ تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ کا مال لے کر شام کا سفر اختیار کیا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو بُلا کر عرض کی (اور یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ابھی آپؐ کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے نہیں ہوا تھا) کہ مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ آپ قول کے سچے، امانت دار اور با اخلاق ہیں۔ اگر آپ میرا مال تجارت کے لیے لے جانا قبول فرمائیں تو جو حق الخدمت میں دوسرے قریشیوں کو دیتی ہوں آپ کو اُس سے دُگنا دوں گی چنانچہ دو اُونٹنیاں اُجرت ٹھہری۔ اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ کا مال لے جا کر بیچ آئے اور نفع دوسروں کی بہ نسبت دُگنا ہوا تو حضرت خدیجہؓ نے دو اونٹنیوں کے بجائے چار اونٹنیاں خدمت میں پیش کیں۔[۲۳] اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُجرت پر کام کرنے والے کے جوہر یہ ہیں کہ سچا اور دیانت دار ہو اور کام کی صلاحیت اس میں موجود ہو اور کام کرانے والے کا یہ فرض ہے کہ عمل کے اختتام پر حق الخدمت پُورا پیش کرے۔ اگر فریقین میں سے کوئی ایک یا دونوں مقررہ شرائط سے زائد کارکردگی دکھائیں تو یہ اُس کا احسان اور تبرع ہوگا۔ فریقِ ثانی اُس کے معاوضے کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ اس مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مزدور اچھا کام کرے تو کام لینے والے کو بھی چاہیے کہ زیادہ اجرت دے کر اُس کی حوصلہ افزائی فرمائے۔

عہدِ نبوت میں آپؐ کی توجہات تمام تر دعوتِ اسلام کی طرف مبذول رہیں۔ معاشی ضرورتوں کا

انتظام غیب سے ہو جاتا تھا۔ اور اس سلسلے میں حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوبکرؓ کا ایثار اور تعاون خصوصی طور پر نمایاں تھا۔ بہرحال آپؐ کے سیرت نگاروں نے یہ تذکرہ ضرور کیا ہے کہ حضورؐ گھر کا بہت سا کام کاج خود اپنے دستِ مبارک سے انجام دیتے تھے۔ کپڑے خود ہی سی لیتے تھے۔ گھر کی چیزیں خود ہی سنبھال لیتے، گوشت کاٹتے، خادم کا ہاتھ بٹاتے۔ اپنے جوتے خود ہی گانٹھ لیتے، قمیص میں پیوند لگاتے، بسا اوقات خود ہی اونٹ چرا لیتے۔ آٹا گوندھ لیتے اور بازار سے سودا سلف خرید کر اٹھا لاتے۔(۵) ایسے کام انجام دے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے ایک نمونۂ عمل مہیا فرمایا ہے۔

اجتماعی مواقع میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے ساتھ مل کر محنت کے کاموں میں حصہ لیا ہے۔ مسجدِ نبویؐ کی تعمیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ نفسِ نفیس حصہ لینا اور اینٹیں لانا سیرت کا مشہور واقعہ ہے۔ اسی طرح یہ قصہ بھی اصحابِ سیر نے قلم بند فرمایا ہے کہ ایک سفر میں صحابہؓ نے یہ ارادہ کیا کہ بکری ذبح کر کے کھانے کے لیے تیار کریں۔ کسی نے بکری کو ذبح کرنے، کسی نے اس کی کھال نکالنے اور کسی نے پکانے کی ذمہ داری لے لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں جلانے کی لکڑی اکٹھی کردوں گا"۔ صحابہ نے عرض کی کہ ہم کام کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا "بے شک آپ لوگ کافی ہیں مگر میں آپ میں ممتاز ہو کر رہنا نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے ایسی زندگی پسند نہیں فرماتا کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں ممتاز نظر آئے"۔(۶)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام کی اچھی خاصی تعداد تھی اور وہ وقتاً فوقتاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نجی کام انجام دیا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت انسؓ بن مالکؓ، حضرت بلالؓ، حضرت ابورافعؓ اور حضرت اُسامہ بن زیدؓ(۷)۔ یہ خدام اجیر یا مزدور نہ تھے بلکہ ایک گھرانے کے افراد کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ سایہ بسر کر کے خدمت انجام دیتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسروں سے اُجرت پر کام لینے کے مواقع بھی کئی پیش آئے جن کی تفصیلات کتبِ سیرت میں مہیا نہیں ہیں۔ تاہم صحیح بخاری اور دوسری کتبِ حدیث میں یہ ذکر ضرور ہوا ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور حجام ابوطیبہ کو دو صاع اُجرت میں دیے۔ اس ضمن میں حضرت انسؓ کی یہ حدیث قابلِ ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی مزدور کے حق میں کبھی کمی نہیں فرماتے تھے۔(۸)

محنت اور عمل سے متعلق کتاب و سنت میں کافی احکام وارد ہوئے اور بہ حیثیت شارع و مقنن یہ احکام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا اہم حصہ ہیں۔ ان میں سے چند اہم امور کا تذکرہ اس موقع پر مناسب ہوگا۔

کسبِ معاش کی فضیلت

قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں کسبِ معاش کی ترغیب دی گئی ہے اور وسیلہ معاش کو اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیا گیا ہے:

۱۔ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۝[9]

(اور اُس کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا ہے رات اور دن میں اور اُس کی دی ہوئی روزی کا تلاش کرنا ہے۔)

۲۔ وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۝[10]

(اور یہ اُس کی رحمت ہی تو ہے کہ اُس نے تمہارے لیے رات اور دن بنا دیے کہ تم آپس میں آرام بھی کرو اور اُس کی روزی بھی تلاش کرتے رہو۔)

۳۔ رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۝[11]

(تمہارا پروردگار ہی تو ہے جو تمہارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اُس کے فضل کی تلاش کرو۔)

۴۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ ۝[12]

(حج کے سفر میں تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاشِ معاش کرو۔)

کسبِ معاش کی فضیلت سے متعلق چند احادیثِ نبویؐ بھی درج ذیل ہیں۔

۱۔ ان اطیب ما اکل الرجل من کسبہ[13]

(پاکیزہ ترین خوراک یہ ہے کہ انسان خود کما کر کھائے)

۲۔ ما کسب الرجل کسبا اطیب من عمل یدہ[14]

(انسان کے لیے کوئی کمائی اُس کے ہاتھ کی کمائی سے زیادہ پاکیزہ نہیں)

۳۔ ما اکل احد طعاما خیرا من ان یاکل من عمل یدہ وان نبی اللہ داود کان یاکل من عمل یدہ[15]

(کوئی شخص اس سے بہتر غذا نہیں کھا سکتا کہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤدؑ بھی اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے)

۴۔ لان یحتطب احدکم حزمة علی ظھرہ خیرلہ من ان یسأل احدا فیعطیه او یمنعه (۱۶)

(یہ کہ تم ایندھن کا گٹھا اپنی پیٹھ پر اُٹھالو۔ اور اسے بیچ کر گزارہ چلاؤ اس سے بہتر ہے کہ کسی سے مانگو چاہے وہ تمھیں کچھ دے یا نہ دے)

۵۔ ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف (۱۷)

(اللہ تعالیٰ اُس مومن بندے کو پسند کرتا ہے جو کسی حرفت میں لگا ہو)

۶۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ مانگنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تمہارے گھر میں کچھ ہے؟ اُس نے عرض کی "جی ہاں ایک ٹاٹ ہے جس کا کچھ حصہ میں بچھا تا اور کچھ حصہ اوڑھتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک لکڑی کا پیالہ ہے جس میں میں پانی پیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر وہ دونوں چیزیں گھر سے لے آیا اور حضورؐ نے انھیں نیلام کر کے دو درہم میں بیچا اور وہ درہم اُسے دے کر فرمایا کہ ایک درہم کا غلہ خرید کر گھر میں ڈال دو اور ایک درہم سے کلہاڑی کا پھل خرید کر میرے پاس لاؤ۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے دستہ ڈال دیا اور فرمایا کہ جاؤ ایندھن بیچنے کی مزدوری کیا کرو اور پندرہ دن کے بعد مجھے اطلاع دو۔ وہ پندرہ دن کے بعد آیا تو دس درہم کما چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھارے لیے یہ محنت اس سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن تمھارا سوال تمھارے چہرے پر داغ ہو۔ سوال صرف تین اشخاص کے لیے جائز ہے: وہ فقیر جو اُٹھنے کے قابل بالکل نہ ہو یا ایسا شخص جس پر تاوان کا زبردست بوجھ آپڑا ہو۔ یا وہ جس نے دیت کا بوجھ اُٹھایا ہو اور وہ اسے تکلیف دے رہا ہو۔ (۱۸)

۷۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں چند صحابہ تشریف فرما تھے کہ سامنے سے ایک پُھرتیلا شخص گزرا۔ صحابہ فرمانے لگے کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس شخص کی قوتیں جہاد کی راہ میں صرف ہوتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ اپنے چھوٹے عیال کے نفقہ کے لیے محنت کرنے جا رہا ہو تو بھی اللہ کی راہ میں ہے اور اگر بوڑھے ماں باپ کے لیے محنت کا ارادہ ہو تب بھی اللہ کی راہ میں ہے۔ اور اگر سوال کی ذلت سے بچنے کے لیے نکلا ہو تب بھی فی سبیل اللہ ہے۔ ہاں اگر اس کی پُھرتی فخر اور دکھاوے کی ہو تو پھر شیطان کی راہ میں ہے۔ (۱۹)

حکومت کے کسی منصب یا ملازمت میں مشغول رہنا بھی ایک عمل ہے جو محنت کے دائرے میں آتا ہے۔ چُناں چہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو فرمایا "میری قوم کو یہ معلوم ہے کہ میرا پیشہ (تجارت)

میرے گھر والوں کے خرچے کے لیے کافی تھا۔ اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول ہوگیا ہوں، اس لیے ابوبکر کے گھر والے مسلمانوں کے بیت المال سے کھائیں گے اور ابوبکر اس میں مسلمانوں کے لیے محنت اور حرفت میں مشغول رہے گا۔[۲۱]

خادموں کے ساتھ سلوک

۱۔ حضرت انسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال حضورؐ کی خدمت کی۔ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اُف نہ کہا۔ اگر میں نے کبھی کوئی چیز تیار کی یا کوئی کام کیا تو یہ نہ فرمایا کہ ایسا کیوں کیا اور اگر کبھی کوئی کام چھوڑ دیا تو یہ نہ فرمایا کہ کیوں چھوڑا ہے؟[۲۱]

۲۔ ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کا خادم کھانا پکا کر اُس کے پاس لائے تو اُسے اپنے ساتھ کھانے کے لیے بٹھائے اور اگر نہ بٹھائے تو کھانے میں سے اُسے بھی کچھ کھلا دے، کیوں کہ خادم نے اس میں محنت کی ہے۔[۲۲]

۳۔ حضرت ابومسعود بدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ پیچھے سے آواز آئی کہ "ابومسعود! جتنی دسترس تم کو اس غلام پر حاصل ہے اُس سے زیادہ دسترس اللہ تعالیٰ تم پر رکھتا ہے۔" مُڑ کر دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ میں نے فوراً کہا کہ "اب یہ اللہ تعالیٰ کے نام پر آزاد ہے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی لپیٹ تم تک پہنچ جاتی۔"[۲۳]

۴۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو دیکھا کہ ایک غلام اُن کے ساتھ ہے اور دونوں یکساں جوڑے پہنے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے اس کی وجہ یوں بتائی کہ انھوں نے ایک دفعہ ایک بھائی (یعنی غلام) کو ناشائستہ بات کہی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ اور فرمایا:

ان اخوانکم خولکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یأکل ولیلبسه مما یلبس ولا تکلفوهم ما یغلبهم فان کلفتموهم ما یغلبهم فاعینوهم

(یہ تمھارے بھائی، تمھارے خدام اللہ تعالیٰ نے تمھارے اختیار میں دیے ہیں۔ تو جب کسی کا بھائی اُس کے اختیار یعنی ماتحتی میں آئے تو جو خود کھائے اُس میں سے اُسے بھی کھلائے اور جو خود پہنے اُس میں سے اُسے بھی پہنائے۔ ان پر ایسا بوجھ نہ ڈالو جو اُن کے بس کا نہ ہو، اور اگر کوئی کام اُن کی طاقت سے زیادہ اُن کے ذمّے لگا دیا تو پھر اُن کی مدد کیا کرو۔)[۲۴]

نوکروں کے ذمہ مالکوں کے حقوق

خدمت اور عمل کام لینے والے اور کام کرنے والے کے درمیان معاہدہ ہے جو باہمی رضامندی سے طے ہوگا۔ اس معاہدے میں مزدور کی ذمہ داری واضح طور پر متعین ہونا چاہیے۔ تعیین یا زمانے کے لحاظ سے ہو یا عمل کے ذریعہ سے۔ وقت کے لحاظ سے عمل کی تعیین کی مثال یہ ہے کہ حضرت شعیب (شیخ مدین) نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بات متعین کی تھی کہ آٹھ سال یا دس سال اُن کے ہاں خدمت میں گزار دیں گے۔ اسی طرح آج کل کی ملازمت اور مزدوری بھی ہے جو دنوں اور گھنٹوں کے ذریعہ سے متعین ہوتی ہے۔

کام کے ذریعہ سے تعیین کی مثال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے لگے تو ایک ماہر رفیق کے یہ کام سپرد کیا گیا تھا کہ عام شاہراہ سے بچا بچا کر انھیں مدینہ منورہ تک پہنچائے (۲۵)

بہرحال مزدوری کے وقت یا نوعیت کی تعیین کے بعد نوکر اور مزدور کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کام کو سر انجام دے، اس بارے میں اپنی پوری صلاحیت صرف کر دے اور ایمان داری اور خیر خواہی کے تقاضے اچھی طرح پورے کرے۔ یہ اصول ایک تو سورۃ یوسف[۲۶] اور سورۃ القصص[۲۷] کی آیات سے متعین ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے:

خیر الکسب کسب العامل اذا نصح (۲۸)

(بہترین کمائی مزدور کی کمائی ہے جب وہ خیر خواہی سے کام کرے)

کام کرنے والے کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ جو کام کرے اُس میں پختگی اور اتقان کا خیال رکھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

ان اللہ یحب اذا عمل احدکم عملا ان یتقنہ (۲۹)

(اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کوئی کام کرے تو اُسے محکم کرے)

حضرت سیرینؒ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحب زادہ حضرت ابراہیم کی قبر میں شگاف دیکھا تو کسی سے کہا کہ اسے بند کر دو۔ کسی صاحب نے پوچھا کہ کیا اس شگاف کے بند کرنے سے میت کو کچھ فائدہ حاصل ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میت کو نہ تو فائدہ ہوگا اور نہ نقصان

لیکن (یہ شگاف) زندہ لوگوں کی نظروں کو بُرا لگتا ہے۔(۳۰)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھریلو خادموں کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ:

العبد راع فی مال سیدہ وھو مسئول عنہ(۳۱)

(غلام اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے۔ اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا۔

کام کرنے والوں کے حقوق

عامل اور مزدور از رُوئے معاہدہ جس حق الخدمت کا مستحق ہے عمل انجام دینے پر اُسے فوراً ادا کیا جائے۔ معاملے کے ایک فریق کے طور پر وہ اس امر کا مجاز نہیں کہ کام کی تکمیل یا وقت کے گزرنے سے پہلے حق الخدمت کا مطالبہ کرے یا مقررہ معاوضے سے زیادہ کا مطالبہ کرے۔

اس بارے میں ہر عامل اور مزدور کا معاملہ اپنے معاہدے کے لحاظ سے طے ہوگا۔ کسی دوسرے کا معاہدہ اس پر اثر انداز نہ ہوگا۔ چناں چہ حضرت خدیجہؓ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تجارت کے لیے مال حوالے کیا تھا تو آپ کے ساتھ جو شرطِ معاہدہ طے ہوئی تھی وہ دوسروں سے جُدا اور ممتاز تھی۔

اُجرت کا معاہدہ طے کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مزدور کو کام سے پہلے اجرت کی مقدار بتادی جائے تاکہ بعد میں نزاع پیدا ہونے کا احتمال باقی نہ رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من استاجر اجیرا فلیعلمہ اجرہٗ(۳۲)

(کسی کو کسی مزدور کو کام پر لگانا ہو تو اُسے اُس کی مزدوری پہلے سے بتادے)

اور جب کام کرنے والا کام کو مکمل کرے تو پھر اُس کے حق الخدمت میں دیر کرنا جائز نہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف رشحہ(۳۳)

(مزدور کو اُس کی مزدوری اُس کے پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی پہلے دیا کرو)

ایک حدیثِ قدسی کا مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تین اشخاص کے خلاف میں خود مدعی ہوں گا: ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو کسی مزدور کو کام پر لگا کر اُس سے کام پُورا لے اور مزدور کا حق پُورا نہ دے۔(۳۴)

عامل اور مزدور کے ساتھ احسان

شرائطِ معاہدہ سے زائد حسنِ سلوک تبرع اور احسان ہوگا۔ اس کی ایک مثال حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ پچھلے لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا کہ اُس نے ایک مزدور سے مزدوری طے کی تھی اور جب مزدور کام کر چکا تو اُس نے واجب مزدوری اُس کو پیش کی مگر مزدور اس پر راضی نہ تھا بلکہ اور زائد کا مطالبہ کرنے لگا جس سے مالک نے انکار کیا۔ اور مزدور حق الخدمت چھوڑ کر چلا گیا۔ اس حق الخدمت کو مالک نے اُس مزدور کی طرف سے بکری پالنے میں لگایا۔ چند سالوں میں اس سے بڑا ریوڑ بنا۔ اتفاقاً وہ مزدور دوبارہ آیا اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے لگا۔ مالک نے پورا ریوڑ اُس کے حوالے کیا، جس کو دیکھ کر مزدور بہت حیران رہ گیا۔ اُس کی اس نیکی کا صلہ اُسے دنیا میں یہ ملا کہ ایک دفعہ دو دوستوں کے ساتھ غار میں گھر گیا تھا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی نیکی کے طفیل دُعا مانگی۔ اُس نے بھی اپنی اس نیکی کے صدقے خلاصی کی دعا مانگی۔ اور اُس کی دُعا قبول ہوگئی (۸)

اس مثال سے یہ سبق ملتا ہے کہ مزدور کو نفع بخش کاموں میں شریک کرنا چاہیے۔

محنت اور کسب کے جائز ذرائع

وسیلۂ معاش کی تلاش انسان کے ذمّے فرض ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے اس بارے میں کچھ پابندیاں بھی لگائی ہیں اور جن مکاسب سے معاشرے کو انفرادی یا اجتماعی نقصان پہنچتا ہے وہ ناجائز ٹھہرائے گئے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر سازی اور گانے بجانے کے پیشے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ بچوں سے مزدوری کا کام لینا اور ہنرمند عورتوں کے سوا دوسری عورتوں سے محنت مزدوری کا کام لینا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے حوالے سے ناپسندیدہ بتایا گیا ہے۔

حوالے

(۱) سورۃ البلد آیت ۴۔ (۲) سورۃ الزلزال آیات ۷، ۸۔ (۳) البخاری: الجامع الصحیح، کتاب الاجارات ۱: ۱۰۳۔ (۴) اسیرۃ الحلبیہ ۱: ۱۳۵۔ (۵) النبھانی وسائل الوصول الی شمائل الرسول ص ۱۳ النویری ونہایۃ الارب ۱۸: ۲۶۲۔۲۶۳۔ (۶) زرقانی شرحِ مواہب ۴: ۲۶۵، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا خصائل نبوی ص ۲۸۱۔ (۷) برائے فہرست خدام رجوع کیجیے نہایۃ الارب ۱۸: ۲۲۹۔۲۳۷ و زاد المعاد ۱: ۱۹۔ (۸) البخاری الجامع الصحیح کتاب الاجارات ۱: ۳۰۴، زاد المعاد ۳: ۸۰

(۹) سورۃ الروم آیہ ۲۳ ۔ (۱۰) سورۃ القصص آیہ ۲۷ ۔ (۱۱) سورۃ الاسراء آیہ ۶۶ ۔ (۱۲) سورۃ البقرہ آیہ ۱۹۸ ۔ (۱۳) ابن ماجہ کتاب التجارات، والنسائی، السنن ۔ کتاب البیوع ۲: ۲۱۰ ۔ (۱۴) ابن ماجہ عن مقدام بن معدیکرب بہ حوالہ کنز العمال ۴: ۴ ۔ (۱۵) البخاری: الجامع، کتاب البیوع ۱: ۲۷۸ ۔ (۱۶) البخاری الجامع: کتاب البیوع، حوالہ گزشتہ وکتاب المساقاۃ ۱: ۳۱۹ ۔ (۱۷) طبرانی عن ابن عمر بہ حوالہ کنز العمال ۴: ۱ (۱۸) سنن ابن داؤد بہ شرح بذل المجهود ۳: ۲۴ ۔ (۱۹) طبرانی بہ حوالہ اشتراکیۃ الاسلام مصطفی السباعی وکنز العمال ۴: ۲ ۔ (۲۰) البخاری: الجامع، کتاب البیوع ۱: ۲۷۸ ۔ (۲۱) البخاری: الجامع، کتاب الادب ۲: ۸۹۲ (۲۲) ایضاً کتاب العتق ۱: ۳۴۶ ۔ (۲۳) مسلم: الصحیح ۲: ۵۱ ۔ (۲۴) البخاری: الجامع ۱: ۲۴۶ ومسلم الصحیح ۲: ۵۲ ۔ (۲۵) البخاری: الجامع، کتاب الاجارات ۱: ۳۰۱ ۔ (۲۶) سورۃ یوسف آیہ ۵۵ ۔ (۲۷) سورۃ القصص آیہ ۲۶ ۔ (۲۸) مجمع الزوائد ۴: ۹۸ ۔ (۲۹) حوالہ گزشتہ ۔ (۳۰) طبقات ابن سعد ج ۱ جزو ۱ ص ۹۲ ۔ (۳۱) الجامع الصحیح کتاب العتق ۱: ۳۴۷ ۔ (۳۲) النسائی: سنن ۲: ۱۵۰ و محمد بن الحسن فی کتاب الآثار عن ابی سعید الخدری مرفوعاً ۔ (۳۳) مجمع الزوائد ۴: ۹۷ ۔ (۳۴) البیہقی، السنن ۶: ۱۲۱ (۳۵) الجامع الصحیح، کتاب الاجارات ۱: ۳۰۲، ۳۰۳ ۔ (۳۶) محمد مبارک: نظام الاسلام، الاقتصاد ص ۷۰

اسلامی تعلیمات اور تربیتِ اساتذہ

جناب محترم پروفیسر اسماعیل سیٹھی

پیشتر اس کے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اساتذہ کی تربیت و تعلیم کے مقاصد پہ گفتگو کی جائے یہ طے کرنا ہوگا کہ ازروئے اسلام انسان کی تخلیق کی غرض و غایت کیا ہے؟ کائنات ہستی میں اس کا مقام کیا ہے؟ اس کے فرائض اور ذمے داریاں کیا ہیں؟ قرآن حمید کس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کس نوع کی تعلیم تجویز کرتا ہے؟

بدیہی اور بہت واضح بات ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے پورے کرۂ خاکی اور اس میں پھیلی ہوئی وسیع و عریض کائنات پہ انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ایک ایسا محور ہے جس کے گرد پورا عالمِ آب و گِل گھوم رہا ہے۔ کتاب اللہ الحمید نے تو لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ کہہ کر انسان کو بے حد و حساب اور بے نہایت شرف و مجد کا سزاوار ٹھہرا دیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رُو سے انسان نائب حق ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ:

نائب حق در جہاں بودن خوش است

حضرت مہر علی شاہ کا ارشاد ہے:

جملۂ اَسماء را تو بہ اَنت آمدی   زاں خلیفۂ و مَظہرِ ذاتِ آمدی

عَلّمِ الاَسماء طرازِ جانِ تُست   اسجدو الآدم ہم اندر شانِ تُست

حضرت مولانا رُوم بھی فرما رہے ہیں کہ انسان عالمِ ہست و بود کا مرکز ہے، وہ مسجودِ ملائک ہے اور اس دُنیا کی ہر چیز اس کی اطاعت و متابعت کے لیے ہے۔

قرآن عظیم کی تصریحات کے مطابق خدا تعالیٰ ایک قائم بالذات، ایک ذی حیات ابدی اور مطلقاً آزاد تخلیقی فعلیت ہے جو واحد، قادر مطلق، حسن مکمل، مہربانِ کامل، عادل اور خیر تمام ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے انسان میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رُوح پھونکی ہے۔ اس لیے خدا کی صفات اس کے لیے ایک نصب العین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہذا وحدت، ابدیت، صداقت، حسن، خیر، محبت، عدل، قوت اور آزادی انسان کے لئے بنیادی اقدار ہیں۔

جن کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے سعی کرنا اس کی اپنی ذات اور اس کے ماحول کے دوسرے افراد کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

اِن توضیحات کے پیشِ نظر اسلام وہ انسان پیدا کرنا چاہتا ہے جو علم حاصل کرکے حقائقِ اشیا سے واقف ہو۔ اور وہ انسان جو برتر مقاصد کے لئے زندہ رہے۔ اور چند روزہ دنیا میں اس کی زندگی کا مقصد صرف رب العزّت کی خوشنودی کا حصول اور اس کی رضا طلبی ہو، جو خواہشاتِ نفسانی پر قابو رکھے، حُبِّ خداوندی اور یادِ الٰہی میں سرشار رہے، احکامِ خداوندی کی پابندی میں جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کردے۔ بنی نوعِ انسان کی خدمت اور تکریمِ آدمیت اس کا شعار ہو۔ فطرت کی قوتوں کا مسخر کرنے والا ہو کہ اُن سے انسانیت کی فوز و فلاح کا کام لیا جا سکے۔ ایک ایسا انسان جس کے بارے میں اقبال نے فرمایا کہ:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہان سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

مقصدِ گفتگو یہ ہے کہ اسلام انسان سے صداقت، حسن، خیر یا بالفاظ دیگر تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کا طلب گار ہے۔ اسلام اسے دوسری دُنیا کے لئے تیار کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ اُس کی یہ دُنیا بھی سنوری رہے۔ گویا اسلام ایسے انسان چاہتا ہے جو عبدیت اور کاملیت کے جیتے جاگتے نمونے ہوں۔

اسلام نے اپنے انسانِ مطلوب کے لئے تعلیم کا جو ڈھانچہ تیار کیا ہے اُس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ وہ ایک خاص مزاج اور ایک خاص سیرت و کردار کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک مساجد و مکاتب سیرت سازی کی فیکٹریاں ہیں جہاں سے خاص قسم کے انسان ڈھل کے نکلتے ہیں۔ اسلام کا نظامِ تعلیم اسی ایک نکتے پر استوار ہے۔ اسلام جس قسم کا معاشرہ اور جس قسم کے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اُن کی تعلیم کے مقاصد کا تعین بھی اُس نے خود ہی کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم اسلام کے نزدیک بنیادی اہمیت کی چیز ہے۔ یہ تو انسان کو ظلمت سے نور کی طرف لے جانے والا عمل ہے۔ يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ کا مفہوم یہی ہے۔

اُستاد کا مقام

اسلام کے تعلیمی نظریات میں اُستاد کو اوّلین حیثیت دی گئی ہے۔ خدائے ربّ العزت نے اپنے آپ کو بھی معلّم کہہ کے پکارا ہے کہ: "خدا نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا"۔ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا کی آیۂ کریمہ خدا کی اس صفت کی علامت ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ "اے محمدؐ یقیناً تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو"۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ معلّمِ کامل تھے خود کو بہ حیثیتِ معلم بھی پیش کیا ہے اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ٥ اور پھر فرمایا فَتَجَلّٰى لِيْ كُلُّ شَيْءٍ فَعَرَفْتُ۔

اسے بھی حضورؐ کا معلّمانہ معجزہ جانیے کہ آپ کے زیرِ تربیت صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صورت میں ایک ایسی جماعت تیار ہو کر نکلی کہ بلا شائبہ ریب چشمِ فلک نے انسانوں کا ایک ایسا پاک نفس اور قدسی صفات گروہ آج تک نہیں دیکھا۔ حضورؐ کے فیضانِ سرمدی نے جو شاگرد تیار کئے اُس کے ثمرات زندگی کے ہر میدان میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

شبلی نے اسی لئے کہا تھا:

اُس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم — بن گئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار
یہ اُسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچّے — کھیلتے جاتے تھے ایواں گہِ کسریٰ میں شکار
یہ اُسی کا تھا نتیجہ کہ عرب کے رہزن — فاش کرنے لگے جبریلِ امیں کے اسرار

استاد کا مقام صرف علم کی ترسیل نہیں بلکہ قرآن حمید نے يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ کہہ کے اس کے مقدس ترین اور اہم ترین فریضے کی نشان دہی بھی کر دی ہے کہ استاد کا کام تربیت و تادیب بھی ہے جس کے بغیر تعلیم ایک میکانکی عمل رہ جاتا ہے۔ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ میں تعلیم و تدریس پر بہت زور ملتا ہے۔ ایک حدیث کی رُو سے، ایک ایسا عالم جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے اور یہ علم دوسروں تک پہنچاتا ہے قابلِ رشک مقام رکھتا ہے۔ اس معاملے میں حضورؐ کی حکمتِ بالغہ کی معراج دیکھئے کہ آپؐ نے بعض قیدیوں کے لئے زرِ فدیہ کے طور پر ٹھہرا دیا کہ وہ ناخواندہ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھائیں۔ حضورؐ نے دعوتِ حق کا کام بے غرض ہو کر سرانجام دیا۔ کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ تھا۔ صرف خدا کی مخلوق کی بہبود پیشِ نظر تھی۔ قرآن کریم میں یوں ذکر ہوا۔ قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ٥

اے نبیؐ کہہ دو کہ میں اس تبلیغ اور ہدایت کے کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں یہ تو ایک عام نعمت ہے تمام دُنیا والوں کے لیے۔

نصاب

تعلیمی فلسفے میں سب سے بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ مجوزہ نظام سے کس قسم کا ذہن پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر ملک و قوم کے حکماء نے اپنے عقاید اور احوال کو سامنے رکھ کر تعلیمی نصاب مدوّن کیے۔ اسلام میں چونکہ دین و دنیا کی تفریق نہیں اہل ایمان کی دُعا ہے جو ارشادِ الٰہی سے ثابت ہے "رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً"، لہٰذا مفکرینِ اسلام نے ایک ایسا نصاب مرتب کرنے کی کوشش کی جس کی تحصیل کے بعد انسان دین و دُنیا دونوں کی نعمتوں سے متمتع ہو سکے۔ اُس کی یہ دُنیا بھی سنورے اور عاقبت بھی۔

اپنے اپنے طور پر مختلف ممالک میں مفکرینِ اُمت نے قرآن و سُنّت کی روشنی میں تعلیم کا مقصد و منہاج طے کر کے تدوین کی کوشش کی۔ یہ پہلو مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ مسلم ماہرین میں غزالیؒ نے وجدان اور تعقل دونوں کو علم کا موضوع یا ذریعہ قرار دیا اور یہ کہا کہ علم کی غایت علم اعلا یا وجدانی علم کا حصول ہے۔ اُن کے نزدیک رضائے الٰہی علم کا سب سے بڑا ثمر ہے۔ باقی علوم ان کے نزدیک کسب و اکتساب ہیں۔ برصغیر ہندو پاکستان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دین و دُنیا دونوں کو زندگی کی کلیت کے لیئے لازمی قرار دیا۔ بغداد میں مسلمانوں کی تعلیم کا جو سب سے بڑا دبستان قائم ہوا اُس کی خصوصیت وہی زندگی کی ہمہ گیری دین و دنیا کی وحدت اور مادہ اور روح کا اشتراک تھی۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ اور حضرت امام غزالیؒ کی تلقینات سے ہم کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ آج ہمارا نظامِ تعلیم جس ابتری، پریشان حالی اور شکوک و شبہات کا شکار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نصاب مادہ و روح کے اشتراک اور دین و دُنیا کی وحدت سے محروم ہے۔ امام غزالیؒ نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ محمودہ اور مذمومہ۔ دوسری قسم کا علم عقاید میں اشتباہ پیدا کرتا ہے اور انسان سے عقیدے کی قوت اور زندگی کی حرارت چھین لیتا ہے۔ لیکن ایسا تو نہیں کہ ہمارا علم محمودہ کی بجائے مذمومہ کے حصار میں ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ تعلیم جو بھی ہو مفید ہے۔ اسلام نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ جناب رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے کہ "اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ عِلۡمٍ لَّا یَنۡفَعُ" - اے خدا مجھے بے نفع علم سے بچانا۔ گویا صحیح علم وہ ہے جو علم نافع ہو۔ ہمارے آج کے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے نصابات کو بے جہتی

اور غیر نافعیت سے بچائیں۔

قرآن نے سَنُرِیْهِمْ آیاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ فرما کر مطالعۂ فطرت پر بڑا زور دیا۔ ہمارے نصابِ تعلیم میں یہ مطالعہ انسانی زندگی میں خیر پیدا کرنے کے لئے استعمال ہونا چاہیے۔ نصاب میں پند و موعظت کے ساتھ ساتھ انکار اور بدعملی کے نتائج بھی واضح کئے جائیں۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے۔ الٓمّٓصٓ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْكَ فَلَا یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ۔

طریقِ تدریس

آج کے غلط تعلیمی نظریات نے استاد کو معلّم کے مقام سے گرا کر اُسے ایک اہل کار کی حیثیت دے دی ہے۔ وہ آج ایک اُدارہ، ایک انجمن، ایک ستارۂ نور نہیں محکمۂ تعلیم کا ایک تنخواہ دار ملازم ہے جو باقی ملازمین سرکار کی نسبت کسی فوقیت کا حامل نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ استاد کا طرزِ تدریس ایک مشینی عمل ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کے نتائج سے قوم اچھی طرح آگاہ ہے۔ نہ اُسے اپنے مشن سے محبت ہے اور نہ اُن مقاصد سے لگاؤ جن کے پیشِ نظر یہ فریضہ اُس کے سپرد کیا گیا ہے۔

اساتذہ کے لئے مسجدِ نبوی کے معلّمِ کامل کی حیاتِ مقدسہ بین بصیرت کے بے شمار پہلو ہیں جن کو سامنے رکھ کر استاد کی تربیت کی جا سکتی ہے اور جن پہلوؤں کو اپنا کر وہ اپنے مشن کی تکمیل کر سکتا ہے۔

حضورؐ کے طرزِ تعلیم میں نمایاں ترین عنصر شفقت و محبت کا ہے۔ حضورؐ سراپا رحمتِ عالم تھے۔ اُن کی محبت و رافت نے عرب کے گنوار اور ضدی بدوؤں کی دُنیا بدل کے رکھ دی۔ آپؐ کی تعلیم کی اثر انگیزی میں نمایاں پہلو آپؐ کی شفقت کا ہے۔ اُمِّ معبد نے حضورؐ کا حلیہ مبارک یوں بیان کیا۔ "بولتا تو معلوم ہوتا کہ اُس کی آواز گرد و پیش پہ چھا گئی ہے، گفتگو ایسی تھی جیسے زبان سے موتیوں کی لڑی سلسلہ وار نکلتی چلی آ رہی ہو۔ کلام شیریں اور واضح تھا۔ نہ کم گو تھا نہ زیادہ باتیں کرنے والا۔ دُور سے سنو تو اس کی آواز سب سے زیادہ بلند مگر خوش آہنگ محسوس ہوتی اور قریب سے سنو تو بہت شیریں اور لطیف معلوم ہوتی۔" ارشاد باری تھا: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ○ اُور اپنی نماز نہ بہت بلند آواز سے پڑھو اور نہ پست آواز سے بلکہ میانی اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔" اور اسی پہ حضورؐ عمل پیرا تھے۔

حضورؐ کا طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ ہر ہدایت کو تین بار دہراتے تھے۔ تاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

گفتگو نہایت شیریں اور دل آویز ہوتی تھی۔ باتیں آہستہ اور سادہ الفاظ میں فرماتے تھے جس سے مخاطب کا انشراحِ صدر ہو جاتا تھا۔ قرآنِ پاک میں یوں ذکر ہوا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران)

یعنی "یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو۔ ورنہ اگر تم درشت خُو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔"

اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح اور تفہیم مطالب کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ بیک وقت قرآن پاک کی دس آیتوں سے زیادہ نہیں بیان کیں۔ قرآن حمید نے جو مختلف مقامات پر بعض واقعات کو مختلف پیرایوں اور اسالیب میں دہرایا ہے اس سے بھی مراد یہ ہے کہ بات دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔ قرآن کی حکایات و تماثیل بھی اس باب میں رہنمائی کرتی ہیں۔ کہ بات کو دل و دماغ میں کیسے بٹھایا جائے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ٥ مولانا روم نے کیسے دلکش الفاظ میں قرآن پاک کی تلاوت کے فوائد بیان کیے ہیں:

چوں تو در قرآنِ حق بگریختی ‏ ‏ با روانِ انبیاء آمیختی
ہست قرآں حالہائے انبیاء ‏ ‏ ما بیانِ بحرِ پاک کبریا
ور بخوانی و نہ ٔ قرآں پذیر ‏ ‏ انبیاء و اولیا را دیدہ گیر
ور پذیرائی چو برخوانی قصص ‏ ‏ مرغِ جانت تنگ آید در قفص

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تدریس، تدریج اور عمل کا تھا۔ چنانچہ جب حضورؐ نے معاذؓ کو یمن کی طرف روانہ کیا تو آپؐ نے فرمایا:

تم اس قوم کے پاس جاتے ہو جو اہلِ کتاب ہیں اس لیے سب سے پہلی چیز جس کی طرف تم بلاؤ وہ یہ ہے کہ وہ لوگ خدا کو ایک سمجھیں۔ جب وہ لوگ اس کو مان لیں تو اُن کو بتلاؤ کہ اللہ نے اُن پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں۔ جب وہ لوگ نماز پڑھنے لگیں تو انھیں بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں زکوٰۃ فرض کی ہے۔ جو اُن کے مالداروں سے لی جائے گی اور اُن کے فقراء کو دی جائے گی۔ جب وہ لوگ اس کا اقرار کر لیں تو ان سے زکوٰۃ لے لو اور لوگوں کے عمدہ مالوں سے پرہیز کرو۔

طریق تدریس

حضورؐ کے طریق تدریس میں سوال و جواب کا طریقہ بھی شامل تھا۔ ایک دفعہ حضورؐ نے صحابہ سے پوچھا۔ یہ کون سا دن ہے؟ پھر آپؐ نے فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ صحابہؓ نے جواباً عرض کیا کہ آج قربانی کا دن ہے۔

حضورؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ یہ کونسا مہینہ ہے؟ کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا یہ مہینہ ذوالحجہ کا ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارے خون اور تمہارے مال آپس میں تمہارے لیے ایسے ہی حرام ہیں جیسے اس دن میں، تمہارے اس مہینے میں، تمہارے اس شہر میں حرام ہیں۔

اور تعلیم کو عوام تک پہنچانے کے لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

لِيُبَلِّغُ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

علم حاصل کرنے کے لیے قرآن کریم نے مشاہدہ، غور و فکر، عقل، تجربہ، ایمان، کشف والہام رویائے صادقہ اور یقین کے ذرائع بیان فرمائے ہیں۔

مشاہدۂ کائنات اور تحقیق و جستجو کے لیے بہت سے مقامات پہ ترغیب دی گئی ہے۔ ایک مقام پر سوال اُٹھا کر کہا جاتا ہے۔ کیا پرندوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ یہ پھیلائے اُڑتے پھرتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ۔

کسی جگہ پھلوں کو دیکھنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

اُنْظُرُوْا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ۔

پھر ارشاد ہوا۔ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ تم غور کرو اور دیکھو۔ کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں۔ کہیں آغازِ تخلیق کے متعلق سوال کیا گیا۔ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ۔ کہیں تدریجی عمل تخلیق کا ذکر ہوتا ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝

حضورؐ نے بھی اسلام کی دعوت دیتے وقت اسی تدریج کے قانون کو پیش نظر رکھا۔ نبوت کے پہلے تین سال تک خفیہ طریقے سے اسلام کی تعلیمات افراد کو پہنچاتے رہے۔ اڑھائی سال کے بعد حضورؐ نے دارارقم میں مرکز قائم فرمایا۔ اس کے بعد حسب ارشاد باری: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ حضورؐ نے اپنے خاندان والوں کو اسلام لانے کی دعوت دی۔ اس موقعہ پر حضورؐ نے ایک ایک کو اس کے نام سے

مخاطب فرمایا: "یا بنی عبدالمطلب، یا عباس، یا صفیہ"

اس کے بعد حضورؐ نے ایک دن صبح سویرے پہاڑی پہ چڑھ کر یا صباحاہ کہہ کر ایک ایک خاندان والوں کو پکارا۔ حضورؐ کا خطبہ بہت جامع اور مختصر ہوتا تھا۔ تبوک کے مقام پر آپؐ نے یوں ارشاد فرمایا:

فَاِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰهِ - صدق و راستی میں سب سے بڑھا ہوا مجموعۂ کلام اللہ کی کتاب ہے۔

وَاَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ۔

تمام بیانات سے پاکیزہ ترین اور خوب ترین بیان قرآن مجید ہے۔

وَخَیْرُ الْاَعْمَالِ مَا نَفَعَ - بہترین اعمال وہ ہیں جن سے انسان کو دینی، اخلاقی اور روحانی فائدہ ملے۔

آنحضرتؐ نے ہرقل قیصر روم کے نام جو دعوت نامہ بھیجا اس کے الفاظ بھی سادہ، جامع اور مختصر ہیں:

اِنِّیْ اَدْعُوْکَ بِدَعَایَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ۔

حضرات! آخر میں اتنا عرض کر دوں کہ ہمارے جملہ مسائل اور مشکلات کا حل صرف اور صرف عشقِ رسولؐ میں مضمر ہے۔ ہزاروں تعلیمی پالیسیاں بنائیے۔ اگر ان میں عشقِ رسولؐ کی جھلک نہیں تو یقین مانیے قطعاً بے مصرف و بے فائدہ ہیں۔ جب تک ہمارا نظامِ تعلیم حبِّ رسولؐ کے گرد نہیں گھومے گا وہ نتائج ہرگز ہرگز برآمد نہیں ہوں گے جن کے لئے قوم چشم براہ ہے۔ ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا ۔۔۔ تواں رفت جز در پئے مصطفٰےؐ!

نظامِ تعلیم و تربیت۔ اخلاقِ نبوی کی روشنی میں

جناب محترم ڈاکٹر معصوم علی ترمذیؒ

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سرچشمۂ رشد و ہدایت ہے۔ اس ذاتِ گرامی سے نور کی وہ کرنیں پھوٹی ہیں جن کی چمک دمک سے ساری دنیا میں اجالا ہو گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سرتاپا رحمت بھی تھے اور ہدایت بھی۔ تعلیم و تعلّم، صلاح و فلاح، ہدایت واستقامت کے جو دل نشیں انداز آپ کی ذاتِ والا صفات سے بروئے کار آئے انھوں نے عرب کے بادیہ نشینوں کو مملکتوں کا سلطان بنادیا۔ آج یہ میرا خوشگوار فرض ہے کہ اخلاقِ نبویؐ کی روشنی میں نظامِ تعلیم و تربیت کا جائزہ لوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کہاں اخلاقِ نبویؐ کا بحرِ بیکراں اور کہاں میری ناچیز فہم و دانش۔ بہرحال کوشش کر سکتا ہوں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ناچیز ہونے کے باوجود نسبت اسی ذاتِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں چند ضروری نکتوں کی وضاحت کردی جائے۔

کسی فرد یا جماعت کی فوز و فلاح کا انحصار اس کے حسنِ عمل اور خوبیٔ کردار پر ہے، اور حسنِ عمل یا خوبیٔ کردار موقوف ہے صحیح اور صالح تعلیم و تربیت پر۔ تعلیم و تربیت اگر صحیح ہے تو ایسی نسل پروان چڑھے گی جس کے کردار کی استقامت سے ٹکرانے والی ہر باطل قوت پاش پاش ہو کر رہ جائے گی۔ کیونکہ بقول شاعر:

دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

اور جب دل کی دنیا بدل جائے تو پھر خارجی دنیا بدلتے دیر نہیں لگتی۔ گویا قوموں کی حیات اور ان کی ساری صلاح و فلاح کا مدار صحیح تعلیم و تربیت پر ہے۔

تعلیم و تربیت کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر خالقِ کائنات نے تعلیم و تربیت کو رسول اللہؐ کا بنیادی فریضۂ نبوت قرار دیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان کیا جو ان میں رسول بھیجا انہی میں کا ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے۔ اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور

کام کی باتیں اور وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں تھے۔" (آلِ عمران)

اس آیتِ کریمہ میں بیان کردہ چاروں باتوں (تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفس، تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت) کا تعلق تعلیم و تربیت ہی کے اساسی پہلوؤں سے ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ عناصرِ اربعہ ہیں جن سے اسلامی نظامِ تعلیم یا نبیٔ کریمؐ کا اختیار کردہ نظامِ تعلیم و تربیت تشکیل پاتا ہے۔ گویا اسلامی نظامِ تعلیم کے بنیادی مقاصد یہ ہیں۔

۱ - نئی نسل کو ان کے خالق و مالک کے احکامات بعینہٖ ان الفاظ میں پہنچائے جائیں جن میں وہ نازل ہوئے ہیں۔

۲ - قرآن پاک کا وہ مفہوم و مطلب جو اللہ کے رسولؐ نے وحیٔ الٰہی کے تحت بتایا اُسے ذہن نشین کرایا جائے۔

۳ - نئی پود کو "حکمت و سنت" یعنی زندگی گزارنے کے نبویؐ اسلوب سے آگاہ کیا جائے جو زندگی کے چھوٹے بڑے تمام شعبوں پر حاوی ہو۔

۴ - قرآن و سنت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی اخلاقی اصلاح، اس کی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے اور افکار و خیالات کو پاکیزہ بنانے کے لیے علمی اور روحانی تربیت بھی کی جائے، نیز جو کچھ بھی وہ سیکھیں تربیت یافتہ افراد کی نگرانی میں اس پر عمل بھی کریں، تاکہ ان کی تعلیم صرف اعتقاد و نظریات تک ہی محدود نہ رہے بلکہ عملی صورت اختیار کر کے ان کی زندگی میں مثبت اور مفید تبدیلیاں پیدا کریں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مدبرانہ، حکیمانہ، مربیانہ اور مشفقانہ اسلوب اختیار فرمایا، جو بلاشبہ معلمین کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ معلمِ اعظم ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی قدر و قیمت بیان فرمائی تاکہ لوگوں میں تحصیلِ علم کی لگن پیدا ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ جس کی بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دینی بصیرت عطا فرماتے ہیں۔"

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ:

"جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے وہ اپنے گھر واپس آنے تک اللہ کی راہ میں رہتا ہے۔"

اصحابِ علم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا کہ:

"علم والے اور جاہل آپس میں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟"

چنانچہ حدیث میں علما کو انبیا کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ اور طالبین علم کے بارے میں فرمایا کہ اگر انھیں تحصیل علم میں موت آجائے تو وہ شہادت کا مرتبہ پائیں گے۔

تبلیغ و تعلیم کے ساتھ اصلاح معاشرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی فرائض میں شامل تھا۔ چنانچہ آپ قرآنی تعلیمات کو خصوصی انداز میں بیان فرماتے۔

اس سلسلے میں حضورؐ اجتماعات سے بھی خطاب فرماتے اور انفرادی طور پہ بھی دعوت دیتے تھے۔ بعض اوقات منتخب افراد کو جمع کر کے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی فرماتے، قرآن کریم کی عبارت پڑھتے پھر اس کی تشریح و توضیح فرماتے، صحابہ کرامؓ اکٹھے ہوتے اور مختلف امور پہ بحث و تمحیص کرتے اور اپنے پیغمبر سے رہنمائی حاصل کرتے۔ درس و تدریس کا سلسلہ ایک زمانے تک دار ارقم میں جاری رہا۔

پھر قریش مکہ نے جب آپؐ کو آپؐ کے رفقا کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور کر دیا تو وہیں پر یہ مجالس قائم ہونے لگیں۔ پھر ہجرت کے بعد حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان پہ اور پھر مسجد نبوی میں درس و تدریس ہونے لگی۔ بعد ازاں آپؐ نے ایک باضابطہ درس گاہ کی بنیاد ڈالی، اور خود معلم اول کی حیثیت سے وہاں تعلیم و تربیت فرمانے لگے۔ یہ درس گا "صفہ" کے نام سے مشہور ہے۔ صفہ عربی میں سائبان کو کہتے ہیں۔ یہ مسجد نبوی کے شمالی جانب ایک چبوترہ تھا جہاں وہ صحابہؓ قیام پذیر تھے جو علم دین سیکھنے کی غرض سے مختلف علاقوں سے آئے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً چار سو تک تھی، گویا وقتاً فوقتاً ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ حضرت بلال، حضرت صہیب رومی، حضرت عمار بن یاسر، حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما صفہ کی اسی مشہور درسگاہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں جو قرآن کی تعلیم زبانی حاصل کر لیتے وہ "قرا" کہلاتے تھے۔ اسلام کی دعوت عام کرنے کی غرض سے یہی لوگ بھیجے جاتے تھے۔ غزوہ احد کے بعد ۴ ھ میں بئر معونہ میں دعوتِ اسلام کی غرض سے بھیجے جانے والے جن ستر (۷۰) قرا کو شہید کر دیا گیا تھا وہ انہی میں سے تھے۔

تعلیم و تربیت کا ایک عام اور واضح اصول یہ ہے کہ حسب موقع نرمی اور سختی دونوں سے کام لیا جائے۔ نرمی کے موقع پہ نرمی اور سختی کے موقع پہ سختی۔ معلم و مربیٔ کامل ہونے کی حیثیت سے نبی کریمؐ نے سختی اور نرمی دونوں سے کام لیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر شریعت کی حد توڑنے پہ سزا دینا ضروری سمجھا۔ آپؐ حدود اللہ کے سلسلے میں کسی مصلحت کے روادار نہ تھے، البتہ عام معاملات میں نہایت نرمی، تحمل اور بردباری

سے کام لیتے تھے۔

حضور اکرمؐ کے طریقۂ تعلیم میں ایک اہم بات یہ تھی کہ موقع و محل کے مطابق نصیحت فرماتے اور مخاطب کے فہم و ادراک اور اس کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر بات کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں سے ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق بات کرو۔ چنانچہ حضور اکرمؐ ایک بدو اور ایک شہری یا سمجھ دار یا کم فہم سے گفتگو کرتے وقت مختلف انداز اختیار فرماتے تھے۔ نیز ہر شخص کے حالات کے مطابق اسے نصیحت فرماتے۔ چنانچہ ایک صحابی، حضرت جابرؓ کو پہلے نصیحت فرمائی کہ "غرور نہ کرو اور اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھو" اور پھر اس پر عمل کی تدابیر بتائیں۔ لیکن جب ایک اور شخص نے عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمایئے تو صرف اتنا ارشاد ہوا کہ "غصہ نہ کر" اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا مگر ہر دفعہ آپ نے یہی جواب دیا کہ "غصہ نہ کر"۔

معلمِ اعظم و اوّل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی نفسیات اور اس کی محدود صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ تعلیم و تربیت کے لیے ایسا طریقہ استعمال فرماتے جو گراں نہ گزرتا۔ بعض باتیں مثالوں اور تشبیہات سے سمجھاتے، کبھی توجہ اور انہماک پیدا کرنے کی غرض سے صحابۂ کرامؓ سے سوال کرتے اور پھر صحابہ کا اضطراب دیکھ کر خود ہی جواب دیتے، کبھی ان کے جواب میں ترمیم فرما دیتے۔ مثلاً ایک بار دریافت فرمایا کہ تم پہلوان کسے کہتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کیا جسے کشتی میں کوئی پچھاڑ نہ سکے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔

حضور اکرمؐ کے طریقۂ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ تعلیم و تعلم کو اس انداز سے جاری رکھتے کہ متعلمین ذرہ برابر اکتاہٹ محسوس نہ کرنے پائیں اور تدریس ان کے لیے فرحت و انبساط کا باعث بنے۔ اس لیے کہ جبر و اکراہ سے مفید نتائج ممکن نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تعلیم دینے میں دنوں کا وقفہ دیتے تاکہ ہم اکتا نہ جائیں۔ جہاں آپ تعلیم و تعلم کے دوران اصولِ تدریج کو پیشِ نظر رکھتے وہاں گفتگو میں عجلت سے کام نہ لیتے، آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے اور اصولِ اعادہ کے تحت دو دو تین تین بار دہراتے تاکہ متعلم کے ذہن نشین ہو جائے۔ حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ جب گفتگو فرماتے تھے تو درمیان میں وقفہ کرتے اور بات کو کھول کر بیان کرتے تاکہ سننے والا اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکے۔ آپ مشکل الفاظ استعمال کرنے سے گریز فرماتے تھے بلکہ آپ کا انداز انتہائی سادہ اور دلنشین ہوتا تھا۔ حضرت ابنِ عباسؓ رسول اللہؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

سکھاؤ، آسانی پیدا کرو، مشکل نہیں، اور جب کوئی غصے میں ہو تو اسے خاموش ہو جانا چاہیے۔"

آپؐ میں ایک بڑی خصوصیت تواضع اور انکساری تھی۔ آپؐ بڑے حلیم الطبع اور بُردبار تھے۔ بعض دیہاتی تو بڑے اکھڑپن سے پیش آتے اور درشتگی کا مظاہرہ کرتے۔ لیکن آپؐ نہایت تحمل سے انہیں مطمئن فرماتے۔ آپؐ کی حیثیت ایک متواضع برادر اور ایک رحیم و شفیق باپ کی تھی۔ آپؐ نے فرمایا میں تمہارے لیے تمہارے باپ کی مانند ہوں۔ گویا آپؐ بڑے خوشگوار ماحول اور نہایت دلنشین انداز سے تعلیم دیتے تھے۔

ایک اور چیز جو آپؐ کے طریقۂ تعلیم میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رزائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رزائل سے متنفر ہو جائے۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی مثال یوں بیان فرمائی:

"یہ نیکی ایک دانہ ہے جو زمین سے سات بالیں بن کر اگتا ہے اور ہر بالی میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں۔ اس طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔"

اس کے مقابلے میں نمائش کی نیکی کو بے نتیجہ قرار دیا گیا۔ کہا گیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسان اپنا بیج چٹان پر پھینک دے جس پر ذرا سی مٹی ہو، ذرا سی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہہ گئے۔ اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح یتیم کا مال کھانے والے کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ آپؐ کی سیرت اور عملی اسوہ میں ایسا زبردست اثر تھا جس نے بہت قلیل عرصے میں ایک درماندہ قوم کو دنیا کا ہادی اور رہنما بنا دیا۔ آپؐ کے اخلاق اور کردار ہی کے فیضان سے تقریباً سوا لاکھ صحابۂ کرامؓ کو وہ عظمت عطا ہوئی کہ دنیا کا بڑے سے بڑا آدمی ان کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی خدو خال اور رسول اللہؐ کے طریق تربیت پر غور کرنے سے یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہ سارا نظام اس نصب العین اور نظریۂ حیات کے گرد گھومتا ہے جسے اسلام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

دراصل نظریۂ تعلیم نظریۂ حیات ہی کا عکس ہوا کرتا ہے۔ تعلیم کا مقصد تعمیر سیرت و کردار ہے یا دوسرے لفظوں میں ایک انسان کو اس قابل بنانا ہے کہ اس کا اپنے نظریۂ حیات یا اس نصب العین

پر جسے اس نے قبول کیا ہے غیر متنزلزل یقین و ایمان پیدا ہو۔

بعض ماہرین تعلیم مغرب کی تقلید میں (بدقسمتی سے ہم جس کے عادی ہو چکے ہیں) فرماتے ہیں کہ مذہب سے تعلیم کو الگ رکھنا چاہیے۔ تعلیم کا مقصد حصول علم ہے، اسے بالکل غیر جانبدارانہ ہونا چاہیے تاکہ ایک شخص اس علم کی روشنی میں آزادانہ طور پر مسائل و معاملاتِ زندگی کو پرکھے اور نتائج اخذ کرے۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو اہلِ مغرب کی اس کارروائی کی وجہ ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ اہلِ مغرب نے اگر تعلیم کو مذہب سے الگ کر دیا ہے تو اُن کے لیے یہ ضروری تھا۔ اس لیے کہ جب مذہب ان کے تصورِ حیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کے نظامِ تعلیم کا جزو قرار پائے۔ مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کے بعد مغربی اقوام کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اسے تعلیم یا کسی اور شعبۂ حیات میں ساتھ رکھتے۔

مذہب اور تعلیم کا افتراق، مذہب اور سیاست کے افتراق کا لازمی نتیجہ ہے اور مذہب کو سیاست سے الگ کرنے پر وہ اس لیے مجبور ہوئے کہ ان کا مذہب ان منظم جماعتوں کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر تھا جنہیں ریاستیں کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے مذہب کو سیاست سے مجبوراً اس وقت الگ کیا کہ جب کلیسا اور ریاست کے طویل جھگڑوں نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی کہ دونوں کا یکجا رکھنا بے سود بلکہ ناممکن ہے۔

بعض اوقات یورپ میں کلیسا اور ریاست کی جدائی کو میکاولی فلسفہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس نے حکمرانوں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ اگر ریاست کے اندرونی اور بیرونی انتظام کے لیے ضروری ہو تو وہ ہر قسم کی مذہبی اور اخلاقی قیود کو توڑ کر جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت یورپ میں میکاولی فلسفہ کا ظہور ہی اس وقت ہوا کہ جب یورپ کی اقوام اسے قبول کرنے کے لیے پہلے ہی پوری طرح سے آمادہ ہو چکی تھیں۔

اس کے برعکس زندگی کا وہ تصور جو ہمیں اسلام نے دیا ہے عیسائیت کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ سیاست اس سے نہ صرف مطابقت رکھتی ہے بلکہ وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتی بقول اقبال:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم تعلیم کے بارے میں وہی نقطۂ نظر اختیار کریں جو یورپی اقوام کو عیسائیت کے نقائص کی بنا پر اختیار کرنا پڑا۔ مغرب کے ماہرینِ تعلیم کے لئے مذہب اور تعلیم کو باہم رکھنا ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسا کہ ہمارے لئے مذہب اور تعلیم کو جدا رکھنا۔

اگر ہم رائج الوقت دیگر نظریاتِ حیات مثلاً اشتراکیت، جمہوریت، قومیت وغیرہ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ایک قوم کا نصب العین اور تصورِ حیات اس کی زندگی کے تمام

شعبوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس کا نظامِ قانون، نظامِ سیاست، نظامِ تعلیم، نظامِ معاشیات، غرض کہ اس کی زندگی کے تمام اعمال اس کے ماتحت تشکیل پاتے ہیں اور وہ ان کی خدمت کے لیے وجود میں آئے ہیں اور ہر آن اس کی خدمت کے لیے وقف رہتے ہیں۔

ہمیں اگر بحیثیت مسلمان جینا ہے تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راہ مستقیم نہیں کہ ہم اس نظامِ تعلیم و تربیت کو اپنائیں جو ہمارے نصب العین کا محافظ ہو، کیونکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کا نظامِ تعلیم اس کے نصب العین سے ہم آہنگ نہ ہو۔

ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں جو انحطاط کا عمل جاری ہے وہ غلط تربیت کی بنا پر اپنے نصب العین سے دُوری کے باعث ہے۔ نصب العین سے دُوری تعلیم و تربیت میں کاروباری ذہنیت پیدا کر دیتی ہے، اور جب کوئی چیز کاروباری سطح پر آجائے تو اس میں کسی بلند مقصد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کاروباری آدمی کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے اور کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ وہی مال منڈی میں لائے گا جس کے زیادہ خریدار ہوں۔ شکایت کی جاتی ہے کہ نئی نسل بے راہروی کا شکار ہے، اس میں احترام و تعظیم کے جذبات مفقود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے یہ سیکھا ہی کب ہے۔ کیا نئی نسل کی تربیت ان خطوط پر ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں یہ عنصر پیدا ہو؟ احترام کا موجب وہ تعلیم بنتی ہے جو ذہنوں میں جلا، قلوب میں پاکیزگی، فکر میں بلندی، معاشرے میں ہمدردی، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حسنِ توازن اور انسانیت میں ارتقا اور نصب العین سے قربت پیدا کرے۔ احترام و تعظیم پیدا ہوتے ہیں عظمت کے احساس سے۔ آپ ان کی تربیت ان خطوط پر کیجیے جس سے وہ اپنے نصب العین کے سچے عاشق بن جائیں۔ جب اپنے نصب العین کی عظمت ان کے سامنے بے نقاب ہو گی تو ان کی نگاہِ عقیدت خود بخود اس کی بارگاہ میں جھک جائے گی۔ احترام نام ہے اعترافِ عظمت کا۔ عظمت ہو گی تو احترام خود بخود پیدا ہو گا۔ حقیقت خود کو منواتی ہے منوائی نہیں جاتی۔ ان کے سامنے ایسے افراد پیش کیجیے جو اسلامی سیرت کے پیکر ہوں اور جن کی زندگیاں ان کے اپنے نصب العین کی عملی تصویریں ہوں تو پھر دیکھیے یہی نوجوان مجسّم تنظیم بنتے ہیں یا نہیں اور اس سلسلے میں کامل ترین اور روشن ترین مثال یعنی نبی کریمؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ دعوئِ نبوت کے بعد قریش نے کیا کچھ نہیں کہا مگر کسی نے یہ جرأت نہیں کی کہ آپؐ کے اخلاق و اعمال کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکے۔ جہاں دوستوں کی نگاہوں کے سجدے آپؐ کے لیے وقف تھے وہاں آپؐ کے کٹر مخالفین کے پُرغرور سر بھی آپ کی بلند کرداری کے سامنے خم تھے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچے کی تعلیم اس وقت شروع ہوتی ہے کہ جب وہ مکتب یا اسکول جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب بچہ اسکول جانے کے قابل ہوتا ہے اس وقت تک وہ بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق تین چار سال کی عمر میں بچہ جو کچھ سیکھتا ہے اس کا اثر تمام زندگی رہتا ہے۔ ظاہر ہے اس عمر میں بچہ گھر ہی میں رہتا ہے، بلکہ زیادہ تر ماں کی گود میں۔ گویا تربیت کی ابتدا ماں کی گود سے ہوتی ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اولین مکتب ماں کی گود ہے۔ لہٰذا ماں کی یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ساری توجہ بچوں کی صحیح تربیت پر مرکوز رکھے۔ تاکہ اس کی جملہ صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو۔

اولاد کی پرورش اور اس کی تربیت کا ماں کے ساتھ ساتھ باپ بھی پوری طرح ذمہ دار ہے۔ اسلام مرد عورت دونوں کو اولاد کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ آج کے والدین اپنی معاشی و دیگر مصروفیات کی بنا پر اپنے بچوں کی تربیت پر برائے نام ہی وقت دے پاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پہلے معلم یا مربی بجائے ان کے والدین کے ٹی۔ وی، ریڈیو، گھر کے ملازم یا پھر ان کے پڑوسی اور ان کے ارد گرد پھیلا ہوا غیر اسلامی معاشرہ ٹھہرتے ہیں۔ اس طرح کی تربیت پائے ہوئے بچے بڑے ہو کر پہلے اپنے لیے اور پھر پورے معاشرے کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ اسکول، کالج یا یونی ورسٹی ان بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت دے سکیں گے لیکن یہ امید ایک امیدِ موہوم ہی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اسکول اور کالج کا مقصد تو یہ ہے کہ یہاں اس تعلیم و تربیت کا نشو و نما کیا جائے جو بچہ ابتداءً اپنے گھر سے لے کر آیا ہے یا پھر اس کی تربیت میں جو کمی رہ گئی ہے اسے پورا کر کے اس کی سیرت سازی کی جائے۔ لیکن جب بچہ سرے سے ہی اس صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رکھا گیا ہو جو اسے اپنے والدین سے ملنی چاہیے تھی تو پھر دوسروں سے اس کی اصلاح کی توقع رکھنا بے سود ہے۔

بچہ تو دراصل ایک سیدھی اور نرم و نازک شاخ کی مانند ہوتا ہے۔ یہ اس کے والدین یا اس کے سرپرست ہوتے ہیں جو اپنی صحیح یا غلط تربیت سے اسے جدھر چاہتے ہیں موڑ لیتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ:

"ہر بچہ اسلامی فطرت پہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا

مجوسی بنا لیتے ہیں"۔ اس حقیقت کو آشکارا کرتا ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب پہلے تعلیم و تربیت کے سلسلے میں حضور اکرم ؐ کا اسوہ معلوم کریں اور پھر ان کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اپنے بچوں کی تربیت کریں جس کی ابتدا والدین و سرپرست اپنے گھر سے کریں اور پھر مکتب و مدرسہ کے مدرسین اور اسکول و کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ انہیں اسلامی اقدار سے روشناس کراتے ہوئے اچھا شہری بنانے میں اپنے اپنے فرائض پورے کریں۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو ہم ایک ایسی نسل تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو اسوۂ رسول پر عمل پیرا اور اخلاق نبوی کو اپنانے والی ہو۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے اور ہمیں اس سلسلے میں دُنیا کی دوسری تمام اقوام سے امتیاز حاصل ہے کہ ہمارے پاس تعلیم و تربیت، اخلاقیات، نصب العین کی بلندی اور پاکیزگی کا مؤثر ترین نمونہ موجود ہے۔ جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ دراصل ہماری ساری محرومی کا سبب یہ کوتاہی اور فردگزاشت ہے کہ ہم نے تعلیماتِ نبوی سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا اور مغرب کی پُر فریب حکمتِ عملی اور لادینی نظامِ تعلیم کا شکار ہو گئے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں کو جس لمحہ نیک نیتی سے اختیار کر لیا گیا اور اس نظامِ تعلیم پر عمل شروع ہو گیا تو پھر کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں رہے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں۔

سیرت محمدیہ کا معاشی پہلو

جناب محترم مولانا محمد طاسین

میرے مقالے کا موضوع ہے: سیرتِ محمدیہؐ کا معاشی پہلو، اور مجھے اس مقالے میں موضوع کے نظری اور عملی دونوں رُخوں پر کچھ روشنی ڈالنا ہے، یعنی یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ سیدُالانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے علمی و نظری طور پر جو معاشی تعلیمات و ہدایات پیش فرمائیں وہ کیا ہیں؟ اور اُن پر عمل کرنے اور اُن کی تطبیق سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں جو معاشی مظاہر جلوہ گر اور جو عملی اوضاع و اطوار ظہور پذیر ہوتے وہ کیا ہیں؟ اور ظاہر ہے کہ اس مختصر مقالے میں اُن کو پوری تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ اجمال و اختصار کے ساتھ ہی پیش کیا کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر چوں کہ سیرتِ محمدیہؐ کے اصل ماخذ قرآن و حدیث ہیں لہٰذا میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ بھی عرض کروں قرآن و حدیث سے ہو۔

(۱) اور چوں کہ معاشیات کا تعلق رزق و مال سے ہے، لہٰذا سب سے پہلے میں اُس رویّے اور طرزِ فکر کے متعلق کچھ عرض کروں گا جو رزق و مال کے بارے میں قرآن و حدیث سے سمجھ میں آتا ہے، بالفاظِ دیگر اُس حیثیت و پوزیشن کو واضح کروں گا جو رزق و مال کی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی نظر میں ہے کیوں کہ اسے سمجھ لینے کے بعد اسلام کی معاشی تعلیمات کا سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے اور اُن پر عمل کرنا بھی آسان، اس لحاظ سے مال کے بارے میں اسلام کے رویّے کے تعین کا مسئلہ ایک بڑا اہم اور ضروری مسئلہ ہے۔

اس مسئلے کے بارے میں قرآنِ حکیم اور احادیثِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعے سے جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ مال کے متعلق جو اسلام کا رویّہ ہے وہ نہ محض محبت کا رویّہ ہے اور نہ محض نفرت کا رویّہ بلکہ اُن دونوں کے بین بین ایسا رویّہ ہے جسے محبت آمیز نفرت یا نفرت آمیز محبت کا رویّہ کہہ سکتے ہیں، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

محض محبت کا رویّہ اس لیے نہیں کہ اس سے انسان کے اندر مال کی بے پناہ حرص پیدا ہوتی اور وہ حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر اندھا دھند اُس کے حصول کے پیچھے پڑ جاتا اور اُسے سمیٹ سمیٹ کر جمع

رکھتا ہے، ضروری مصارف میں خرچ کرنے سے گریز کرتا اور حق تلفیوں کا مرتکب بنتا اور آخرت سے غافل اور بے پرواہ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا قرآن وحدیث کی رو سے محض محبت کا رویہ غلط و باطل اور منشائے اسلام کے خلاف ہے۔ اور محض نفرت کا رویہ اس لیے نہیں کہ یہ انسان کو ترکِ دنیا اور رہبانیت و جوگیت کی طرف لے جاتا اور بعض ضروری فرائض و واجبات سے لاتعلق و بے پرواہ بنا دیتا ہے جو مختلف حیثیات سے اُس کے ذمّے عائد ہوتے اور جن کی ادائی پر معاشرے کے قیام دبقا اور اجتماعی امن و اطمینان کا دار و مدار ہوتا ہے اور یہ چیزیں چُوں کہ اسلام کے منشا کے خلاف ہیں لہٰذا نفرت کا رویہ بھی اسلام کے نزدیک باطل اور مرْدود رویہ ہے، بالفاظِ دیگر مال کے متعلق محبت کا رویہ چُوں کہ افراط پر اور نفرت کا رویہ تفریط پر مبنی ہے اور اسلام چُوں کہ توسط و اعتدال کا دین ہے لہٰذا اس کے نزدیک افراط و تفریط پر مبنی محبت اور نفرت کے دونوں رویے غلط ہیں اور صحیح رویہ صرف وہ ہے جو ان دونوں کے درمیان اور وسط میں ہے اور وہ یہ کہ مال فی نفسہٖ نہ محبّت کے قابل ہے اور نہ نفرت کے قابل بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جس میں ذریعۂ خیر بننے کی بھی صلاحیت ہے اور ذریعۂ شر بننے کی بھی صلاحیت؛ اس سے انسان کو نفع بھی پہنچ سکتا ہے اور ضرر بھی پہنچ سکتا ہے لہٰذا ذریعۂ خیر بن سکنے کی وجہ سے محبت کے قابل اور ذریعۂ شر بن سکنے کی وجہ سے نفرت کے قابل ہے اور چُوں کہ یہ دونوں صلاحیتیں اُس کے اندر ہر وقت موجود رہتی ہیں لہٰذا وہ بیک وقت محبت اور نفرت دونوں کے قابل ہوتا ہے۔ بنابریں اس کے متعلق اسلام کا رویہ محبت کے ساتھ نفرت اور نفرت کے ساتھ محبت کا رویہ ہے۔

اس کا ثبوت یہ کہ قرآن وحدیث میں ایک طرف وہ نصوص ہیں جن میں مال کو خیر، فضل اور قیٰماً لِلنَّاس سے تعبیر فرمایا گیا ہے، کیوں کہ اس کے ذریعے سے انسان کے بہت سے طبعی، جبلّی معاشرتی، تمدّنی اور اخلاقی تقاضے پُورے ہوتے اور بہت سے دینی مقاصد بروئے کار آتے ہیں اور انسان کو سکون و اطمینان ملتا ہے۔ نیز وہ نصوص ہیں جن میں جائز طریقوں سے مال حاصل کرنے کی ترغیب اور اُس کے لیے صحیح نیّت سے جدوجہد کو جہاد فی سبیل اللّٰہ جیسا نیک عمل اور ذریعہ مغفرت اور رضائے الٰہی بتلایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی نصوص سے مال کے متعلق محض نفرت کے رویّے کی نفی ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف وہ نصوص بھی ہیں جن میں ایسے حرام مال کی مذمت اور بُرائی ہے جو باطل و ناجائز طریقوں جیسے ربٰو، میسر و قمار، رشوت، چوری، خیانت اور دھوکہ دہی وغیرہ سے حاصل کیا گیا ہو یا تکاثر و تفاخر کی نیّت سے کمایا گیا ہو یا بُخل کی وجہ سے ذخیرہ و خزانہ بنا کر رکھا گیا ہو، اور ایسے مال کو اللّٰہ کی ناراضی اور دنیا و آخرت کی بربادی کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، سو ظاہر ہے کہ ایسی نصوص سے مال کی محبّت کے رویّے کی صاف نفی ہوتی ہے۔

مال کے بارے میں اسلام کا جو رویّہ اور عندیہ ہے اُس پر کچھ روشنی قرآنِ مجید کی اُن آیات سے بھی پڑتی ہے جن میں مال کو انسان کے لیے فتنہ بتلایا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ الانفال کی یہ آیت:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۝

"اور خوب جان لو کہ تمھارے اموال اور تمھاری اولاد فتنہ ہیں یعنی سخت آزمائش و ابتلا۔"

امام راغب نے المفردات میں لکھا ہے کہ فتن کے اصل معنیٰ ہیں کھرا کھوٹا معلوم کرنے کے لیے سونے وغیرہ کو آگ کی بھٹی میں ڈالنا۔ اسی لحاظ سے فتنہ کے معنیٰ آزمائش و امتحان کے لیے گئے ہیں، کیوں کہ اس میں بھی انسان کی کام یابی و ناکامی کا اظہار ہوتا ہے، لہٰذا مال کو فتنہ، آزمائش اور امتحان کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ مال انسان کے لیے بہ منزلہ آگ کی بھٹی اور امتحان کے پرچے کے ہے جس سے انسان کا کھرا کھوٹا اور کام یاب و ناکام ہونا ظاہر ہوتا ہے، چناں چہ جو شخص مال کو جائز و حلال طریقوں سے کماتا اور جائز طور پر صحیح مصارف میں خرچ کرتا ہے وہ فائز و کام یاب ہوتا ہے، اور جو مال کو ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل کرتا اور مصارف خیر میں خرچ کرنے کے بجائے اُسے جمع رکھتا یا غلط و ناجائز مصارف میں خرچ کرتا ہے وہ عند اللہ ناکام و نامراد رہتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کو پرکھنے کا معیار اور امتحان کا پرچہ بجائے خود نہ کوئی اچھی اور قابلِ رغبت چیز ہے اور نہ بُری اور قابلِ نفرت چیز بلکہ اس لحاظ سے اچھی چیز ہے کہ اس سے کھرے اور کام یاب ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے بُری چیز ہے کہ اس کے ذریعے سے کھوٹے اور فیل و ناکام ہونے کا انکشاف ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی حال مال کا بھی ہے، انسان کی کام یابی کا ذریعہ بننے کی وجہ سے اچھا اور ناکامی و نامرادی کا ذریعہ بننے کی وجہ سے بُرا ہے۔

مال کی اسلام کی نظر میں جو حیثیت ہے اُس پر کچھ اُن آیات و احادیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ مال کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و منزلت نہیں، اگر ہوتی تو اللہ کافروں کو ہرگز نہ دیتا اور ہر نبی و ولی اور نیک بندہ مال دار ہوتا، اور یہ کہ مال کا ہونا نہ انسان کے لیے وجہِ شرافت و فضیلت ہے اور نہ نہ ہونا انسان کے لیے سببِ رزالت و حقارت ہے بلکہ شرف و فضیلت کا واحد سبب تقویٰ اور صرف تقویٰ ہے اور رزالت و حقارت کا واحد سبب کفر و شرک اور فسق و فجور ہے، چناں چہ اگر دو مسلمان ایمان و تقویٰ میں برابر ہیں تو اللہ کے ہاں اُن کا درجہ برابر ہے اُن میں سے ایک کا غنی و مال دار اور دوسرے کا مسکین و نادار ہونا اُن کے درجے میں کمی بیشی کا باعث نہیں بن سکتا۔ قرآنِ مجید میں سورۃ السبا کی آیت ہے:

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

"اور نہ تمھارے اموال اور نہ تمھاری اولاد وہ چیز ہے جو تمھیں ہمارے قریب کرے اور تمھارے لیے تقربِ الٰہی کا ذریعہ بنے، مگر وہ جو ایمان اور عملِ صالح کیے۔"

جامع ترمذی اور سنن ابنِ ماجہ میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیثِ نبوی ؐ کا ترجمہ یہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافروں کو اُس میں سے ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا۔

مسند احمد وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے مروی ایک اور حدیثِ نبوی ؐ کا ترجمہ اس طرح ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مُردار بکری کے پاس سے گزرے جسے اُس کے مالکوں نے باہر پھینک دیا تھا تو آپ ؐ نے ساتھیوں سے مخاطب ہوکر فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ دنیا کا مال اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ گھٹیا اور بے وقعت چیز ہے جتنی یہ مُردار بکری اپنے مالکوں کی نظر میں ہے۔ ان احادیث سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں دنیوی مال و دولت کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ لہٰذا اس کی بنا پر ایک انسان کو دوسرے سے بہتر اور افضل سمجھنا غلطی اور گمراہی ہے جس سے مسلمان کو بچنا چاہیے، حال آں کہ عام طور پر مسلمان اس میں مبتلا ہیں۔

اسلام کی نظر میں دنیوی مال و دولت کی جو حیثیت ہے اس پر میں نے سب سے پہلے اور قدرے تفصیل کے ساتھ گفت گو اس لیے کی ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ آج عام طور پر ہم مسلمانوں کی یہ جو حالت ہے کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کیے بغیر کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال و دولت سمیٹنے اور مال داری میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی حرص میں مدہوش ہیں، دیکھا جائے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے مال و دولت کو اصل مقصود بالذات اور ذریعہ شرف و عظمت سمجھ رکھا ہے اور اُس کے متعلق رویّہ اور طرزِ فکر قطعی محبّت کا رویّہ اور طرزِ فکر ہے جو اسلام اور منشائے خدا و رسول ؐ کے خلاف ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ مسلمان کو یہ بتایا جائے کہ بہ حیثیت ایک مسلمان کے مال و دولت کے بارے میں اس کا رویّہ اور طرزِ فکر کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے۔

سیرتِ محمدیہ ؐ کے معاشی پہلو کی وضاحت میں ایک بات جو آغاز میں عرض کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ قرآن و حدیث میں معاشی زندگی سے متعلق جو تعلیمات ہیں وہ دو قسم کی ہیں: ایک وہ جن کی بنیاد عدل اور دوسری وہ جن کی بنیاد احسان ہے۔ جو عدل پر مبنی ہیں اُن کے اندر اس چیز کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہر فرد اور ہر فریقِ معاملہ کو اُس کا واجبی حق پُورا پُورا اور ٹھیک ملے

اور کسی کی کچھ بھی حق تلفی نہ ہو۔ لہٰذا ان تعلیمات کی حیثیت حقیقی اور مستقل قوانین کی ہے جن پر عمل کرنا ضروری اور جن کے نفاذ اور تحفّظ کی ذمّہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اور جو تعلیمات احسان پر مبنی ہیں اُن کے اندر اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ افراد رضاکارانہ طور پر اپنے حقوق کا ایک دوسرے کے لیے ایثار کریں۔ لہٰذا یہ تعلیمات اخلاقی نوعیّت کی ہیں جن پر عمل کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ البتہ ان پر عمل کرنے کا عنداللہ جو درجہ اور جو اجر و ثواب ہے وہ اُس درجے اور اجر و ثواب سے کہیں اونچا اور زیادہ ہے جو عدل والی قانونی تعلیمات پر عمل کرنے کا ہے۔ مصلحِ اعظم، ہادیِ برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اختیار دیا کہ وہ ان دو قسم کی تعلیمات میں سے جن پر چاہیں عمل کریں۔ لیکن اپنے عمل کے لیے آپؐ نے صرف احسان والی اخلاقی معاشی تعلیمات اختیار فرمائیں اور ہمیشہ اُن پر قائم اور عمل پیرا رہے یعنی ہمیشہ اپنے حق کا دوسرے کے لیے ایثار فرمایا، کیوں کہ آیتِ قرآنی "اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" کے مطابق آپؐ اخلاقی عظمت کے بلند ترین درجے پر فائز تھے۔ لہٰذا یہ سمجھنا دُرست نہیں کہ اسلام کی معاشی تعلیمات صرف وہ ہیں جو محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی معاشی زندگی میں عملی طور پر جلوہ گر ہوئیں اور صحابہ کرامؓ کی آنکھوں نے اُن کا مشاہدہ کیا، کیوں کہ ان کے علاوہ وہ بھی اسلام کی معاشی تعلیمات ہیں جو عدل پر مبنی اور آپؐ کے اقوال و ارشادات سے سامنے آئیں اور صحابہ کرامؓ نے کانوں سے سُنیں اور جو آج قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور عام انسانوں کے لیے وُہی قابلِ عمل بھی ہیں، کیوں کہ اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہر شخص کے بس میں نہیں، بتائیے دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو خود بھُوکے رہ کر دوسروں کو کھلا سکتے ہوں؟

(۲) اب میں اسلام کی کچھ وہ معاشی تعلیمات پیش کرنا چاہتا ہوں جن کا قرآن و حدیث میں اجمال و تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور جن سے سیرتِ مقدسہ کے معاشی پہلو کے کچھ خدوخال نمایاں اور اُجاگر ہوتے ہیں۔

قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک اہم اور بنیادی تعلیم یہ ہے: ہر مسلمان پر جو معاش کے سلسلے میں کوئی مفید کام کر سکتا ہو، لازم ہے کہ ضرور کام کرے۔ اِلّا یہ کہ کوئی عذر مانع ہو۔ ضرور کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ قرآن و حدیث میں یہ تعلیم جس اسلوب سے ہے وہ نُدب پر نہیں وُجُوب پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے لیے قرآنِ مجید میں جو امر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اُن کا وُجُوب کے لیے متعیّن ہونا احادیث نے ثابت کر دیا ہے۔ ایک حدیثِ نبویؐ جس کے راوی حضرت عبداللہؓ بن مسعود ہیں کے الفاظ ہیں: "قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم طلب الحلال فریضة بعد الفریضة"۔ دوسری حدیث جو حضرت انسؓ سے مروی ہے اس طرح ہے:

" قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم طلب الحلال واجب علی کل مسلم " ان احادیث میں فریضہ اور واجب کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ حلال رزق ومال کے لیے جدوجہد اور سعی وکوشش کرنا مسلمان کا دینی فریضہ اور ایک واجب وضروری عمل ہے۔ اور یہ اس وجہ سے بھی کہ رزق ومال پر فرد اور معاشرے دونوں کی حیات وبقا اور فلاح وبہبود تیز بہت سے دینی اور معاشرتی فرائض وواجبات کی ادائی کا دار ومدار ہے۔ گویا نقلی اور عقلی کئی ایسے دلائل ہیں جن سے معاشی جدوجہد کا واجب اور ضروری ہونا ثابت ہوتا ہے، بعض احادیث میں اس کو جہاد جیسا نیک عمل فرمایا گیا ہے جس پر عظیم اجروثواب کا وعدہ ہے۔ بعض احادیث میں یہ فرما کر اس کی طرف رغبت دلائی گئی ہے کہ یہ اللّٰہ کی محبّت اور مغفرت کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

معاشی جدوجہد سے متعلق اسلام کی یہ جو تعلیم ہے اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے کسی ہوش مند کو انکار نہیں ہوسکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اس پر عمل کرے یا نہ کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، افسوس کہ آج مسلمان معاشرے اس پر عمل کرنے کے معاملے میں سب سے پیچھے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اپنی بنیادی ضروریات تک میں خود کفیل نہیں اور دوسروں کے دست نگر ہیں۔

بہرحال جہاں تک سیّد الانبیا حضرت محمّد مصطفیٰ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کا تعلّق ہے وہ اس تعلیم پر پُوری طرح عمل پیرا رہے۔ حدیث وسیرت کی کتابوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللّٰہ علیہ وسلم معاش کے سلسلے میں بہ نفسِ نفیس تجارت بھی کرتے رہے جو قریش مکّہ کا خاص پیشہ اور مشغلہ تھا اور بعض دفعہ اُجرت پر بکریاں بھی چرائیں، اسی طرح گھریلو معاشیات میں بھی آپؐ برابر روزمرّہ کے معاشی کاموں میں حصّہ لیتے رہے اور یہ سلسلہ پُوری زندگی میں جاری اور قائم رہا۔ فرائضِ نبوت کی ادائی کے ساتھ آپؐ کو جب بھی موقع ملا کسبِ معاش کے لیے آپؐ نے ضرور کوئی کام کیا۔ پھر یہی حال صحابہ کرام رضی اللّٰہ عنہم کا تھا۔ اپنی معاش کا بوجھ خود اُٹھانے کے لیے ہر صحابی کوئی نہ کوئی کام کرتا تھا۔ کوئی تجارت، کوئی زراعت، کوئی صنعت وحرفت اور کوئی محنت ومزدوری کا کام انجام دیتا تھا۔

قرآن وحدیث میں دوسری معاشی تعلیم اُجرت پر کام کرنے کرانے سے متعلق ہے۔ اُجرت پر کام کرنے کرانے کو اصولی طور پر درست وجائز قرار دیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید کی متعدد آیات سے اِس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ پھر اس بارے میں رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی جو احادیثِ مبارکہ ہیں اُن کے اندر مستاجر اور اجیر کے لیے واضح ہدایات بھی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مستاجر پر لازم ہے کہ (۱) وہ اجیر سے اتنا ہی کام لے جتنا وہ آسانی کے ساتھ کرسکتا ہو۔ (۲) اور یہ کہ کام پر لگانے سے پہلے

واضح طور پر اجیر کو بتادے کہ اُس کی اُجرت کتنی ہوگی۔ (۳) اور یہ کہ کام ختم ہوتے پر فوراً اجیر کو اس کی اجرت ادا کر دے۔ (۴) اور یہ کہ اُجرت مقرر کرتے میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ اُس سے اجیر کی بنیادی معاشی ضروریات کسی نہ کسی طور پوری ہو سکتی ہوں۔ (۵) اور یہ کہ اُجرت کے تعیین میں کام کی نوعیت اور مقدار کا لحاظ رکھا جائے، جو کام نوعیت کے لحاظ سے ادنیٰ و معمولی درجے کا ہو اُس کی اُجرت کم، جو متوسط درجے کا ہو اُس کی اُجرت زیادہ اور جو اعلا درجے کا ہو اُس کی اُجرت اس سے بھی زیادہ لگائی جائے۔ مطلب یہ کہ اسلام اس کو اصولی طور پر تسلیم کرتا ہے کہ افادیت کے لحاظ سے اور اُس فنی مہارت کے لحاظ سے جو کام کرنے والے نے حاصل کی نیز اُس انرجی و توانائی کے لحاظ سے جو کام میں کام کرتے والے کی خرچ ہوئی، کاموں کے مختلف درجے ہیں لہٰذا ان کے مطابق اُن کی اجرتیں مختلف و متفاوت ہونی چاہییں۔ اسی طرح کام کی مقدار کے لحاظ سے بھی اُجرت میں کمی بیشی کا فرق ہونا چاہیے۔ مثلاً ایک ہی نوعیت کا کام جب چار گھنٹے ہو تو اُس کی جتنی اُجرت ہو آٹھ گھنٹے کے کام کی اُس سے دوگنی ہونی چاہیے۔ قرآنِ حکیم میں ہے: "لِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا" سب کے لیے مختلف درجے ہیں اُن کے عمل کے اعتبار سے۔ دراصل یہ ایسا اصول ہے جو انسانوں کو بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ کام یا محنت کرنے پر اُبھارتا ہے اور اس سے مُلکی پیداوار میں روزافزوں اضافہ ہوتا اور معاشی خوش حالی بڑھتی ہے۔ (۶) مستاجر پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اجیر کو کام کے اوقات میں دینی فرائض کی ادائی مثلاً نماز، روزے سے نہ روکے، اسی طرح کھاتے پینے کے اوقات میں کھانے پینے اور شدید تکان کی صورت میں قدرے آرام کا موقع دے۔ (۷) اسی طرح اجیر پر لازم ہے کہ وہ معاہدے کے مطابق کام اچھے سے اچھا اور بہتر سے بہتر کرے، کام میں چوری اور سُستی و کوتاہی سے بچے۔ (۸) اور پھر اجیر اور مستاجر میں سے کوئی بھی دوسرے کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور ہر ایک دوسرے کا بھلا چاہے اور احترام کرے۔

سیرت اور حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ معلّمِ کامل، ہادیِ برحق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہ نفسِ نفیس اُجرت پر دوسروں کا کام کیا اور بعض دفعہ دوسروں سے بھی اُجرت پر کام کرایا۔ جب خود کام کیا تو بہتر سے بہتر اور معاہدے سے زیادہ کیا۔ اور دوسروں سے کام کرایا تو اُن کو مقررہ اجرت سے زیادہ عطا فرمائی اور کبھی کسی کو آپ سے شکایت نہ ہوتی۔

سنن الکبریٰ بیہقی میں حضرت جابرؓ سے مروی ایک حدیث اس طرح ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آجرت نفسی من خدیجة سفرتین بقلوص۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اجرت پر خدیجہؓ سے دو تجارتی سفروں کا معاملہ کیا، ہر سفر ایک جوان

اونٹ کے عوض۔ صحیح البخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث بہ ایں طور ہے: "قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول ما بعث اللّٰہ نبیاً اِلّا راعی غنم، قالوا ولا انت یا رسول اللّٰہ قال وانا کنت ارعاھا لاھل مکۃ بالقراریط"۔

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے سُنا کہ اللہ نے جس نبی کو بھی مبعوث فرمایا اُس نے بکریاں چرائیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ نے بھی؟ تو فرمایا ہاں میں بھی مکّے والوں کی بکریاں چند قیراط کے عوض چراتا رہا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حُسنِ کارکردگی کی بنا پر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو مقررہ اُجرت سے زیادہ پیش فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے حجّام سے پچھنیاں لگوائیں اور اُس کو اُجرت دی۔ جب مکّے سے مدینے کی طرف ہجرت فرمائی تو اُجرت پر ایک شخص کو لیا جو راستہ دکھانے پر مامور ہوا۔ اسی طرح کئی روایات ہیں جن میں صحابہؓ کے اُجرت پر کام کرنے کرانے کا ذکر ہے۔

(۳) قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک بڑی اہم تعلیم وہ ہے جو شخصی ملکیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قدرتی اشیا میں سے جو شے اپنی قدرتی حالت و شکل پر قائم اور برقرار ہو اُس کا کوئی شخص مالک نہیں کہلا سکتا، کیوں کہ قرآنِ مجید کی متعدد آیات کے مطابق ایسی ہر شے سب کے استفادہ کے لیے مباحِ عام کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس شے سے فائدہ اٹھانے کا صرف اُسی کو حق ہے دوسرے کو نہیں، البتہ جب کوئی شخص دوسروں سے پہل و سبقت کر کے کسی قدرتی شے میں اپنی سعی و محنت سے ایسا ردّ و بدل کر دے جس سے اُس شے میں ایک نئی افادیت پیدا ہو جائے تو اُس شخص کو اپنی سعی و محنت کے اثرات کی وجہ سے جو اُس شے کے ساتھ قائم ہوئے اُس شے سے استفادے کے حق میں دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہو جاتی ہے جس کا نام حقِ ملکیت ہے۔ اب دوسرا کوئی اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر اس شے سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ قدرتی اشیا کی ابتدائی ملکیت کا یہ تصور قرآنِ مجید کی بعض آیات سے بھی مستنبط ہوتا ہے اور احادیث میں اس کا واضح ذکر ہے مثلاً "مَنْ اَحیا ارضا میتۃ فھی لہٗ"۔ گویا کسی قدرتی شے کی ابتدائی ملکیت کا اصل سبب انسان کی مفید محنت ہے محض قبضہ نہیں، پھر جب پہلا مالک اپنی چیز کسی دوسرے کو ایسے طریقے سے دے دیتا ہے جس میں اُس کی رضامندی موجود ہوتی ہے تو وہ چیز دوسرے کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے اور وہ اُس کا مالک بن جاتا ہے۔ رضامندی کے موجود ہونے نہ ہونے کا خارجی معیار یہ ہے کہ جس طریقے میں پہلے مالک کے لیے کسی نہ کسی شکل میں مادّی یا روحانی معاوضہ موجود ہو وہ طریقِ رضامندی کا طریقہ ہوتا ہے، اور جس میں

معاوضہ موجود نہیں ہوتا وہ عدم رضامندی کا طریقہ ہوتا ہے۔ رضامندی کے عام طور پر پانچ طریقے ہیں: (۱) تجارتی خرید و فروخت کا طریقہ، جس میں ظاہر ہے کہ ایک فریق کے لیے نقد وغیرہ کی شکل میں اور دوسرے کے لیے جنس کی شکل میں معاوضہ موجود ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا طریقہ صدقے وہبہ کا طریقہ ہے جس میں دینے والے کے لیے روحانی و اُخروی اجر و ثواب کی شکل میں معاوضہ موجود ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنی مرضی اور خوشی سے دوسرے کو دیتا ہے۔ (۳) تیسرا طریقہ نوکری و ملازمت کا طریقہ ہے۔ اس میں ایک شخص دوسرے کو اُجرت و تنخواہ کے طور پر جو دیتا ہے اُس کے عوض اُس کو خدمت اور منفعت ملتی ہے۔ (۴) چوتھا طریقہ قرض واُدھار کا طریقہ ہے جس میں دینے والے کو اطمینان ہوتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد اُس کو اپنی مقروضہ چیز جیسی چیز بھی ملے گی اور وہ اجر و ثواب کا بھی مستحق بنے گا۔ اور (۵) پانچواں طریقہ وراثت کا طریقہ ہے جس میں صلۂ رحمی کی وجہ سے مورث کے لیے اجر و ثواب موجود ہوتا ہے۔ گویا وہ نسب و قرابت کی بنا پر یہ چاہتا تھا کہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کا متروکہ مال اُس کے قریبی رشتے داروں کو ملے لہٰذا وہ اس کی بنا پر اُخروی اجر و ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے، ان مذکورہ پانچ طریقوں سے ایک کی ملکیت کا دوسرے کی طرف منتقل ہو جانا اُن آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے جن میں ان طریقوں کا ذکر ہے۔

اور پھر شخصی ملکیت کے متعلق اسلام کا یہ جو اصولی تصور ہے اس کی رُو سے جس طرح کوئی شخص اشیائے صرف میں سے کسی شے کا مالک قرار پاتا ہے اسی طرح ہر اُس شے کا بھی مالک قرار پاتا ہے جو ذرائع پیداوار کی تعریف میں آتی ہے۔ مثلاً زرعی زمین اور کارخانہ وغیرہ، دونوں کی ملکیت میں کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ اسلام اشیائے صرف کے مالک کو ہر اُس تصرّف کا اختیار دیتا ہے جو اُس کے لیے مفید ہو، جب کہ ذرائع پیداوار کے مالک کو کسی ایسے تصرّف کا اختیار نہیں دیتا جو اُس کے لیے تو مفید ہو، لیکن مفادِ عام کے لیے مضر و نقصان دہ ہو، کیوں کہ ایسی اشیا اپنی وضع و ساخت کے لحاظ سے مفادِ عام کے لیے ہوتی ہیں۔ لہٰذا شخصی ملکیت کے باوجود اُن کی یہ حیثیت قائم رہتی ہے اور مالک پابند ہوتا ہے کہ اُن میں کوئی ایسا تصرّف نہ کرے جو اُس کے لیے تو مفید ہو، لیکن مفادِ عام کے لیے مُضر ہو۔ اس سے اُن مفاسد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے جو ذرائع پیداوار کے مالک کو ہر قسم کے تصرّف کا اختیار ہونے کی صورت میں ضرر پیدا ہوتے اور بدامنی و بے چینی کا باعث بنتے ہیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شخصی و انفرادی ملکیتوں کا جو نظام قائم ہوا وہ اسی تصورِ ملکیت کے مطابق تھا۔ قدرتی اشیا کی ملکیت کی بنیاد انسانی محنت تھی اور

استقالِ ملکیت کی بنیاد پہلے مالک کی حقیقی رضامندی یا وہ طریقے تھے جن میں حقیقی رضامندی پائی جایا کرتی ہے۔

(۴) اسلام کی معاشی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کا تعلق معاشی معاملات کے جواز و عدمِ جواز سے ہے اور جس کے ساتھ معاشرے کے معاشی اعتدال و توازن کا گہرا رشتہ ہے، اور وہ یہ کہ جو معاشی معاملات بنیادی طور پر ایسے ہیں کہ اُن کے اندر ہر فریق کو اُس کا حق ضرور ملتا اور اُس کی رضامندی کا سامان ہوتا ہے وہ عدل کے مطابق ہونے کی وجہ سے صحیح اور جائز ہیں۔ اور جن میں ایک فریق کی ضرور حق تلفی ہوتی یا حق تلفی کا ظن و احتمال ہوتا ہے وہ موجود یا محتمل ظلم کی وجہ سے باطل اور فاسد ہیں۔ صحیح اور جائز معاشی معاملات کی مثال بیع و تجارت، اجارہ، نوکری و مزدوری ہیں جب کہ اُن میں کوئی دھوکہ فریب اور مجبوری موجود نہ ہو۔ بیع و تجارت میں ظاہر ہے کہ ہر فریق کو اُس کا حق کسی جنس یا نقدی کی شکل میں ضرور ملتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ دھوکے فریب اور مجبوری کی شکل میں ایک فریق کے حق میں کچھ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اجارے کے معاملے میں بھی ظاہر ہے کہ ایک فریق کو اُس کا حق نقدی وغیرہ کی شکل میں اور دوسرے کو منفعت کی شکل میں ضرور ملتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ جہالت اور مجبوری کی وجہ سے بعض دفعہ ایک فریق کی کچھ حق تلفی ہو جاتی ہے۔ اور نوکری و مزدوری کے معاملے میں بھی ظاہر ہے کہ ایک فریق کو اُس کا حق نقد وغیرہ کی شکل میں اور دوسرے کو منفعت اور خدمت کی شکل میں ضرور ملتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض دفعہ ایک فریق اپنی مجبوری کی وجہ سے استحصال کا شکار ہو جاتا ہے اور اُس کو اُس کا پورا حق نہیں ملتا۔ بہرحال اصولی اور بنیادی طور پر یہ مذکورہ معاملات ایسے ہیں کہ اُن میں ہر فریق کو اُس کا حق کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے۔ لہٰذا یہ عدل کے مطابق ہیں اور اسلام کے نزدیک جائز و درست۔

باطل و ناجائز معاملات کی مثال ربٰو، قمار، رشوت اور مخابرہ کے معاملات ہیں، کیوں کہ ان میں ایک فریق کی ضرور حق تلفی واقع ہوتی ہے اور اُس کا مال دوسرا ناحق طور پر ضرور لیتا ہے۔ ربٰو میں قرض دینے والا فریق، مقروض فریق سے اپنے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے اُس کا اس کی طرف سے مقروض کے لیے کوئی حقیقی عوض موجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ بلا عوض اور ناحق دوسرے کا مال لیتا ہے۔ گویا ایک فریق کی حق تلفی اس معاملے کی ماہیت اور بنیادی ساخت میں موجود اور اس کی حقیقت کا جُزوِ لاینفک ہے۔ میسر و قمار کے معاملے میں بھی جیتنے والا فریق ہارنے والے فریق سے جو مال لیتا ہے اس کا کوئی مفید عوض ہارنے والے کے لیے موجود نہیں ہوتا جو جیتنے والے کو اُس کا حق دار بناتا

ہو۔ لہٰذا وہ دوسرے کا مال ناحق طور پر لیتا ہے اور یہ چیز اس معاملے کی ماہیت میں داخل ہے۔ رشوت کے معاملے میں بھی ایک فریق کی ضرور حق تلفی واقع ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں حاکم بہ طور رشوت جو مال لیتا ہے اُس کا اُس کی ذات کی طرف سے کوئی عوض موجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح حاکم رشوت کی وجہ سے جس حق دار کا حق دوسرے کو دلواتا ہے دوسرے کی طرف سے اُس کا عوض موجود نہیں ہوتا لہٰذا اس معاملے کی ماہیت میں ایک فریق بلکہ دو فریق کی حق تلفی بہ طور جُز کے شامل ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو مخابرہ و مزارعہ کا معاملہ بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اس میں بھی مالکِ زمین کاشت کار سے جو لیتا ہے اُس کا مالکِ زمین کی طرف سے کاشت کار کے لیے کوئی ایسا عوض موجود نہیں ہوتا جو اُسے اس کا حق دار ٹھہراتا ہو، کیوں کہ زمین استعمال ہونے سے نہ صرف یہ کہ مالیت میں کم نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ مالیت میں کچھ بڑھ جاتی ہے۔ جب کاشت کار بنجر زمین کو آباد کرتا اور اُسے خوب کھاد وغیرہ دیتا ہے۔ لہٰذا زمین جب مالک کی طرف لوٹتی ہے تو اُس کی حیثیت ویسی ہی ہوتی ہے جو سُود خور کی طرف لوٹنے والی اصل رقم کی ہوتی ہے۔ اُس کی حیثیت کرایے وا جارے پر دی ہوئی ایسی چیز کی نہیں ہوتی جو استعمال ہونے سے گھستی اور پُرانی ہوتی اور اس کی مالیت اور قیمت ضرور گھٹتی ہے، اور چوں کہ یہ معاملہ اپنی ماہیت و حقیقت کے لحاظ سے رِبوٰ کی طرح ہے لہٰذا بعض احادیثِ نبویہؐ میں اس کو صریح طور پر "رِبوٰ" کہا گیا اور اُس کو نہ چھوڑنے والوں کے لیے بعینہٖ وہی دھمکی ہے جو رِبوٰ کو نہ چھوڑنے والوں کے لیے قرآنِ مجید میں ہے یعنی اللہ و رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ۔ مستدرک حاکم میں حضرت جابرؓ کی ایک حدیث ہے جس کا ترجمہ یوں ہے۔ جب سورۃ بقرہ والی تحریم رِبوٰ کی آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مخابرہ کو نہ چھوڑے اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے جنگ کر رہا ہے۔

اسی طرح مختلف احادیثِ نبویہ میں بیع کی جن قسموں اور شکلوں سے منع فرمایا گیا ہے جیسے بیع محاقلہ، بیع مزابنہ، بیع منابذہ، بیع طامسہ، بیع مخاطرہ، بیع المجازفہ، بیع الحصاۃ، بیع عُربان، بیع عینہ، بیع الغرر، بیع المضامین والملاقیح، بیع حبل الحبلہ، بیع السنین، بیع الکالی بالکالی، بیع الحیوان باللحم، بیع الثمار قبل ان یبدو صلاحھا، بیع و سلف اور بیعتین فی بیعۃ وغیرہ۔ ان بیوع کی حقیقت کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو اُن کے اندر رِبوٰ یا میسر و قمار کا کچھ رنگ نظر آتا اور ایک فریق کی حق تلفی کا اگر یقین نہیں ہوتا تو غالب ظن اور قوی احتمال ضرور ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ عموماً باہمی نزاع اور جھگڑے کا باعث بنتے اور بدامنی و بے چینی پیدا کرتے ہیں لہٰذا اسلام نے ان کو ممنوع و ناجائز ٹھہرایا ہے۔

(۵) معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز کے متعلق اسلام کی یہ جو تعلیم ہے اس پر عمل کا کامل ترین اور روشن ترین نمونہ دیکھنا ہو تو وہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ احادیث بتاتی ہیں کہ اعلانِ نبوت کے بعد آپؐ نے معاش کے سلسلے میں ہمیشہ تجارت یعنی بیع و شراء کا مشغلہ اختیار فرمایا جس میں انتہائی درجے کی دیانت و امانت بھی تھی اور سماحت و خوش معاملگی بھی، اور یہ وہ معاملہ ہے جس کے حلال و جائز اور مستحسن و مستحب ہونے کی قرآنِ مجید میں صراحت ہے۔ اسی طرح آپؐ نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ہمیشہ ربٰو اور میسر سے دُور رہے بلکہ جس معاملے میں ربٰو اور قمار کا شبہ اور شائبہ بھی تھا اُس کو بھی کبھی قریب نہ آنے دیا، آپؐ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی کو زمین مخابرہ و مزارعہ پر دی اور نہ کبھی کسی سے لی۔ یہودِ خیبر کے ساتھ جو معاملہ ہوا تھا وہ بہ قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزارعت کا معاملہ نہ تھا بلکہ غیر مسلم ذمیوں کے ساتھ بیت المال کے لیے خراجِ مقاسمت کا معاملہ تھا جو معاشی ہونے کے ساتھ ایک طرح کا سیاسی معاملہ تھا۔ نیز آپؐ نے کبھی کسی ضرورت مند کو اپنی کوئی چیز کرایے و اجارے پر نہ دی بلکہ صدقہ اور ہبہ کے طور پر بلا معاوضہ دی۔ اسی طرح آپؐ نے کبھی کسی کو مال مضاربت پر نہ دیا بلکہ ضرورت مند کو صدقہ اور قرضِ حسنہ کے طور پر دیا جو احسان پر مبنی اور مستحب تھا۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے جب آپؐ کی عمر مبارک تقریباً پچیس برس تھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تجارتی کام کیا وہ مضاربت پر نہ تھا بلکہ متعین اُجرت پر تھا۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے تجارتی مال اور اُن کے غلام میسرہ کے ساتھ جو شام کا تجارتی سفر فرمایا اُس کی اُجرت چار جوان اونٹ مقرر ہوئی تھی جو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں دوگنی تھی۔ اس روایت کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت ابوطالب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: بھتیجے مجھے معلوم ہوا ہے کہ خدیجہؓ نے سفرِ شام کے لیے فلاں شخص کی اُجرت دو جوان اونٹ مقرر کی ہے، میں نہیں چاہتا کہ وہ آپ کو بھی اتنی ہی اُجرت دے جتنی وہ اُس شخص کو دے گی۔ کیا آپ اُن سے اس بارے میں بات کرنا پسند کریں گے؟ تو آپؐ نے فرمایا میں پسند نہیں کرتا۔ تو پھر حضرت ابوطالب خود حضرت خدیجہؓ کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ نے اپنے تجارتی کارواں کے ساتھ بھیجنے کے لیے فلاں شخص کی اُجرت دو جوان اونٹ مقرر کی ہے، محمدؐ کے لیے میں چار سے کم اونٹوں پر راضی نہیں ہو سکتا تو حضرت خدیجہؓ نے کہا منظور ہے اگر آپ کسی دُور کے اور دشمن کے لیے کہتے جب بھی ہم اسے مان لیتے اور ایسے شخص کے لیے کیسے نہیں کریں گے جو آپ کا محبوب اور قریبی ہے۔

طبقات ابنِ سعد میں اسی سفرِ شام سے متعلق دو روایتیں اور بھی ہیں۔ اُن میں بھی کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ یہ معاملہ اُجرت کے بجائے مضاربت یعنی نفع کے ایک حصّے پر طے ہوا تھا۔ اسی طرح سیرت ابنِ ہشام میں ابنِ اسحاق کی سفرِ شام سے متعلق جو روایت ہے جسے طبری وغیرہ سب نے نقل کیا ہے اس میں بھی کوئی ایسی صراحت نہیں کہ یہ تجارتی سفر متعین اُجرت پر نہیں مضاربت پر ہوا تھا بلکہ اس روایت میں متعدد ایسی چیزیں ہیں جو اس معاملے کے مضاربت ہونے کی نفی کرتی ہیں۔ اس معاملے کے متعلق مضاربت کا خیال دراصل ابنِ اسحاق کی روایت کے بعض الفاظ سے پیدا ہوا جو اس طرح ہیں: قال ابنِ اسحاق: وکانت خدیجة بن خویلد امرأة تاجرة ذات شرف و مال تستأجر الرجال فی مالها وتضاربهم ایاه بشئی تجعله لهم۔ خدیجہ بن خویلد تجارت پیشہ خاتون تھیں اور شریف و مال دار۔ وہ واقف کار اشخاص سے اپنے مال میں اُجرت پر بھی کام کراتی تھیں اور اُن کو مقررہ حصّے کے عوض مال مضاربت پر بھی دیتی تھیں۔ اس عبارت کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ اپنی تجارت میں دو طریقوں سے کام لیتی تھیں: ایک متعین اُجرت پر اور دوسرا مضاربت سے نفع کے ایک حصہ پر۔ لیکن کسی نے یہ سمجھ کر کہ دوسرا جُملہ پہلے جُملے کی تفسیر ہے یہ مطلب نکالا کہ حضرت خدیجہؓ ہر ایک سے صرف مضاربت پر کام کراتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کام کرایا وہ بھی مضاربت پر تھا، حال آں کہ نہ دوسرے جُملے کو پہلے جُملے کی تفسیر سمجھنا دُرست اور نہ اُس سے یہ مطلب لینا دُرست کہ حضرت خدیجہؓ صرف مضاربت پر کام کراتی تھیں، کیوں کہ دوسری روایات اور احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ وہ متعین اُجرت پر بھی کام کراتی تھیں اور آں حضرتؐ سے جو کام لیا وہ متعین اُجرت پر تھا۔ سفرِ شام کے متعلق تو ابنِ سعد کی روایت صاف بتا رہی ہے کہ وہ معاملہ چار اونٹوں کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا جب کہ دوسرے شخص سے دو اونٹوں کے عوض ہوا تھا۔ اس کے علاوہ المستدرک للحاکم اور سنن الکبریٰ للبیہقی میں حضرت جابرؓ سے مروی ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں: استاجرت خدیجة رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفرتین الی جُرش، کل سفرة بقلوص، حضرت خدیجہؓ نے اُجرت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مرتبہ مقام جُرش کی طرف سفرِ تجارت کا معاملہ کیا، ہر سفر ایک جوان اونٹنی کے بدلے۔ امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد بتایا ہے، جُرش یمن میں کسی جگہ کا نام ہے جہاں بازار لگتا تھا۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضور نبی اکرمؐ نے حضرت خدیجہؓ کے لیے یمن کی طرف بھی تجارتی سفر فرمائے جو ہو سکتا ہے کہ شام کے سفر سے پہلے کے ہوں۔

بیہقی میں حضرت جابرؓ سے مروی ایک مرفوع حدیث بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آجرت نفسی من خدیجۃ سفرتین بقلوص۔ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا! میں نے خدیجہؓ سے دو مرتبہ متعین اُجرت پر تجارتی سفر کا معاملہ کیا۔ ہر سفر ایک جوان اونٹنی کے عوض۔

ان روایات سے اُس مطلب کی صاف تغلیط و تردید ہوتی ہے جو ابنِ ہشام کی روایت کے بعض الفاظ سے لیا گیا اور بعد والوں نے بے سوچے سمجھے لکھنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو تجارتی کام کیا وہ مضاربت کے طور پر تھا۔ اگر ان حضرات کے سامنے اس سلسلے کی تمام روایات ہوتیں تو وہ کبھی ایسا نہ لکھتے۔

(۶) اس بحث کے تعلق سے یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مضاربت کا معاملہ کبھی بھی اس لیے اختیار نہیں فرمایا کہ یہ معاملہ احسان کے درجے کا نہیں تھا۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دستور تھا کہ آپ ہمیشہ عدل کے مقابلے میں احسان کو اختیار فرماتے، لہٰذا آپؐ کسی کاروباری ضرورت مند کو مال نفع کے ایک حصّے پر دینے کے بہ جائے اس کو افضل اور بہتر سمجھتے تھے کہ اس کو مال یوں ہی یا قرضِ حسنہ کے طور پر دیا جائے۔ اسلام کے بعض دوسرے اصولوں کی رو سے جو عدل سے تعلق رکھتے ہیں مضاربت کا معاملہ جائز ہے، لیکن یہ جواز استحباب کے ساتھ نہیں بلکہ کراہیت کے ساتھ ہے۔ گویا اس کے جائز ہونے کا مطلب ہے حرام نہیں، جیسے طلاق جائز تو ہے، لیکن کراہیت کے ساتھ، کیوں کہ اس کو اَبْغَضُ المباحات فرمایا گیا ہے۔

(۷) قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں ایک تعلیم وہ ہے جو ضرورت سے زائد اور فاضل مال سے تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ کہ زائد از ضرورت اور فاضل مال کو جمع رکھنے کے بہ جائے راہِ خدا اور مصارفِ خیر میں خرچ کر دیا جائے، سورۃ بقرہ کی آیت ہے:

یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۵ قُلِ الْعَفْوَ ۵

"آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں فرما دیجیے
جو ضرورت سے زائد ہو۔"

سورۃ التوبہ کی آیات کا ترجمہ ہے: جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے اور راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے جس دن اُس کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اُس سے اُن کی پیشانیوں، اُن کے پہلوؤں اور اُن کی پیٹھوں کو داغا

جائے گا یہ کہتے ہوئے کہ یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لیے خزانہ بنایا پس چکھو مزہ اُس کا جو تم جمع کرتے اور خزانہ بناتے رہے تھے۔

سورۃ الھمزہ میں ہے: ویل وخرابی ہے ہر اُس کے لیے جو سامنے مُنہ پر دوسرے کو طعنہ دینے والا اور پیٹھ پیچھے عیب جوئی کرنے والا ہے، جس نے مال جمع کیا اور گِن گِن کر رکھتا رہا اور یہ گمان کرتا رہا کہ اُس کا مال اُس کے لیے ہمیشہ رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ چکنا چُور کر دینے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

صحیح المسلم کی ایک حدیث کا ترجمہ ہے: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اے آدم کے بیٹے یاد رکھ کہ تیرا اپنے فاضل مال کو خرچ کر دینا تیرے لیے بہتر اور اُسے روک رکھنا تیرے لیے بُرا و مضر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبے میں فرمایا خوش بختی ہے اس کے لیے جس نے اپنا فاضل مال خرچ کیا اور فضول باتوں سے خود کو روکا۔

حضرت قتادہؓ کی روایت کردہ ایک حدیثِ نبویؐ کا ترجمہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری طرف چند کلمات وحی کیے گئے جو میرے کان میں داخل ہو کر دل میں ٹھہر گئے: ایک یہ کہ میں اُس کے لیے دُعائے مغفرت نہ کروں جو مشرک مرا ہو، اور دوم یہ کہ جس نے اپنا فاضل مال صحیح مصارف میں خرچ کر دیا وہ اُس کے لیے موجبِ خیر ہے اور جس نے روک رکھا وہ اس کے لیے موجبِ شر اور بُرا ہے اور یہ کہ بہ قدرِ کفاف رکھنے پر اللہ ملامت نہیں کرتا اور ناراض نہیں ہوتا۔

صحیح المسلم میں حضرت ابوسعید الخدریؓ سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے: کہا کہ اس دوران کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ اچانک اونٹنی پر سوار ایک شخص آیا اور اپنی نہایت لاغر اونٹنی کو دائیں بائیں گھُمانے لگا جو چل نہیں سکتی تھی، اُس کی اِس قابلِ رحم حالت کو دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا: جس کے پاس فاضل سواری ہو وہ اُس پر لوٹا دے جس کے پاس کوئی سواری نہیں، جس کے پاس فاضل خوراک ہو اُس کو دے دے جس کے پاس خوراک نہیں، یہاں تک کہ ہم یہ سمجھے کہ جس کے پاس جو بھی فاضل مال ہے وہ اُس کا حق نہیں بلکہ اُس کا حق ہے جو اُس کا ضرورت مند ہے۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ اس تعلیم کو پیش فرمانے والے کا خود اپنا اس پر کیا عمل تھا، اور صحابہؓ

کرامؓ کی جو عینی شہادتیں اس بارے میں حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں اُن سے کیا حقیقت سامنے آتی ہے؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ جنھیں کئی سال تک خادم خاص کی حیثیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا شرف نصیب ہوا فرماتے ہیں: **کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایدخر شیئاً لغدٍ** ۔ رسولِ اکرمؐ کبھی کل کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہ کر رکھتے تھے، یہ حدیث جامع ترمذی اور بیہقی وغیرہ میں ہے، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے مروی ایک لمبی حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: **اَلَا وَاِنّی لا اکنز دینارا ولا درھما ولا اخبأ رزقا لغدٍ**، آگاہ رہو کہ میں نہ دینار جمع کرتا ہوں اور نہ درہم اور نہ کھانے کی کوئی چیز کل کے لیے ذخیرہ کر رکھتا ہوں۔ یہ حدیث الترغیب و الترہیب میں ہے۔ حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیثِ نبویؐ کا مضمون ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر میرے پاس اُحُد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو میں اُسے راہِ خدا میں خرچ کر ڈالوں گا اور یہ نہیں چاہوں گا کہ تیسرے دن میرے پاس اس میں سے کچھ بھی باقی رہے سوائے اس کے جو مجھے کسی کا قرض ادا کرنا ہو۔

بخاری اور مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث کا ترجمہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو میرے پاس گھر میں کوئی سامانِ خوراک نہ تھا سوائے جَو کی کچھ مقدار کے جو ایک چمڑے کے ظرف میں پڑے تھے۔

صحیح البخاری ہی میں حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: **ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند موتہ درھما ولا دینارا، ولا عبدا، ولا امۃ ولا شیئا الا بغلتہ البیضاء التی کان یرکبھا وسلاحہ وارضا جعلھا لابن السبیل صدقۃ** ۔ ترجمہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے وقت نہ درہم چھوڑے نہ دینار، نہ غلام چھوڑا اور نہ کنیز، اور نہ ہی کوئی دوسری شے چھوڑی سوائے سفید خچر کے جس پر آپ سواری فرماتے تھے اور ایک ہتھیار کے اور ایک زمین کے جو مسافر مہمانوں کے لیے بطور صدقہ تھی۔

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: **توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ودرعہ مرھونۃ عند یھودی فی ثلاثین صاعا من شعیر**، حضور نبیِ اکرمؐ کی وفات ہوئی تو اُس وقت آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جَو کے عوض گروی تھی، غور فرمائیے یہ اُس وقت کی بات ہے جب مالِ غنیمت بڑی مقدار میں آرہا

تھا اور آپ اپنے ہاتھ سے مسلمانوں میں تقسیم فرما رہے تھے، اصل بات یہ تھی کہ آپ کو جو حصّہ ملتا اُسے جمع رکھنے کے بجائے آپ اُسے تقسیم فرما دیتے تھے اپنی ذات کے لیے کبھی فکرِ فردا نہ فرمائی اور اللہ پر انتہائی توکّل کا ثبوت پیش فرمایا۔

(۸) اسلام کی معاشی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ مسلمان کا معیارِ زندگی سادہ ہونا چاہیے، یعنی خوراک، پوشاک، گھر اور گھریلو سامان وغیرہ میں مترفانہ تعیّش و تکلّف اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کے بجائے نمایاں سادگی ہونی چاہیے تاکہ اُس کا مال اِس مد پر کم سے کم اور اجتماعی فلاح و بہبود کے مصارف میں زیادہ سے زیادہ خرچ ہو اور اُن برائیوں سے بھی بچ جائے جو مترفانہ زندگی سے ضرور پیدا ہوتی ہیں اور معاشرے کو بُری طرح بگاڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو سادہ معیارِ زندگی کے متعلق اسلام کی یہ جو تعلیم ہے فرد اور معاشرے دونوں کے لیے اپنے اندر بے شمار مصالح اور فوائد رکھتی ہے جو روحانی و اخلاقی بھی ہیں اور تمدّنی و سماجی بھی، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ جو معاشرہ سادگی کی زندگی اختیار کرتا ہے، توازن کے ساتھ ضرور ترقی کرتا اور زندگی کے ہر میدان میں برابر آگے بڑھتا ہے۔

سادگی کی اس تعلیم پر بھی عمل کا مثالی نمونہ دیکھنا ہو تو وہ بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ میں نمایاں صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خوراک کا یہ عالم تھا کہ بقول حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مدینے کی زندگی میں کبھی دو روز مسلسل آپؐ نے جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر اور سیر ہو کر نہ کھائی، آپ کے دسترخوان پر کبھی ایک سے زیادہ کھانا نہ دیکھا گیا، بعض دفعہ دو دو ماہ گزر جاتے اور گھر میں چولھا نہ جلتا اس لیے کہ پکانے کے لیے کچھ موجود نہ ہوتا اور صرف کھجور اور پانی پر گزارہ ہوتا، کبھی کبھی پڑوسی بکری کا دودھ بھیج دیتے تو پی لیا جاتا، شام کے وقت عموماً فاقہ رہتا اور گھر کے سب لوگ بھوکے پیٹ سوتے۔ سُنن ابنِ ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کا ترجمہ یہ ہے: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسی نے گرم کھانا پیش کیا تو آپؐ نے تناول فرمانے کے بعد الحمدللہ فرمایا اور ارشاد ہوا کہ کئی روز سے گرم کھانا حلق سے نہیں اُترا اور پیٹ میں نہیں پہنچا تھا۔ غذا کی سادگی اور کمی کے بارے میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث خاص طور پر قابلِ ذکر اور لائقِ توجّہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: وَلَوْ شِئْنَا لَشَبِعْنَا وَلٰکِنَّہٗ کَانَ یُؤْثِرُ عَلٰی نَفْسِہٖ ۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہمیشہ خوب سیر ہو کر کھا سکتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے یعنی اپنا سامان خور و نوش بطورِ ایثار و ہمدردی دوسرے مساکین و فقرا کو عطا فرما دیتے تھے گویا یہ حالت اضطراری نہ تھی اختیاری تھی۔ اس کا اظہار اُس مرفوع حدیث سے بھی ہوتا ہے جس کے راوی حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ ہیں اور جس کا ترجمہ یہ ہے: نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب نے مجھ پر یہ چیز پیش فرمائی کہ اگر تم چاہو تو بطحا کو آپ کے لیے سونا بنا دیا جائے، میں نے عرض کیا کہ میرے رب مجھے نہیں چاہیے بلکہ میری خواہش و تمنا تو یہ ہے کہ ایک دن کھاؤں اور دوسرے دن بھوکا رہوں۔ جب بھوکا رہوں تو عاجزی و زاری کے ساتھ تیرے یاد کروں اور جب کھاؤں تو تیرا شکریہ ادا کروں اور تیری حمد بجالاؤں، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھوکے رہ کر دوسروں کو جو کھلاتے تھے تو آپ در اصل قرآنِ مجید کی اس آیت پر عمل فرماتے تھے:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۝

"اور وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود اس کے ضرورت مند ہوں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس اور کپڑوں کے بارے میں صحابہ کرامؓ کی جو روایات ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ عموماً آپؐ کا لباس نہایت سادہ اور معمولی رہتا جیسا کہ دوسرے مساکین مسلمانوں کا، آپؐ نے ہمیشہ قیمتی اور ریشمی لباس سے اجتناب فرمایا۔ بعض دفعہ آپؐ کی خدمت میں قیمتی لباس پیش کیا گیا تو آپؐ نے دوسروں کو عنایت فرما دیا، آپؐ موٹے اور کھُردرے لباس کو اپنے لیے پسند فرماتے اور پہنتے، پھر کبھی ایک جوڑے سے زائد نہ تھا اور وہ بھی عموماً پیوند لگا ہوا، حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں وَلَا يُطْوٰى لَهٗ ثَوْبٌ۔ اور کبھی آپؐ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا یعنی صرف ایک جوڑا ہوتا تھا دوسرا ہوتا ہی نہیں تھا کہ تہہ کر کے رکھا جاتا۔ بعض روایات میں ہے کہ جن کپڑوں میں حضورؐ کی وفات ہوئی اُن میں اُوپر تلے کئی پیوند لگے ہوئے تھے اور پھر لباس میں یہ سادگی مجبوری کی بنا پر نہ تھی بلکہ اپنی مرضی اور اختیار سے تھی۔ آپؐ کے پاس جو اچھا اور زائد کپڑا آتا دوسرے مساکین ضرورت مندوں کو عنایت فرما دیتے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی ضرورت کی چیزوں سے لوگوں کی ہمدردی و امداد فرماتے، حتیٰ کہ آپؐ نے اپنے پھٹے تہبند پر کپڑے کے بجائے چمڑے کا پیوند لگایا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سادگی اور مسکینی کی زندگی اتنی پسند تھی کہ آپؐ اللہ سے یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ

"اے اللہ مجھے زندہ بھی مسکینی میں رکھ اور موت بھی مسکینی میں دے اور میرا حشر بھی مسکینوں میں کرنا۔"

خوراک اور لباس کی سادگی کی طرح تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رہائشی گھر بھی نہایت سادہ، معمولی اور چھوٹا سا تھا، آپؐ نے مسجدِ نبوی کے متصل ازواجِ مطہرات کے لیے چھوٹے چھوٹے جو

حُجرے بنوائے، نہ اُن کے صحن تھے نہ دالان۔ اور کسی حجرہ یا کمرہ کی وسعت چھے سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی، دیواریں مٹی کی تھیں اور اتنی کمزور کہ ان میں شگاف پڑے ہوتے تھے جن سے دھوپ اندر آتی تھی۔ چھت چھپر کی طرح کھجور کی شاخوں پتّیوں سے بنی تھی، بارش سے بچنے کے لیے بالوں کے کمبل لپیٹ دیے جاتے تھے اور اونچائی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو ہاتھ سے چھو سکتا تھا، گھر کے دروازوں پر معمولی پردہ یا ایک پٹ کا کواڑ ہوتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم باری باری ایک ایک شب ایک ایک حُجرے میں گزارتے تھے اور دن میں لوگوں کے لیے نشست ساتھ ہی مسجد میں ہوتی تھی۔ ان حُجروں کے علاوہ اُوپر ایک چھوٹا سا بالاخانہ بھی تھا جس کو احادیث میں مَشربہ کہا گیا ہے، لکھا ہے کہ آپ نے جب ایلاء کیا نیز گھوڑے پر سے گر کے جب چوٹ آئی تھی تو ایک مہینہ اسی مشربہ میں اقامت فرمائی تھی، اس کمرے میں جو فرنیچر اور گھریلو ساماں تھا وہ صرف یہ کہ ایک چٹائی یا بان کی چارپائی جس پر لیٹنے سے جسم پر نشان پڑ جاتے تھے، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی اور اِدھر اُدھر چند کھالیں لٹکی ہوئی تھیں اور بس، روشنی کے لیے چراغ تک موجود نہ تھا، ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے دیوار پر دھاری دار رنگین پردہ لٹکا دیا تو حضورؐ دیکھ کر ناراض ہوتے اور فرمایا کہ ہمیں اینٹ پتھر کو لباس پہنانے کے لیے مال نہیں دیا گیا ہے اور اُسے اُتروا دیا۔

(۹) قرآن وحدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ افرادِ معاشرہ کے درمیان معیارِ معیشت اور مظاہرِ معیشت میں زیادہ سے زیادہ مساوات ویکسانی ہونی چاہیے۔ اس کی کچھ وضاحت یہ کہ قرآن وحدیث کی رو سے یہ تو جائز ہے کہ معاشرے کے بعض افراد کے پاس مال زیادہ اور بعض کے پاس کم ہو، کیوں کہ مال کمانے کی دماغی جسمانی صلاحیتیں اور قوتیں سب انسانوں کے اندر برابر و یکساں نہیں بلکہ ان میں نمایاں فرق و اختلاف اور کھُلی تفاوت ہے لہٰذا اس کے نتیجے میں بعض انسانوں کے پاس رزق و مال کم اور بعض کے پاس زیادہ ہونا قدرتی امر ہے۔ اور چوں کہ رزق و مال کے اِس فرق و تفاوت کے ساتھ انسانوں کی انفرادی و اجتماعی گوناگوں مصلحتیں وابستہ ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، سورۃ النحل میں ارشادِ رب العزّت ہے:

وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۝

"اور اللہ نے تمھارے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت و برتری دی ہے۔"

اور سورۃ الرعد میں فرمایا:

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ۝

"اللہ کھلا کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے"

یہ اور اس مضمون کی متعدد قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے درمیان رزق و مال کی کمی بیشی کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اور اس کا موجود رہنا انسانیت کے لیے مفید اور ضروری ہے، غرض یہ کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ معاشرے کے سب افراد کے پاس رزق و مال برابر و مساوی ہو، لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ معیارِ زندگی اور ظواہرِ معیشت میں زیادہ سے زیادہ برابری و یکسانی ہو یعنی ایک تو یہ کہ معاشرے کا کوئی فرد بنیادی معاشی ضروریات سے محروم نہ ہو جن کے بغیر عام طور پر ایک انسان نہ اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا اور نہ اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک طور پر ادا کر سکتا ہے جو مختلف حیثیات سے اُس کے ذمے عائد ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی معیار پر ہمیشہ غذا، لباس اور مکان ضرور میسّر ہو، اور دوم یہ کہ ان ظاہری چیزوں میں جہاں تک ممکن ہو سکے مساوات و برابری ہو، اور اسلام یہ اس لیے چاہتا ہے کہ جس معاشرے کے بعض افراد بنیادی معاشی ضروریات ہی سے محروم ہوں اُس میں دیر سویر ایسے حالات ضرور رونما ہو کر رہتے ہیں جن سے پُورا معاشرہ بدامنی و بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کسی کو پائیدار امن و اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسی طرح جس معاشرے کے بعض افراد کا معیارِ زندگی بہت اونچا اور بعض کا بہت پست ہو، بعض کے دسترخوان پر قسم قسم کے نفیس کھانے اور بعض کے دسترخوان پر رُوکھی سُوکھی روٹی ہو، بعض کے پاس مختلف قسم کے قیمتی و فاخرانہ لباس و کپڑے کثیر تعداد میں ہوں اور بعض کے پاس برائے نام سادہ قسم کے ایک دو جوڑے ہوں، اسی طرح بعض کے پاس قیمتی فرنیچر سے مرصّع شان دار بنگلے اور کوٹھیاں ہوں اور بعض کے پاس ضروری سامان کے بغیر کچے مکان و جھونپڑے ہوں ایسے معاشرے میں طرح طرح کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مفاسد جنم لیتے اور اس کو کھوکھلا و بودا بنا کر تباہی و بربادی سے ہمکنار کر دیتے ہیں مثلاً پس ماندہ افراد میں سے جن کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، بعض حسد و بُغض میں مبتلا ہو کر جلتے رہتے اور اُوپر والوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض رشک میں مبتلا ہو کر اپنے پست معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب جائز طریقوں سے اس میں کامیاب نہیں ہوتے تو حرام و ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں جن سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی اور بے چینی پھیلتی ہے۔ اسی طرح اونچا معیارِ زندگی رکھنے والوں کے اندر فخر و غرور پیدا ہوتا ہے اور وہ نچلے معیارِ زندگی والوں کو حقارت سے دیکھتے اور اُن کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں، نیز اُن کے اندر وہ بُرائیاں جنم لیتی ہیں جو اُونچے معیارِ زندگی کا خاصہ ہیں، اور چُوں کہ یہ تمام خرابیاں اور بُرائیاں افرادِ معاشرہ کے اندر اس صورت میں پیدا نہیں ہوتیں جب اُن کے درمیان مظاہرِ معیشت اور معیارِ زندگی میں فطری مساوات ہو لہٰذا

اسلام یہ چاہتا ہے کہ مقدارِ مال کی کمی بیشی کے باوجود افراد کے معیارِ زندگی میں مساوات و یکسانی ہونی چاہیے۔

قرآنِ مجید کی جن آیات میں یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ سب جان داروں اور سب انسانوں کا رب اور رزّاق ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر جان دار اور ہر انسان کو رزق اور سامانِ پرورش ملے، نیز جن آیات میں یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام اشیا بنی نوعِ انسان اور سب انسانوں کے انتفاع و استفادہ کے لیے پیدا فرمائی ہیں اور سب کو اُن سے فائدہ اُٹھانے کا مساوی حق ہے، اور پھر وہ آیات جن میں طعام، لباس اور مسکن کا سب انسانوں کے لیے بہ طور ایک نعمتِ خداوندی کے ذکر ہے، اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نوعِ انسان کے ہر ہر فرد کو رزق اور سامانِ معیشت بہ صورت غذا، لباس اور گھر ضرور ملنا چاہیے اور کوئی اس سے محروم نہ رہے۔

اسی طرح قرآنِ حکیم کی جن آیات میں مال دار ہونے پر اترانے اور فخر کرنے، اپنی تونگری کا دوسروں پر رعب جمانے اور ظواہرِ معیشت کے ذریعے سے اپنی دولت و ثروت کا مظاہرہ کرنے کی مذمت اور ممانعت ہے، جیسے وہ آیات جن میں قارون، اس کی نمائشِ مال و دولت اور پھر اُس کے انجامِ بد کا تذکرہ و قصہ ہے، اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ جن کے پاس زیادہ مال و دولت ہو وہ معیارِ معیشت کے ذریعے سے اس کا اظہار نہ کریں اور خوراک، پوشاک اور رہائش وغیرہ میں ایسے معیارِ زندگی سے بچیں جسے معاشرے کی عظیم اکثریت آسانی کے ساتھ نہ اپنا سکتی ہو۔

سیّدالانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی جن احادیث میں یہ تعلیم ہے کہ افرادِ معاشرہ کے درمیان معیارِ زندگی میں مساوات ہونی چاہیے اُن میں سے ایک نہایت واضح حدیث وہ ہے جس میں آپؐ نے غلاموں کے آقاؤں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ جو خود کھاتے ہو وُہی اُن کو بھی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو وہ اُن کو بھی پہناؤ اور معیشت کی ظاہری چیزوں میں اُن سے کوئی امتیاز نہ برتو، چُناں چہ اس مبارک ہدایت پر عمل ہوا اور نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عثمانِ غنی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما جیسے غنی و متموّل صحابہ کرامؓ جب اپنے غلاموں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو اجنبی پہچان نہ سکتا کہ ان میں آقا کون ہے اور غلام کون، کیوں کہ معیارِ معیشت میں ان کے درمیان کوئی فرق نہ نظر آتا تھا۔ لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں سب مسلمانوں کے مکان تقریباً ایک ہی جیسے مٹّی پتھر سے بنے ہوئے کچّے مکان تھے، بعض دفعہ کسی نے اپنے مکان میں امتیازی شان پیدا کرنے کی کوشش کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کو دیکھ کر اس امتیازی شان کو ختم کر دینا پڑا۔ معجم طبرانی کی ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: عن ابی العالیۃ ان العباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بنیٰ غرفۃ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اَھْدِمْھَا۔ فقال اَھْدِمھا او اتصدق بثمنھا؟ فقال اَھْدِمْھا۔ حضرت ابوالعالیہ کی روایت ہے کہ حضرت عباسؓ نے اپنے مکان پر خوب صورت بالاخانہ بنایا جو امتیازی شان کا حامل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا اسے گِرا کر منہدم کر دو، انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ گرا دوں یا اس کی قیمت صدقہ کردوں تو آپؐ نے فرمایا گِرا دو۔

سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ایک اور حدیث ہے جس کا مضمون اس طرح ہے: انصارِ مدینہ میں سے ایک نے اپنے گھر کے دروازے پر اونچا سا قبّہ بنوایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو دیکھ کر پوچھا یہ کس کا مکان ہے بتلایا گیا کہ فلاں کا، آپؐ سُن کر خاموش ہو گئے، لیکن دل سے ناراض ہوئے، پھر جب حسبِ معمول وہ صحابیؓ مجلسِ مبارک میں حاضر ہوتے اور سلام عرض کیا تو حضورؐ نے اُن سے مُنہ موڑ لیا اور جواب نہ دیا لہٰذا انھیں محسوس ہوا کہ حضور کسی وجہ سے ناراض ہیں، پوچھنے پر بعض صحابہؓ نے اُن کو بتایا کہ اس ناراضی کی وجہ وہ قبہ ہے جو آپ نے بنایا ہے۔ وہ یہ سُن کر گھر گئے اور اس قبہ کو فوراً مسمار کر دیا، پھر ایک موقع پر جب حضورؐ کا وہاں سے گزر ہوا تو قبہ نہ دیکھ کر پوچھا تو بتایا گیا کہ اس کے مالک کو جب آپ کی ناراضی کا علم ہوا تو اُس نے فوراً اُس کو گِرا دیا۔ اس پر حضورؐ خوش ہوئے اور اس صحابیؓ کے حق میں دُعا فرمائی، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اُس قبہ کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا: اس قسم کی عمارت اُس کے مالک کے لیے قیامت کے دن وبال بنے گی۔ بہرحال اس قسم کی احادیث کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان رہائشی مکانات میں بھی یکسانی و برابری ہونی چاہیے تاکہ مکانات کے ذریعہ سے وہ ایک دوسرے پر فخر و مباہات کا اظہار نہ کر سکیں۔

اس بارے میں کہ سب کے پاس سامانِ معیشت ہو اور یکسانی کے ساتھ ہو اُس حدیثِ نبویؐ کا ذکر بھی ضروری ہے جو امام بخاریؒ نے کتاب الشرکۃ میں نقل فرمائی ہے اور جو اس طرح ہے: عن ابی موسیٰ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الاشعریین اذا ارملوا فی الغزو، اوقل طعام عیالھم بالمدینۃ جمعوا ما عندھم فی ثوب واحد ثم اقتسموہ بینھم فی اناء واحد بالسویۃ، فھم منی وانا منھم۔ حضرت ابوموسیٰؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبیلہ اشعر کے لوگوں کا یہ وطیرہ اور طرزِ عمل تھا کہ جب جنگ کے موقع پر خوراک کی کمی محسوس کرتے، یا مدینہ میں بحالتِ امن قحط وغیرہ کی وجہ سے اُن کے سامنے کمیِ خوراک کا مسئلہ کھڑا ہوتا تو وہ اپنا سب بچا کھچا سامانِ خوراک ایک جگہ ایک کپڑے پر جمع کرتے اور پھر اس کو ایک پیمانے سے اپنے درمیان برابر برابر تقسیم کر لیتے، اور فرمایا وہ مجھ سے ہیں اور میں اُن سے ہوں۔

اس حدیثِ مبارک کے آخری الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ اور لائقِ اعتنا ہیں۔ ان کا تعلق

اشعریوں کے جس طرزِ عمل سے ہے وہ اُن کے اندر قبل از اسلام چلا آرہا تھا، اس طرزِ عمل کی وجہ سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُن کے متعلق یہ فرمانا "فَهُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْهُمْ" بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ طرزِ عمل آپؐ کے نزدیک صحیح اسلامی طرزِ عمل اور بے حد محبوب تھا اور اس فرمانے سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان بھی اپنی زندگی میں یہی طرزِ عمل اختیار کریں۔

پھر امام بخاریؒ نے اسی کتاب الشرکتہ میں ایک فعلی حدیث بھی بیان فرمائی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک غزوے میں حضور نبیِ اکرمؐ نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار فرمایا۔ جب صحابہ کرامؓ نے قلتِ خوراک کی شکایت پیش کی، آپؐ نے منادی کرائی کہ جو جس کے پاس سامان خوراک رہ گیا ہے ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ جب جمع ہوگیا تو آپؐ نے برکت کی دُعا کے بعد فرمایا کہ سب اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لے لیں، چناں چہ سب نے اپنے اپنے برتن و توشہ دان بھر لیے اور اُس کے بعد بھی کچھ بچ گیا، پھر امام بخاریؒ نے اسی باب میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے متعلق بھی ایک اثر بیان فرمایا کہ اُن کو بھی جب ایک غزوے میں ایسی ہی صورتِ حال پیش آئی تو بہ حیثیت سردارِ لشکر اور سپہ سالار کے آپ نے لشکریوں کو حکم دیا کہ جس کے پاس جو بھی سامانِ خوراک ہے ایک جگہ جمع کر دیا جائے، چناں چہ جمع ہونے کے بعد آپ نے سب کے مابین برابر برابر تقسیم فرمایا، اس روایت کو بیان کرنے سے امام بخاریؒ کا مقصود یہ بتانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوے میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ آپؐ کی ذات سے مخصوص و مختص نہ تھا۔ ورنہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اس کو اختیار نہ فرماتے، اور یہ کہ اس طرزِ عمل کا جن خاص حالات سے تعلق ہے وہ جب اور جہاں بھی پائے جائیں مسلمانوں کے سردار و سربراہ پر لازم ہوگا کہ وہ اس سُنّتِ رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ طرزِ عمل اختیار کرے۔

(۱۰) قرآن و حدیث کی معاشی تعلیمات میں سے ایک بڑی اہم تعلیم یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے ذاتی اخراجات میں اسراف و تبذیر سے بچے یعنی نہ اپنے مال کو غلط اور بے جا مصارف میں خرچ کرے اور نہ جائز و صحیح مصارف میں خرچ کرتے وقت حدِ اعتدال سے آگے بڑھے، کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو جس اسراف سے روکا اور جس کے مرتکب کو مجرم و گنہگار ٹھہرایا ہے کیف و کم کے لحاظ سے اُس کی دو قسمیں ہیں: کسی حرام چیز اور ناجائز کام میں مال خرچ کرنا خواہ کتنا ہی کم اور تھوڑا کیوں نہ ہو باعتبار کیف کے اسراف ہے، اور کسی صحیح اور مشروع مصرف میں حدِ اعتدال اور قدرِ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، باعتبار کم کے اسراف ہے اور دونوں حرام و ناجائز ہیں، مثلاً شراب و دیگر نشہ آور اشیا، مُردار، لحمِ خنزیر، مجسّمے و مورتیاں، مَردوں کے لیے ریشمی لباس اور سونے کی انگوٹھی وغیرہ، لہو و لعب اور موسیقی کے آلات، نیز جُوئے لاٹری، کسی کا حق مارنے کے لیے حکّام کو رشوت وغیرہ، حرام و ممنوع چیزوں اور

کاموں میں مال خرچ کرنا خواہ کتنا ہی تھوڑا ہو اِسراف کی تعریف میں آتا ہے، اِسی طرح طعام وخوراک لباس و پوشاک اور مکان و فرنیچر، ضروری سواری پر حد سے زیادہ خرچ کرنا بھی اسراف کے تحت آتا ہے۔

اور پھر یہ دوسرا اسراف تفاخر کے جذبے اور اپنی شان و دولت مندی کے اظہار کی غرض سے ہو تو وہ دُگنا جرم بن جاتا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ بغیر کسی دینی مصلحت اور مہمان کی ضیافت کے ایک سے زیادہ کھانے پکانا، نیز ضرورت دو روٹیوں کی ہو اور تین پکوانا یا خریدنا، اسراف ہے، ضرورت وحاجت سے زیادہ کپڑے و لباس بنوانا جو بکسوں اور الماریوں میں پڑے پڑے ضائع و بے کار ہو جائیں اور کبھی اُن کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئے، اسراف ہے، ایک سادہ مکان، لیکن جو ضرورت سے زائد ہو یعنی ضرورت دو کمروں کی تھی اور تین بنوا لیے یا ضرورت چار کمروں کی تھی اور پانچ بنوا لیے یا خرید لیے تو یہ بھی اسراف ہے۔

مقامِ افسوس ہے کہ مسلمان اسراف کے معاملے خصوصاً مکانوں کے اسراف کے معاملے میں اتنے زیادہ آگے نکل چکے ہیں کہ اب اُن کو اعتدال پر لانا بہت مشکل بلکہ ناممکن و محال ہو کر رہ گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ غنی و مالدار مسلمان اسلام کی اس تعلیم کو تقریباً بھُول چکے ہیں جو اسراف و تبذیر سے متعلق اور اسلامی معاشیات میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آج اچھے خاصے مسلمان جو نماز، روزے، زکوٰۃ کے پابند حج و عمرے کرتے چلے جا رہے ہیں، تکاثر و تفاخر کے جنون میں مبتلا اور معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی فکر و کوشش میں منہمک و مستغرق ہیں اس کا نتیجہ وہ بد ترین صورتِ حال ہے جس سے آج ہر جگہ مسلمان معاشرے اور نام نہاد اسلامی ممالک دوچار ہیں۔ اور زعماء مصلحین حضرات کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس صورتِ حال کی اصلاح ہو تو کیسے ہو، کیوں کہ بعض حضرات اس کے لیے جو کوششیں فرما رہے ہیں اُن سے نہ صرف یہ کہ مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے بلکہ صورتِ حال مزید بگڑتی چلی جا رہی ہے، ضرورت ہے کہ مرض کے اصل اسباب کو پُوری طرح سمجھ کر ایسا علاج تجویز کیا جائے جس کا فائدہ عارضی نہ ہو بلکہ مستقل و پائیدار ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی اصلاحات

جناب محترم مولانا عبدالقدوس ہاشمی

الحمد للّٰہ وحدہ و الصلوٰۃ و السلام علی النبی الذی لا نبی بعدہ

دنیا میں ایسی تحریکیں بہت ہی کم پیدا ہوئی ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہو۔ کوئی تحریک صرف ایک پہلو کو متاثر کرتی نظر آتی ہے اور کوئی تحریک دو پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور بعض تحریکوں کا تو مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہلو کی اصلاح ہو جائے۔ کوئی محض ایک پہلو مثلاً سیاسی صورتِ حال کی اصلاح چاہتی ہے اور کوئی بڑھتی ہوئی مادی وابستگی اور عیش کوشی سے لوگوں کو دُور رکھنے کی ہدایات پر اپنا سارا زور صرف کر دینا پسند کرتی ہے۔ ایسی ہی یک رُخی اصلاحی تحریکوں میں سے چین کے بوڑھے فلسفی لاؤزے کی تحریک تاؤ مت، ایران کے عظیم المرتبت فلسفی زردشتِ اعظم کی تحریک، شری دھمان مہابیر جی کی تحریک جین مت اور گوتم سدھارتھ یا مہاتما بدھ کی تحریک بُدھ مت وغیرہ ہیں۔

اسلام ایسی کوئی یک رُخی تحریک نہیں ہے بلکہ ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں جس طرح زندگی بسر کرنے کی ہدایات دی تھیں اُن ہی کا نام اسلام ہے۔ قرآن مجید میں تو بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ دین ہمیشہ سے اسلام ہی رہا ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی تیرھویں آیت میں وضاحت کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے کہ جو شریعت تم کو دی جا رہی ہے اور جو دین تمھیں دیا گیا ہے یہ وہی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ لفظ مسلمین کے ساتھ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۷۸ میں بتایا گیا ہے کہ یہ تمھارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملّت ہے۔ اُن ہی نے تمھارا نام مسلمین رکھا ہے۔

ہمیں مذہبی افسانوں اور آثارِ قدیمہ کے ذریعہ سے جو تاریخی معلومات حاصل ہو سکی ہیں وہ بھی یہی بتاتی ہیں کہ بنی نوعِ انسانی کا اوّلین مذہب توحید تھا۔ یعنی مونوتھزم ہی انسان کا اوّلین مذہب ہے اور اسی عقیدے کے ماتحت انسانوں کے اعمال و حرکات میں تنظیم پیدا ہوتی ہے۔ اقوامِ قدیمہ کے افسانوں میں اسمائے معرفہ بدلے ہوئے تو ملتے ہیں، لیکن عقیدۂ توحید کامل یا ناقص صورت میں ہر قوم میں موجود ہے۔

اس کے بعد قوموں نے صفاتِ الٰہی کی تجسیم کی یا مخلوقات میں صفاتِ الٰہی کو مرکوز کیا، اس طرح عقائد و افکار میں خرابیاں پیدا کیں اور ان افکار کے زیرِ اثر اعمال و حرکات وجود میں آئے۔ ہر قوم میں ہادی درہ نُما آئے اور اُنھوں نے اوّل عقائد کی اور پھر اعمال کی اصلاح کی۔

چُوں کہ انسانی اعمال کا ایک بڑا بلکہ بہت بڑا حصّہ انسان کی معاشی جد و جہد ہوتا ہے، اس لیے لازمی طور پر خرابیاں سب سے زیادہ اُس کے معاشی اعمال میں نمایاں ہوئیں۔ عقائد کی خرابی کا اثر انسان کی اُن حرکات پر پڑا جو ایک آدمی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے لیے کرتا ہے، معاملات میں دھوکا، فریب، لوٹ کھسوٹ، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، چوری اور جیب تراشی وغیرہ، یہ سب انسان کے عقائد کی کمزوری اور خالقِ کائنات پر کامل اعتماد کے فقدان کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسا رکھتا ہے کہ وہ محنت کرنے والے کو اس کا صلہ ضرور دے گا۔ اور اگر اس کا یہ بھی یقین ہے کہ اس کو اپنے اعمال کے لیے ایک دانا و بینا اللہ جل جلالہ کے سامنے جواب دہ ہونا ہے تو اس کی معاشی جد و جہد اس قسم کے اعمال کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے جس دور میں پیدا ہوئے وہ اجتماعِ نوعِ انسانی کے پھیلاؤ کا وسیع ترین دور تھا۔ مشرق و مغرب میں تجارتی تعلقات پوری طرح قائم ہو چکے تھے۔ ساری دنیا کے لوگوں میں مقامی اور بین الاقوامی لین دین ہونے لگے تھے۔ دنیا میں بڑی بڑی حکومتیں اور بادشاہیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ شان و شکوہ اور اسراف و تبذیر کی بدترین صورتیں موجود تھیں۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا دینِ اسلام اور حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت پھر سے اور مکمّل صورت میں قائم کی جائے تو عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ معاشی جد و جہد اور معاملات کی بھی اصلاح کی جائے۔ اگر اس کی طرف پوری توجہ نہ دی جاتی تو انسانیت کا بڑا نقصان ہوتا اور دینی نظام ناقص کا ناقص رہ جاتا، اس لیے آخری پیغمبرِ اسلام نے عقائد و عبادات کے بعد سب سے زیادہ توجہ معاشی اصلاحات کی طرف مبذول فرمائی۔

معاشیات کی اہمیت

معاشی اصلاحات پر گفت گو کرتے ہوئے سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی اعمال میں معاشی جد و جہد کو کیا مرتبہ دیا جائے؟ کیا تقربِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے معاشی جد و جہد سے کنارہ کش ہو کر مٹھوں، درباروں اور خانقاہوں میں بیٹھ رہنا ضروری ہے، یا تعذیبِ نفس کرنا، ترکِ دنیا کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کرنا مفید ہے؟ انسان نے یہ صورتیں پیدا کر رکھی تھیں، حال آں کہ اسے خبر تھی کہ یہ ساری صورتیں فطرت کے خلاف جنگ کی ہیں۔ سارے انسان تو کیا ایک فردِ واحد بھی پوری طرح ترکِ دنیا

نہیں کرسکتا، وہ اگر صحرا نشین ہوجائے گا پھر بھی اس کے گرد و پیش دنیا ہی ہوگی، وہ معاش کے معروف طریقوں کو چھوڑ بھی دے گا تو بارش، دھوپ اور سردی سے بچنے کے لیے کسی کھوہ اور غار کی ضرورت باقی ہی رہے گی۔ وہ پیاس بجھانے کے لیے چشمۂ آب تک ضرور جائے گا اور بھوک میں جنگلی پھل ضرور توڑے گا۔ وہ دہارا میں رہ کر بھیک پر گزارا تو کرے گا، لیکن بھیک دینے والوں کو بھیک دینے کے لیے معاشی جدو جہد کرنی ہی پڑے گی۔ ایک بزرگ کسی خانقاہ میں چلّہ و مراقبہ تو کریں گے، لیکن ان کے لیے ضروریاتِ زندگی بہت سے مریدوں کی معاشی جد و جہد ہی سے مہیّا ہوسکیں گی۔

انسان نے اپنی نادانی سے جو یہ تصور قائم کررکھا تھا کہ معاشی جدوجہد تقربِ الٰہی کے راستے میں حائل ہے تو حضور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح کی، اور بار بار یہ وضاحت فرمائی کہ معاشی جدوجہد کا مرتبہ عباداتِ الٰہی کے برابر ہے، بلکہ کسبِ حلال خود اپنی جگہ پر ایک عبادت ہے۔ بندۂ مومن کو روزی کمانے کا دُنیوی فائدہ ہی نہیں بلکہ اُخروی ثواب بھی ملے گا۔ کسبِ حلال اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اس کی خلاف ورزی معصیت اور گناہ ہے۔ معاشی جدوجہد تقربِ الٰہی کی راہ میں حائل نہیں بلکہ تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ ایک بندۂ مومن حلال مال کے لیے جو محنت کرتا ہے، اس کی وجہ سے وہ اللہ کا پیارا اور حبیب ہوجاتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ:

(۱) جو ایک پودا بھی زمین پر لگاتا ہے وہ نیک عمل کرتا ہے جس کے صلے میں وہ جنت کے باغوں کا مستحق قرار پاتا ہے۔ (زراعت)

(۲) ایماندار تاجر قیامت کے دن عرشِ اعظم کے سائے میں جگہ پائے گا۔ (تجارت)

(۳) محنت اور مزدوری کرکے حلال روزی کمانے والا اللہ تعالیٰ کا حبیب دوست ہوتا ہے (محنت)

اسی طرح رزق حاصل کرنے کے جتنے ذرائع جائز ہیں، ان سب کی تعریف فرمائی۔ لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ان ذرائع کو اختیار کریں اور رزقِ حلال حاصل کریں۔ یہی خالقِ کائنات کا حکم ہے اور انھیں صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بڑا صلہ ملے گا۔

صرفِ دولت

دوسرا اہم سوال جو کچھ ہم کمائیں اُس کے صرف کرنے کا ہے۔ انسان کی ضروریات اور ان کی تکمیل کے لیے دولت کی پیدائش، یہ ایک اہم سوال ہے۔ انسان نے اس میں بڑی بڑی خرابیاں پیدا کر رکھی ہیں، اور ان کی وجہ سے معاشرۂ انسانی میں بے پناہ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ضروریاتِ انسانی کی اگر صحیح تبویب و تقسیم کی جاتے تو حسبِ ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) ضروریاتِ زندگی:۔ یعنی ایک انسان کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی زندگی کے لیے جن چیزوں

کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً غذا، پانی، مکان، لباس، دوا وغیرہ وغیرہ۔

(۲) ضروریاتِ کارکردگی: یعنی ایک آدمی کو اپنا کام جاری رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کسان کے لیے ہل، بیل، ٹریکٹر وغیرہ، صنعت کار کے لیے اوزار، آلات وغیرہ، تاجر کے لیے گودام اور سائبان وغیرہ۔

(۳) ضروریاتِ توانائی یا ارجاعِ توانائی:۔ یعنی آدمی اپنی حرکات میں اور جدوجہد میں اپنی توانائی کا جو حصہ صرف کرتا ہے، اس کے پھر سے واپس لانے کی تدابیر کے سلسلے میں جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں مثلاً سیر، تفریح، ورزش وغیرہ۔

ان تینوں اقسامِ ضرورت کو شریعتِ اسلامی نے قبول کیا ہے۔ اور ان کی تکمیل کے لیے جدوجہد کو محمود اور قابلِ تعریف قرار دیا ہے۔ البتہ ان کی تکمیل کے سلسلے میں اعتدال سے باہر قدم رکھنے کی ممانعت کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال کی راہِ مستقیم پر رہنے کے سلسلے میں بہت سی ہدایات دیں مثلاً کھانے پینے میں حرام و حلال کی پابندی قائم رکھو۔ ایسا مکان نہ تعمیر کرو جو ضرورت سے زائد ہو اور جس میں سکونت مقصود ہی نہ ہو۔ جب خود کھاؤ پیو تو یہ یاد رکھنا کہ ہمسایہ بھوکا تو نہیں ہے۔ سائل اور محروم کے حق سے غافل نہ ہو جاؤ۔ قرابت داروں کے حقوق و ضروریات یاد رکھو اور اُن کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کرتے رہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان تینوں مباح ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے سلسلے میں اعتدال کا دامن چھوٹنے کے بعد کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اُن کے معلوم کرنے کے لیے کسی کو عظیم مفکر یا فلسفی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ذی ہوش اپنے گرد و پیش نظر ڈال کر بہ آسانی معلوم کر سکتا ہے کہ بے اعتدالی کی وجہ سے کس قدر رشک و حسد مخاصمت اور دشمنی اور سب سے زیادہ معاشی ناہمواری پیدا ہوتی ہے۔ شداد کی طرح لوگ جنتِ ارضی تعمیر کرنے اور مہاراجہ دربھنگہ کی طرح سورگ بھون بنانے کے سلسلے میں کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ رنگ محل کی تعمیر اور رپانی محل بنوانے میں کتنے مزدوروں سے بغیر ادائے اُجرت بیگار لی گئی۔ شہزادی کلوپٹرا، روم کی ملکہ اور خود مسلمان شہزادی شجرۃ الدر کے ملبوسات کی تیاری میں کاریگروں پر کیا گزری۔

ان تینوں ضروریات کے علاوہ آدمی دو اور قسموں کے ماتحت اپنی دولت کو صرف کرتا ہے۔ قرآن مجید نے ان دونوں صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ حکمِ الٰہی ان کی ممانعت کی اور لوگوں کو اس سے بچایا۔ یہ دونوں صورتیں اصطلاحِ قرآنی میں **اسراف** اور **تبذیر** کہلاتی ہیں۔

(۱) اسراف یہ ہے کہ جہاں پر جتنی خرچ کی ضرورت ہو، اس سے زیادہ خرچ کیا جائے، چاہے وہ کام اچھا ہی ہو، قابلِ تعریف ہو مگر اس میں ضرورت سے زائد خرچ اسراف ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا:

س :- کیا وضو کرنے میں بھی اسراف ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا۔

ج :- ہاں! اگرچہ تم ایک بہتی ہوئی ندی ہی کے کنارے پر وضو کر رہے ہو۔

جواب بالکل واضح ہے۔ وضو جیسے عملِ عبادت میں بھی پانی ضرورت سے زیادہ صرف کیا جائے تو یہ عمل اسراف ہوگا۔ اور اسراف کی اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں صریح ممانعت فرمائی ہے لیکن اس جواب کی بلاغت پر غور کیجیے فنِ معاشیات کا ایک سوال اس سے حل ہو جاتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ رسد اگر کثیر ہو تو کیا طلب کو بھی بڑھا دینے کی اجازت ہے؟ میں تو کوئی ماہرِ معاشیات نہیں۔ ایک ماہرِ معاشیات اس کے خطرات سے پوری طرح واقف ہے کہ طلب کی زیادتی کا اثر قیمتوں پر، دورانِ زر پر اور افراطِ زر پر کیا پڑے گا۔

(۲) ناجائز خرچ و اخراجات کی دوسری قسم تبذیر ہے۔ لغت میں تبذیر کے معنی ہیں کھیتوں میں بیج کا چھٹنا اور پانی کو ایسا گندہ کر دینا کہ پانی کا رنگ بدل جائے۔ اصطلاحِ شرعی میں اس کے معنی ہیں مال کا بیجا صرف کرنا، اپنے اس خرچ کی نمائش کرنا، اور اس پر فخر کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں عملِ تبذیر سے اپنی نفرت کا اظہار فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شدت کے ساتھ ممانعت کی، بلکہ لوگوں کی عادتوں کو بدل دیا۔ ہمیں دولت مند صحابہ کرام مثلاً حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ وغیرہ کے اعمال میں کہیں تبذیر کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔

ان پانچوں محلِ اخراجات کی آپ نے اپنے قول و فعل کے ذریعہ سے پوری طرح وضاحت کی، اور جائز و ناجائز اخراجات و مصارف کے مابین ایسا خطِ فاصل کھینچ دیا کہ حضرتِ معاویہ بن ابی سفیانؓ لکھ پتی باپ کے لکھ پتی فرزند بھی اپنی خلافت و جلالت کے دور میں پیوند لگا ہوا کرتا پہن کر سڑک پر چلنے اور مسجد میں نمازوں کی امامت کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے، حال آں کہ ان سے پہلے کے خوش حال لوگ جو دولت و جلالت میں ان سے بدرجہا کم تر تھے، اعلا درجے کا لباس اور قیمتی چادر دوش پر ڈالے بغیر نکلنے میں شرماتے تھے۔ ابوجہل بن شرحبیل، ابولہب بن عبدالمطلب اور جبلہ بن ایہم کبھی یہ نہیں برداشت کرتے تھے کہ گھٹیا لباس میں لوگوں کے سامنے آئیں۔ یہودی دولت مند، ابوالحقیق، عبداللہ بن ابی، حُیی بن اخطب ہمیشہ اپنی دولت کے مظاہرے کیا کرتے تھے۔ اور جاہلی معاشرے کی ہمیشہ سے یہی کیفیت تھی کہ اسراف و تبذیر پر فخر کیا جاتا تھا۔ جاہلی عرب شاعری کا سارا ذخیرہ اس پر شاہد ہے کہ وہ کس طرح اسراف و تبذیر میں مبتلا تھے۔

پیدائشِ دولت

صرفِ دولت کی اس مختصر سی بحث کے بعد ہم جب پیدائشِ دولت پر غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ

اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصلاحی ہدایات دیں اور اُن پر جس پابندی کے ساتھ عمل کرایا اُس نے معاشیات کی بگڑی ہوئی شکل کو اصلاحات کے ذریعہ سے سنوار کر خوش نما بنادیا۔ ورنہ حرص کے داغ سے پیدائشِ دولت کی جدوجہد کا چہرہ ہمیشہ گھناؤنا رہا ہے۔

آج کل فنِ معاشیات میں عواملِ پیدائشِ دولت چار یا پانچ بتائے جاتے ہیں۔ یہ محض دقت پسندی ہے حقیقۃً نہ سرمایہ عامل پیدائش ہے اور نہ ذہن منتظم اور نہ حوصلۂ کاربار۔ سرمایہ پچھلی کسی محنت کا غیر صرف شدہ، بچا ہوا حصہ ہے اور ذہن منتظم و حوصلہ انسانی محنت کی ایک قسم ہے۔ حقیقی عواملِ پیدائشِ دولت صرف دو ہیں، ایک زمین اور دوسرا انسان یعنی محنت۔ اس واقعیت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہم جن اشیا سے اپنی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں وہ سب بلا استثنا، زمین یا معاشی زبان میں اصل قائم سے براہِ راست یا بالواسطہ ہمیں حاصل ہوتی ہیں۔ اور اُنھیں ہماری ضرورت میں کام آنے کے قابل جو طاقت بناتی ہے وہ انسانی محنت ہے۔ اس لیے حقیقی عوامل صرف دو ہیں: زمین اور انسان۔ یہ دونوں عوامل ایسے ہیں کہ ان کے پیدا کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ تمام تر رب العلمین کا عطیہ ہیں شاید اسی حقیقت کو یاد رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی اولین سورہ کی اولین آیت میں اپنا تعارف کسی اور صفتِ الٰہیہ کے ذریعے سے نہیں کرایا بلکہ الحمد للہ رب العلمین کہا۔ ساری تعریفیں اس اللہ کو سزاوار ہیں جو سارے عالم والوں کا پالنے والا ہے۔ اور شاید اسی لیے بار بار یہ حقیقت یاد دلائی گئی ہے کہ زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، بادل، بارش، کھیت، باغ، جانور، اور وہ نطفہ بھی جس سے انسان پیدا ہوتے ہیں اللہ جل شانہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ کسی انسان کے بس کی بات نہیں کہ ان میں سے کچھ بھی بنا سکے۔ یہ عقیدہ و ایمان ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت و واقعہ ہے جس سے انکار ہٹ دھرمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس واقعیت کے اثرات و نتائج کو دیکھیے علم المعیشت میں اس سے انقلابِ عظیم بپا ہوگیا۔ اور بہ قول مرحوم علامہ اقبال ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی کسی شے میں محنت کرکے روزی کمانے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے اور جب وہ اپنی محنت سے اس شے کو ضروریات میں سے کسی ضرورت کی تکمیل کے قابل بنالے تو پھر اُس شے کا مالک ہے اور اُسے حق حاصل ہے کہ کسی کو مفت دے دے یا بتراضی طرفین اُس کے ہاتھ فروخت کردے۔ اسی لیے ہدایتِ نبویؐ کے بموجب دریا یا تالاب کے پانی پر، خودرو گھاس اور پھل پھول وغیرہ پر، نیز جو پکڑ کر یا پال کر کسی نے نہ رکھے ہوں۔ ایسے جانور اور پرندوں پر کسی شخص کا کوئی ترجیحی حق نہیں ہوتا اور کسی کو یہ حق

حاصل نہیں کہ دوسروں کو اس سے استفادہ کرنے سے روکے۔

تبادلۂ دولت

ہر شخص جو کچھ زمین یا باغ سے پیدا کرے یا اپنی صنعت و حرفت سے بنائے اُس کو خود ہی خرچ کر دے، نہ ایسا ممکن ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ضرورت مند تک ان تمام چیزوں کو دُور دراز سفر کر کے خود پہنچائے۔ اس لیے تبادلۂ دولت کے ایسے قواعد و ضوابط ضروری ہیں کہ کاشت کار صناع یا صرف کنندہ پر ظلم نہ ہو سکے۔ اس کا بنیادی اصول قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تبادلۂ دولت باہمی رضامندی سے ہو۔ ظلم و تعدی یا دھوکا و فریب کی آلودگی اسے ناپاک نہ بنا دے۔ اگر کوئی تبادلۂ دولت کے اس بُنیادی اصول کی خلاف ورزی کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اُس شخص کو سزا دیں۔ "سورۃ المائدہ" کی آیت ۳۳ میں ہر فسادی کو سزا دینے کا ذکر موجود ہے۔ مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ فسادی کو سخت سے سخت سزا دیں۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بلا واسطہ یا بالواسطہ ایسی صورت پیدا کرے جس میں خریدار خریدنے پر یا فروشندہ فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اسی طرح ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور کسی چیز کو اُس کا نقص بتائے بغیر فروخت کرنے کی ممانعت ہے اور یہ سارے جرائم دنیا میں قابلِ سزا اور آخرت میں موجبِ عذابِ عظیم ہیں۔ ہر اُس مقام پر جہاں مسلمان با اقتدار ہوں مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ایسے مجرموں کو سزائیں دیں اور معاشرے سے ان جرائم کو دفع کریں۔

تبادلۂ دولت میں اتنی اصلاحات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہیں کہ ان سب کا تفصیلی بیان کسی ایک مختصر سے مضمون میں نہیں سما سکتا، لیکن مندرجہ بالا حکم کے علاوہ تین احکام وہ ہیں جن کا مختصر بیان ضروری ہے:۔

(۱) **سٹّہ کی بالکُلیہ ممانعت:**۔ فروخت کی جانے والی چیز اور اُس کی قیمت دونوں کی غیر موجودگی میں ہر بیع یا معاہدۂ بیع ناجائز ہے۔ بڑی سختی سے ایسی بیع یعنی معاملۂ خرید و فروخت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے بھی سٹہ نہایت ہی غیر عادلانہ اور نقصان رساں معاملہ ہے۔ اس کی وجہ سے ضروری اشیا پیدا کرنے والے کو کم سے کم قیمت ملتی ہے اور صارف کو اشیائے صرف کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ صورت غیر منصفانہ بلکہ صریحاً ظلم ہے، اس کی آپؐ نے ممانعت فرما دی۔

(۲) **سُود کی حُرمت:**۔ سُود جسے عربی میں ربٰو کہتے ہیں، اس کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں اور ہر صورت میں سُود حرام ہے، چاہے سُودی قرض لینے والے نے اسے اپنی ذاتی ضرورت کے لیے لیا ہو

یا کاروباری ضرورت کے لیے، چاہے ربٰوا الفضل ہو یعنی اصل قرض دی ہوئی رقم پر کوئی اضافہ وصول کیا جائے یا ربٰوا النسیہ ہو یعنی کوئی شے فروخت کر کے یہ شرط لگادی جائے کہ اتنی مدت کے اندر اس کی قیمت ادا نہ کی جائے تو اس قدر زیادہ رقم ادا کرنی ہو۔ سُود ہر صورت میں حرام ہے۔ اور اس شدّت کے ساتھ اس کی حُرمت بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ حُرمت کا حکم آجانے کے بعد بھی سُود لیں تو اُن کے خلاف اللہ ورسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

سُود میں اضافہ بہ مقابلۂ وقت تسلیم کیا جاتا ہے۔ حال آں کہ یہ قانون فطرت کے بالکل برخلاف ہے۔ کسی سرمایے میں بہ مقابلۂ وقت کوئی اضافہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ قانون فطرت کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ سُود کا ہر معاملہ یک طرفہ معاہدہ ہوتا ہے اور یک طرفہ معاہدہ دنیا کے کسی قدیم وجدید اصولِ قانون میں جائز نہیں ہے۔ سُود کے ذریعے سے اشیائے صرف کی قیمتوں میں غیر حقیقی اضافہ ہو جاتا ہے جس کا بوجھ غریب صارف پر پڑتا ہے۔ سُود کی وجہ سے دولت کا بہاؤ ایک خاص طبقے کی طرف ہو جاتا ہے اور شدید معاشی ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ سُود کی وجہ سے ساہوکار معاشی جدوجہد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور دوسروں کی کمائی مفت کھاتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک سُود خوار معاشرے کا ایک بے عمل فرد بن جاتا ہے۔ اس لیے معاشی سُوجھ بُوجھ کا یہی تقاضا ہے کہ سُود کی حُرمت پر زور دیا جائے اور اس لعنت سے معاشرۂ انسانی کو نجات دلائی جائے۔

آں حضرتؐ کی دیگر معاشی اصلاحات سے صرفِ نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو سُود کے خلاف جو آیاتِ قرآنی نازل ہوئیں اور آپؐ نے جس شدّت کے ساتھ اس پر عمل کرایا یہ بہت بڑی اصلاح اور معاشی نقطۂ نظر سے بڑا دُور رس انقلابی اقدام ہے۔

(۳) قانونِ وراثت:۔ قانونِ وراثت خود اپنی جگہ پر بڑی اہم معاشی اصلاح ہے۔ قدیم اقوام میں عام طور سے وراثتِ اکبر جسے انگریزی میں پرائموجنیٹریشن کا قاعدہ کہا جاتا ہے، رائج تھا۔ ایران میں، روم میں، چین میں اور ہندستان میں یہ طریقہ رائج تھا کہ باپ کی وفات پر صرف اُس کی سب سے بڑی اولاد وارث ہوتی تھی، دوسری اولاد کو یا وارثوں کو وراثت سے محروم سمجھا جاتا تھا اور چین وہند میں تو عورت کبھی وارث ہوتی ہی نہ تھی۔

اس ناانصافی کی اصلاح قرآن مجید نے اس طرح کردی کہ تفصیل کے ساتھ وارثوں کے حصّے مقرّر کر دیے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ دولت مال دار کی وفات کے بعد خود بہ خود تقسیم ہوگئی اور بڑی بڑی جائیدادوں کے وراثتی دولت مندوں کا کاہل و بے عمل طبقہ ختم ہوگیا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ دو بھائیوں اور بھائی بہنوں کے مابین محبت والفت کے رشتوں کو باقی رہنے کا موقع میسّر آگیا۔ ورنہ وراثتِ اکبر اور عورتوں کی وراثت سے

بالکلیہ محرومی نے بھائی بہنوں کے مابین محبت والفت کو جس طرح تباہ کیا ہے وہ ایک بڑی دردناک داستان ہے جس سے تاریخ کا ہر طالبِ علم واقف ہے۔

اسلام کے قانونِ وراثت پر جن مسلم و غیر مسلم علماء سے میری گفت گو ہوتی ہے اُن سب نے اس کی تعریف کی ہے بجز ایک رُوسی سفیر صاحب کے، جنھوں نے فرمایا کہ دُنیا میں کسی قانونِ وراثت کی ضرورت ہی نہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ رُوس میں بھی قانونِ وراثت ہے مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ اُن کا شخصی خیال ہے جس کے قائم کرنے میں وہ یہ بھول گئے کہ قانونِ وراثت مرنے والے کی آخری تمنّا کی تکمیل ہے، اب تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا جس کی مرتے ہوئے یہ تمنّا نہ ہو کہ وہ جو کچھ چھوڑ کے جا رہا ہے چاہے وہ ایک پُرانا کمبل ہی کیوں نہ ہو، اس متروکہ سے اُس کی وفات کے بعد وہ لوگ فائدہ اٹھائیں جو زندگی میں اُس کے پیارے اور قریبی رشتہ دار تھے۔

البتہ بعض مسلمان بھائیوں نے اسلامی قانونِ وراثت پر دو اعتراضات کیے۔ دو ایک حضرات نے تو صرف اس موضوع ہی پر تفصیلی گفت گو فرمائی۔ مختصرًا اس کی توضیح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ دوسرے اہلِ علم بھی صحیح طور پر بات کو سمجھ لیں۔

(۱) پہلا اعتراض یہ تھا کہ قانونِ وراثت میں یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے محروم کیوں قرار دیا گیا ہے جب کہ مورث کا دوسرا بیٹا موجود ہو تو پوتا محروم ہو جاتا ہے۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قانونِ وراثت میں بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے کیوں دیے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض اس لیے ذہن میں آسکا ہے کہ وصیت اور وراثت کے سارے قانون پر غور نہیں کیا گیا ورنہ بات سمجھ میں آجاتی۔ اور جب اُن کے سامنے وصیت کے متعلق بتایا گیا تو معترض کی سمجھ میں بات آ گئی۔ ان دو امور پر غور کیجیے:

ہر شخص پر واجب ہے کہ اگر وہ ضرورت سمجھے تو مال متروکہ کی ایک تہائی تک پوتے یا کسی غیر وارث کے لیے وصیت کر دے۔ اور وصیت اتنی ضروری چیز ہے کہ حسبِ فرمانِ نبویؐ کسی مسلمان پر ایک رات بھی نہ گزرنے پائے جب کہ اُس کا لکھا ہوا وصیت نامہ تیار نہ ہو۔

ولایت کا قبول کرنا اختیاری امر نہیں بلکہ لازمی اور اجباری ہے۔ کوئی چچا اپنے یتیم بھتیجے کا ولی بننے سے انکار کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اگر چچا کی مالی حالت کمزور ہو اور بھتیجے کی پرورش و پرداخت کا بوجھ نہ برداشت کر سکتا ہو تو اس کی درخواست پر بیت المال سے مناسب امدادی وظیفہ بطور استحقاق اُسے دیا جائے گا۔ چچا پر فرض ہے کہ وہ اپنے یتیم بھتیجے کی اپنی اولاد کی طرح پرورش و پرداخت کرے۔ حکومت کی انتظامیہ

اور عدلیہ دونوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چچا کو اس ولایت کے لیے مجبور کرے۔

ان دونوں احکام کو یعنی وصیت اور ولایت کو دیکھیے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ قانونِ وراثت نے یتیم پوتے کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اُس کو ہر طرح تحفظ عطا کیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسے مرحوم باپ کا جانشین قرار دے کر وارث کیوں نہ قرار دیا گیا؟ تو اس میں بہت سی خرابیاں تھیں منجملہ ان کے دو خرابیاں تو ظاہر ہیں: ایک یہ کہ جو بیٹا مورث کا زندہ ہے وہ بغیر کسی وجہ کے آدھی وراثت سے محروم ہو جاتا اور اس امکان سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چچا کے دل میں جو یتیم بھتیجے کی محبت ہوتی ہے وہ اس کے مقابلے کی وجہ سے متاثر ہوتی، حال آں کہ پوتے کو بہر حال اپنے چچا ہی کی ولایت میں جوان ہونا اور پروان چڑھنا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہی باپ کی وراثت کا مستحق ہے۔ یہ اصول ہی قائم نہیں رہتا اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ مثلاً زید کے دو فرزند تھے۔ ایک حامد اور دوسرا محمود، حامد کا ایک فرزند ہے علی۔ پہلے حامد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے متروکہ مال میں حامد کے بھائی محمود کو حامد کے فرزند علی کے ہونے کی وجہ سے کوئی حصہ نہ مل سکا اور وہ علی کے باپ حامد کی وراثت سے محروم ہو گیا۔ اب تھوڑے دنوں کے بعد محمود کے باپ زید کی وفات ہوئی تو محمود اپنے باپ کا وارث ہوا۔ علی اپنے باپ حامد کا وارث ہوا تھا۔ اور محمود محروم ہو گیا تھا تو یہ کیسا انصاف ہوا کہ محمود کے باپ زید کا وارث علی ہو اور علی کے باپ حامد کی وراثت سے محمود محروم ہو پھر بھی، چچا ہونے کی وجہ سے علی کی ساری ذمّے داری محمود پر عائد ہو جاتے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصّے کیوں ملتے ہیں۔ اس کے لیے بیٹا اور بیٹی کی کیفیت پر غور کیجیے۔ بیٹے کو اپنی بیوی اور بال بچوں کا کفیل ہونا ہے یا اس وقت کفیل ہے، اُس کو مالی استواری کی ضرورت بیٹی سے زیادہ ہے۔ بیٹی اور اُس کی اولاد کی کفالت اُس کے شوہر کے ذمّے ہے، خود اُس کی اپنی ذات کا بار بھی اُس پر نہیں ہے۔ یہ کتنی بڑی بے انصافی ہوتی کہ اخراجات کا بوجھ جس پر ہے اس کے برابر حصہ پاتا جس کا اپنا بوجھ بھی دوسرے شخص پر ہے۔ کوئی دانش مند ایسا غلط فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے قرینِ انصاف اور تقاضائے ضرورت دونوں کا فیصلہ یہی ہے کہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنی وراثت ملے۔

غرض یہ کہ اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے ہر رُخ کی اصلاح فرمائی تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپؐ معاشی زندگی کی اصلاح نہ فرماتے۔ انسان کی ساری حرکت صرف معاشی نہیں ہوتی ہے، لیکن ہر انسان کے اعمال میں معاشی جہد کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ آپؐ نے بڑی توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور ایسی معاشی اصلاحات جاری فرمائیں جن کی وجہ سے حقیقتہً ایک نمونہ کا صالح معاشرہ پیدا ہو گیا۔ کاش کہ ہم مسلمان اپنی غفلت سے بیدار ہوں اور پھر سے ان ساری اصلاحات پر خلوص کے ساتھ عمل کر کے نمونے کا معاشرہ پیدا کر دیں۔

تزئینِ اخلاق میں تعلیم و تربیت کا مقام

جناب محترم الحاج کفایت اللہ

ایک عربی شاعر نے کہا ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ :

"جس کے دل میں درد ہوتا ہے وہ کوئی ایسی چیز تلاش کرتا ہے جس سے اس کا درد دُور ہو جاتا ہے۔"

صاحبانِ فکر و نظر ہی نہیں، کراچی سے طورخم تک افرادِ ملّت اس کے شاہد ہیں کہ حکیم محمد سعید اور ان کے رفقاءِ ہمدرد کو عرصۂ دراز سے ملّت کے انتشارِ ذہنی و فکری اور اس کے نتیجے میں انتشار اور افتراقِ ملی کا بے حد قلق ہے۔ پس انھوں نے مذاکرۂ ملی اخلاقیاتِ نبوی کا اہتمام کیا۔ آج ملک بھر کے درد مند حلقوں کی نگاہیں اس مذاکرۂ ملی پہ مرتکز ہیں۔ اور وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ ملک کے ممتاز علما و اہلِ علم اصلاحِ اخلاق کے سلسلے میں کیا علاج تجویز کرتے ہیں۔ اور مجھے جب یہ دعوت نامہ ملا تو آنے میں بے حد خوشی ہوئی۔ وہ اس لیے کہ میرے ذہن کے مطابق مجھے اصلاحِ اخلاق کا ایک سہل نسخہ معلوم ہے میرے خیال کے مطابق میرا تحریر کردہ علاج کچھ ایسا ہے کہ جب آپ اس کو لے کر ملکِ عزیز کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ ملک میں اصلاحِ اخلاق کی صورتِ احوال میں بہتری کے نمایاں آثار دکھائی دیں گے۔

اس سے قبل کہ میں وہ علاج آپ کو بتاؤں میں اس کے سہل پن کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کرنا پسند کروں گا۔

بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ بہت سی چیزیں بڑی واضح ہوتی ہیں لیکن دماغ پہلے سے کچھ ایسے دقیق مسائل میں الجھا ہوتا ہے کہ وہ واضح اور نمایاں چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

اب اچھے اور بُرے اخلاق ہی کو لیجیے! کون نہیں جانتا کہ کونسی چیز بُری ہے اور کونسی اچھی۔ خود قرآن کریم گواہ ہے :

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا ۔

(پھر ہم نے اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پہ الہام کر دی)

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۔

(ہم نے انسان کے لیے خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے ہیں)

مقصود و مطلوب یہ ہے کہ جہاں تک اچھے اور بُرے اخلاق کا تعلق ہے تو یہ تصورات تو ہمارے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں۔ ان تصورات سے تو ہماری فطرت آشنا ہے۔ پس مذاکرۂ

ملّا میں توجہ اخلاق کے بجائے اصلاح کی طرف ہونی چاہیے، اور اصلاح بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے ارشادات کے عین مطابق۔ میں اپنے اس عہد پہ قائم ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق اصلاح اخلاق کے سلسلے میں علاج آپ کو بتاؤں گا (انشاء اللہ) لیکن اس سے قبل تزئینِ اخلاق کے سلسلے میں تعلیم و تربیت کے کردار پر بھی میں نے کچھ گفتگو کرنی ہے۔

اصلاحِ اخلاق کے لیے ایک منظم کوشش کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں مکتبوں، مدرسوں، سکولوں، کالجوں، یونی ورسٹیوں، مسجدوں، خانقاہوں کی امداد حاصل کرنی ہوگی۔ لیکن اس وقت میں چار اداروں کے کردار کے بارے میں کچھ کہنا پسند کروں گا کہ میرے نزدیک اصلاح اخلاق میں یہ ادارے بے حد مؤثر رول ادا کرتے ہیں۔ اور میرا ایمان ہے کہ اگر یہ چاروں ادارے مل کر تعلیم و تربیت کی ذمہ داری پوری کریں تو تعلیم و تربیت کا مقصدِ اوّلیں یعنی تزئینِ اخلاق حاصل ہو سکے گا۔ یہ چار ادارے حسب ذیل ہیں:

۱ - گھر کی درسگاہ

۲ - سماج کی درسگاہ

۳ - اصطلاحی درسگاہ (مدرسہ، سکول، کالج، یونی ورسٹی)

۴ - حکومت و ریاست

اب ہم ترتیب وار ایک ایک ادارے کی کارکردگی پر روشنی ڈالیں گے کہ وہ تعمیرِ اخلاق کے سلسلے میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں یا انھیں ادا کرنا چاہیے:

گھر کی درسگاہ

یہ غالباً ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے کہ یو پی کے صدر مقام لکھنؤ میں ایک انسانی بچہ جو بھیڑیوں کے بھٹ میں پلا تھا اور بھیڑیوں کی طرح چلتا پھرتا اور بولتا تھا اور کھاتا پیتا تھا۔ ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ اس بچے کی تعلیم و تربیت کی بہت کوشش کی گئی۔ مگر سب بے سود۔ یہ بچہ اخلاقی لحاظ سے تو درکنار، ظاہری حرکات و سکنات کے اعتبار سے بھی انسان نہ بن سکا۔ یہ المیہ اُسے اس لیے پیش آیا کہ اس بچے کو ابتدا میں انسان بننے کی تربیت نہیں ملی تھی۔ اس واقعاتی مثال سے آپ گھر اور والدین کی تعلیم و تربیت کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے ماہرین کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ بچہ پیدا ہوتے ہی خارجی دُنیا سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ابتدائی چند سالوں میں بچہ جو کچھ اپنے ماحول سے جذب کرتا ہے وہ اس کی آئندہ کی ساری زندگی کی اساس و بنیاد بنتا ہے۔ زبان و طرزِ معاشرت ہی میں نہیں اخلاق، عمل، تہذیب اور مذہب میں بھی بچہ بالعموم اپنے والدین اور گھریلو ماحول کے تابع ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ نے اِس

حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

ما من مولود الا یولد علی الفطرة فابواه یھودانه او ینصرانه او یمجسانه۔

ترجمہ: ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اس گھر کی درس گاہ نے اگر ٹھیک کام کیا تو تعلیم و تربیت کی صحیح اور مستحکم بنیاد پڑ گئی۔ اور اب اس بنیاد پر صحیح عمارت کی اونچی سے اونچی منزل تعمیر کی جا سکتی ہے۔ والدین نے جب بھی اپنی ذمہ داری پہچانی اور پوری کی ہے تو ان کی گودوں میں حضرات اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام جیسے انبیا اور عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن زبیرؓ اور حسین ابن علیؓ جیسے صلحا دجابناز پیروان پڑھے ہیں۔
ڈاکٹر اقبال نے والدین کی تربیت کی اہمیت اس شعر میں کیا خوب واضح کی ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

لیکن اگر گھریلو ماحول فاسد ہو جائے تو دنیا ایسے شیاطین سے بھر سکتی ہے جو دنیا کے امن و سکون کو غارت کریں۔ کسی ماہر نفسیات نے کیا خوب کہا ہے کہ دنیا کے ظالم اور مفسد انسان دراصل شریر اور بگڑے ہوئے بچے ہیں، جن کے ہاتھوں میں زمامِ اقتدار آگئی، اور انھوں نے دنیا کو ظلم و فساد سے بھر دیا۔

سماج کی درسگاہ

انسان کی دوسری تعلیم وہ ہے جو اسے اپنے ماحول اور معاشرے سے ملتی ہے۔ سماج کے اثرات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ ان سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔ پریس، رسائل، اخبارات، کتابوں کی بہتات، سینما، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ذرائع آمد و رفت کی بے انتہا سہولیات، تحریکات، تنظیمات نے پوری دنیا کو ایک سماج بنا دیا ہے۔ اب موجودہ سماج کی کن کن فتنہ سامانیوں کا ذکر کیا جائے اور ان سے بچ کر آدمی کہاں جا سکتا ہے۔ حسن عریاں ہے کہ ہمارا ہر طرف سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ سینما کے فحش گانے بچے بچے کی زبان پر ہیں اور رومانی، فحش اور ڈاکہ زنی کی فلمیں نوجوانوں کے اخلاق و کردار کا ستیاناس کر رہی ہیں۔ ان حالات سے مدہوش اور سرمست ہو کر اگر نوجوان جنسی انارکی کا شکار ہو جائیں تو کیا اس کی ذمہ داری میں سماج برابر کا شریک نہیں؟

اگر سماج کی اصلاح کی جائے تو وہ اصلاح اخلاق کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ایک صالح معاشرہ انسان کو وہ سب کچھ دے سکتا ہے جو کتابوں کے ذخائر اور رسمی درسگاہوں کی لفظی تعلیم نہیں دے سکتی۔ اس واسطے انسانیت کے سب سے بڑے معلم و مربی صلی اللہ علیہ وسلم نے سماج کی اصلاح کو انسان کا اہم فریضہ اور ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ جب بھی سماج میں کوئی برائی سر اٹھائے اسے فی الفور کچل دیا جائے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان

ترجمہ: تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے یا زبان سے بدل دے یا دل سے گویہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

حکومت و ریاست

اصلاحِ اخلاق کے سلسلے میں سب سے مؤثر حکومت و ریاست کا ادارہ ہے۔

الناس علی دین ملوکہم

ترجمہ: لوگ اپنے فرمانرواؤں کے طریقے پر چلتے ہیں۔

پہلے بھی صحیح تھا اور آج بھی درست ہے اور آئندہ بھی حقیقت رہے گا۔ حکومت جس طرف چاہتی ہے لوگوں کو ہنکائے جاتی ہے۔ اگر حکومت کا نظام اور اس کی پالیسی صحیح ہو تو غیر معمولی ذرائع اور وسیع ترین دائرۂ اثرات کی حامل ہونے کے باعث وہ پورے سماج کو درست کر سکتی ہے۔ لیکن اگر حکومت کا نظام فاسد ہے تو وہ پورے سماج کو تعلیمی نظام سمیت، فساد و طغیان کے سیلاب میں بہائے جاتا ہے۔ قرآن مجید ایک صالح حکومت کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے:

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو ہم زمین میں اقتدار بخش دیتے ہیں تو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

اصلاحی درسگاہ

اصلاحی درسگاہ وہ ہے۔ جیسے مدرسہ، سکول، کالج یا یونی ورسٹی کہا جاتا ہے۔ انسان علوم و فنون یہیں آکر حاصل کرتا ہے۔ یہیں اس کی خوابیدہ صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں، اور یہیں پر تربیت پا کر وہ اپنے سماج، اپنے ملک و قوم بلکہ دین کا معلم بن سکتا ہے یا مفسد اور مضل۔ تعلیم و تربیت کی سب سے اہم اور مرکزی کڑی معلمین ہیں۔ نصاب تعلیم ناقص ہو، تعلیمی پروگرام ادھورا ہو، درسگاہ کا ماحول موزوں نہ ہو، لیکن اساتذہ کی شخصیتیں پرکشش اور بہترین ہوں تو ان ساری کمیوں کی تلافی ممکن ہے۔ مگر اساتذہ صحیح نہ ہوں تو یہ کمی کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی یہاں دینی درسگاہوں سے ایسے اساتذہ کو چن چن کر نکال دینا چاہیے جو ہمہ وقت ہمارے طلبہ کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں کہ اسلام کوئی ضابطۂ حیات نہیں، نہ یہ کوئی تہذیب رکھتا ہے نہ تمدن، اور یہ کہ اسلام سیاسی اور معاشی لحاظ سے ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ ایسے اساتذہ سے بڑھ کر عالم اسلام اور اسلامی اخلاق کا غدار کوئی نہیں۔

پیشتر اس کے کہ اب اس علاج کی طرف لوٹوں جس کا ذکر میں نے اوائل میں کیا تھا، میں اپنے مدعا کی وضاحت کے سلسلے میں تاریخ اسلام سے محض دو سرسری واقعات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

ستوؤں کا ایک تھیلا، ایک اونٹ، ایک غلام، ایک لکڑی کا پیالہ ہمراہ لے کر اور اپنی جگہ حضرت عثمان غنیؓ کو مدینہ کا عامل مقرر کر کے حضرت عمرؓ سفر فلسطین پر روانہ ہوتے ہیں، کبھی غلام اونٹ کی مہار پکڑ کر چلتا اور فاروق اعظمؓ اونٹ پر سوار ہوتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس۔ تاریخ انسانی کی عظیم شخصیتوں میں سے کون ہے جو حضرت عمر فاروقؓ کے اس عظیم کردار کی گرد کو بھی پہنچ سکے۔

اب دوسرا واقعہ سنیے! بلکہ آپ اسے متعدد بار سن بھی چکے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک رات دیا جلا کر کام کر رہے تھے اور دیا بیت المال کا تھا اور وہ کوئی سرکاری کام کر رہے تھے کہ اتنے میں کوئی صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے گفتگو شروع کی یہ گفتگو ذاتی معاملات کے متعلق تھی۔ تو آپ نے کہا:

"ذرا ٹھہر جاؤ! پھر آپ نے دیا بجھا دیا اور کہنے لگے کہ یہ بیت المال کا دیا ہے تیل اس

میں بیت المال کا چل رہا ہے، اس لیے ذاتی گفتگو میں یہ دیا نہیں جل سکتا۔"

یہ دو مثالیں دینے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اصلاحِ اخلاق آپ چاہتے ہیں تو آوازہ دینے سے بات نہیں بنے گی۔ ان ہر دو واقعات میں آپ نے دیکھا کہ کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ ہر ایک نے اپنے کردار کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ نہیں کہا کہ سادگی اختیار کرو۔ مسلمان کو اپنا بھائی اور مساوی سمجھو، بلکہ ستووں کا تھیلا بھر کر باری باری اونٹ پہ سواری کر کے اور پیدل چل کر عملاً سادگی اور مساوات کا مظاہرہ قائم کر کے رہتی دنیا تک مثال قائم کی۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ نہیں کہا کہ بے ایمانی نہ کرو، سرکاری اختیارات اور اموال کو ذاتی استعمال میں نہ لاؤ بلکہ یہ عملاً کر کے بتایا اور سمجھایا۔

اگر آپ اخلاقیات نبویؐ کو ملکِ عزیز میں جاری و ساری کرنا چاہتے ہیں تو جیسے میں نے عرض کیا علاج بہت آسان ہے۔ آپ سب کو چاہیے کہ اپنے اپنے گھروں، اپنے اپنے محلوں، اپنے اپنے دفتروں اور اپنے اپنے فرموں میں آج سے ہی اخلاق کا مظاہرہ کیجئے۔ شنید ہے کہ آج کل یورپ میں یہ دعا چل نکلی ہے کہ: O, GOD, REFORM THE WORLD, BUT START WITH ME

انعقادِ مذاکرہ اپنی جگہ درست، تقاریر بھی حیاتِ ملی میں ایک مقام رکھتی ہیں، قرار دادیں بھی اپنی افادیت رکھتی ہیں، لیکن علاج صرف اور صرف یہی ہے۔ کیونکہ کہنے والا کہتا ہے لیکن اگر خود عمل نہ کرے تو نہ صرف یہ کہ اس کے کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ ایسا کردار اللہ تعالیٰ پر بھی بہت گراں گزرتا ہے۔ جیسا ارشادِ خداوندی ہے:

یاایھا الذین امنوا لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون ٥

اخلاقیات نبویؐ کیا ہے؟ اس بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کس قدر مختصر ترین الفاظ میں فرمایا:

کان خُلُقُہُ القرآن

یعنی وہ قرآن کے عملی پیکر اور تفسیر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اسوۂ حسنہ سے اذہان و قلوب میں اسقدر انقلاب بپا کر چکے تھے کہ اس وقت روئے زمین پر ان کی قوم سے زیادہ بہتر اور زیادہ صالح اور کوئی ایسی قوم نہ تھی جو ملی وحدت اور باہمی اعتماد کا قابل تقلید نمونہ پیش کر سکتی ہو۔ ان کے ایک فرد کا پیمان تمام ملت کا پیمان قرار پاتا تھا۔ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو کسی قیمت پر خریدا جا سکتا ہو۔ یہ اس ذہنی تبدیلی کا نتیجہ تھا کہ ایک شخص کو کسریٰ کا تاج ملتا ہے اور وہ اسے اپنی

گدڑی میں چھپا کر لاتا ہے اور بیت المال میں جمع کرا دیتا ہے۔ لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا کیا نام ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میں اس لیے نہیں بتاتا کہ تم میری تعریف کرو گے، جب کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اور میں اس کے ثواب پر راضی ہوں۔ یہ اس قوم کا کردار ہے جو مالِ غنیمت پر ٹوٹ کر اُسے لوٹا کرتی تھی اور جس پر سورۂ انفال شاہد ہے۔

یہ قانونِ فطری ہے کہ جنگ فوجیں نہیں قومیں لڑا کرتی ہیں اور قوموں کا وہ زمانہ سنہری ہوتا ہے کہ جب ان کا ہر فرد مجاہد بننے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ آئیے اللہ تعالیٰ و تبارک کی بارگاہ میں انتہائی عجز و انکسار سے یہ دعا کریں کہ یہ مذاکرۂ ملی، اخلاقیاتِ نبویؐ کو عام کرنے کا ذریعہ بنے تاکہ نازک وقت آنے سے پہلے ملّتِ پاکستانیہ اس فرمانِ ربانی کا مصداق بنے:

وکم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللّٰہ

کتنی ہی قلیل جماعتیں ہیں جو اذنِ اللہ سے جماعتِ کثیرہ پر غالب آئیں۔

اخلاقی تحریک — کیوں اور کیسے

جناب محترم پروفیسر رحیم بخش شاہین

اس وقت ہمارے معاشرے میں اخلاق کی جو حالت ہے اس کو دیکھ کر ہر آدمی پریشان ہے۔ اور اہل پاکستان کے اخلاق کا موازنہ نہ کبھی امریکا اور برطانیہ کے لوگوں کے اخلاق سے کرتا ہے اور کبھی جرمنی اور جاپان کے باشندوں کے اخلاق سے۔ کبھی اہل چین کی اخلاقی ترقی کا ذکر کرتا ہے اور کبھی تقسیم برصغیر پاک و ہند سے پیشتر کے زمانے ہی کو اخلاقی لحاظ سے بہتر اور برتر قرار دیتا ہے۔ یہ ساری تگ و دو صرف یہ ثابت کرنے کے لیے ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی حالت انتہائی مخدوش ہے۔ ہر دردمند آدمی کو حال کے آئینے میں مستقبل کا چہرہ انتہائی بھیانک نظر آتا ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں یہی نظر آرہا ہے کہ اس میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز اُٹھ چکی ہے۔ صنعت و حرفت سیاست و ریاست، ادب و صحافت اور تمدن و معاشرت غرضکہ ہر طرف اخلاقی بگاڑ اپنی انتہائی بھیانک صورت میں نظر آتا ہے۔

معاشرے کی معاشی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رگوں میں سودی کاروبار کا ابلیسی خون گردش کر رہا ہے۔ سٹہ بازی، ذخیرہ اندوزی، اشیائے ضرورت کی مصنوعی قلت پیدا کرنے اور قیمتوں میں بلا جواز اور من پسند اضافہ کرنے کے رجحان نے ہماری تجارتی اور کاروباری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ناقص اور مضر صحت اشیا کا اشتہار بازی کے ذریعہ سے فروخت کرنا ذہانت کی دلیل تصور کیا جاتا ہے۔

سیاست و ریاست کی جو حالت ہے اس کی تفصیل ہمارے تقریباً ۳۷ سالہ دور آزادی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور ہر کہ و مہ پر الم نشرح ہے۔ اگر کسی کو اعداد و شمار اور حقائق و واقعات سے آگاہی مطلوب ہو تو زیادہ دور جانے اور عمیق مطالعے کی زحمت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں، سابق حکومت کے چند سالوں کی کارکردگی موجودہ حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے قرطاس ابیض میں دیکھی جا سکتی ہے۔ الزام تراشی، غنڈہ گردی، دھوکہ بازی اور جعل سازی سیاست کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ اس طرح کی سیاست سے شہ پاکر انتظامیہ نے سرخ فیتہ اور رشوت کا جو

چکر چلا رکھا ہے اس سے بھی سب لوگ بخوبی واقف ہیں۔

ادب و صحافت کی دنیا میں کذب و افترا اور عریانی و فحاشی کی حکمرانی ہے۔ اخبارات جس مکروہ انداز میں لوگوں کو لچر اور فحش فلموں کا شیدائی بنا رہے ہیں اور مختلف تقاریب میں شامل ہونے والی خواتین کی عریاں و نیم عریاں تصاویر سے صنفی خواہشات بھڑکانے میں مصروف ہیں وہ انتہائی پریشان کن ہے۔ ڈائجسٹوں کی ایک بڑی تعداد پورے "مشنری جذبے" سے قوم کی اخلاقی روایات کی شکست و ریخت میں مصروف ہے، یہ ڈائجسٹ نہ صرف یہ باور کرا رہے ہیں کہ زندگی زن، زر، زمین کا دوسرا نام ہے بلکہ مغربی تہذیب اور ہندوانہ رسوم و عقائد کو دلکش صورت میں پیش کرنے میں بھی یہ ڈائجسٹ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں۔

تمدن و معاشرت کی حد تک، حصول زر کی بے لگام دوڑ میں شرکت کا اثر یہ ہوا ہے کہ شرم و حیا، عفت و پاکدامنی، امانت و دیانت، اخوت و محبت اور ایثار و قربانی کی اعلا صفات دم توڑ رہی ہیں اور بے حیائی و بے شرمی، عصمت فروشی، خیانت و بد دیانتی، عداوت و مخاصمت، خود غرضی و نفس پرستی کو غلبہ حاصل ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی ایسی خبریں بھی سننے میں آجاتی ہیں کہ جن میں انسانی ہمدردی، دیانت اور فرض شناسی کا ذکر ہوتا ہے لیکن ان مثالوں کی حیثیت تاریک رات میں چمکتے ہوئے جگنوؤں کی سی ہے، ان سے تاریکی مات نہیں کھا سکتی اور پھر اسلامی معاشرے کو جس اخلاقی معیار کا مالک ہونا چاہیے، اس کے لحاظ سے یہ مثالیں لائق ذکر بھی نہیں ہیں۔ تعلیم کے شعبے کی طرف آئیں تو وہاں بھی حالت کچھ مختلف نہیں۔ پولیس کا مقصد قانون کی حفاظت ہے اور کچہریاں حصولِ انصاف کا ذریعہ ہیں لیکن قانون کی مٹی کس طرح پولیس کے ہاتھوں پلید ہو رہی ہے اور کچہریوں میں حصولِ انصاف کتنا مشکل، پیچیدہ اور مہنگا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اخلاقی بدحالی کے اس سیلِ بے پناہ میں عام آدمی تنکے کی طرح بہا جا رہا ہے۔ اس میں اگر کوئی قوتِ مدافعت تھی بھی تو وہ دم توڑتی جا رہی ہے۔ اُس نے سمجھ لیا ہے کہ اس صورت حال کا مقابلہ کرنا عبث ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ یہ اخلاقی بے راہروی انسان کی معاشرتی زندگی کا ایک لازمہ ہے۔ وہی شخص کامیاب و کامگار ہے جو رضاکارانہ طور پر اس کا ساتھ دے لہٰذا وہ بھی زمانے کے ساتھ چلنا ضروری سمجھتا ہے خواہ اس کے لیے اس کو بڑی سے بڑی اور پاکیزہ سے پاکیزہ اخلاقی قدروں کو قربان کیوں نہ کرنا پڑے۔

اس عالم میں جب، نفاذِ اسلام کی آواز کان میں پڑتی ہے تو ہر دردمند مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا محض قانون سازی اور اجرائے احکام سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہی ہے کہ "نہیں" اس کے لیے لازماً ذہنوں کو تیار کرنا پڑے گا اور اخلاقی اصلاح کی مہم چلانی پڑے گی۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہ مسئلہ بذاتِ خود گہرے غور و فکر ہی کا متقاضی ہے۔

آج ہمارے سامنے یہ سوال بار بار آتا ہے کہ اس ہمہ گیر اخلاقی انحطاط کا سبب کیا ہے اور کیا اس کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا کرنا ممکن ہے تو اس کے لیے مناسب طریق کار کیا ہوگا؟ اگر دس آدمیوں کے سامنے یہ سوالات رکھے جائیں تو آپ کو کم و بیش دس ہی جواب مل جائیں گے اور غالباً ہر جواب دوسرے سے مختلف ہوگا۔ "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"، ہر شخص اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں بات کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس مسئلے کے بارے میں مختلف آرا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب سیاست ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما کسی قسم کے ضابطۂ اخلاق کے قائل نہیں۔ کرسی اقتدار ان کا مطمحِ نظر ہے اور وہ اس کے حصول کے لیے ہر طریقہ جائز بنا لیتے ہیں۔ دوسرا آدمی یہ رائے دیتا ہے کہ اخلاقی گراوٹ کی اصل ذمے دار حکومت ہے۔ حکومت ایسے قوانین بناتی ہے جو عوام کو خواہ مخواہ غیر اخلاقی ذرائع تلاش کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تیسرا آدمی معاشرتی ماحول کے دباؤ کو اخلاقی بدحالی کا باعث قرار دیتا ہے۔ معاشرے کا اجتماعی رویہ، مخصوص رسوم اور رواج انسانی اخلاق کے سارے کس بل نکال دیتے ہیں۔ چوتھا آدمی اس اخلاقی انحطاط کی بنیاد معاشی ناہمواریوں اور اقتصادی ناانصافیوں میں تلاش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک غربت و افلاس انسان کو چوری، ڈاکہ زنی، عصمت فروشی، رشوت خوری، خیانت وغیرہ پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے خیال میں معاشی فارغ البالی سے ہر قسم کی اخلاقی خرابی کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔ پانچواں آدمی ذرائع ابلاغ کو جملہ اخلاقی پستیوں کی جڑ قرار دیتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاستداں، حکمراں، قانون، معاشرتی رسم و رواج، غربت و افلاس، دولت و امارت اخلاقِ عامہ کی پستی یا بلندی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ سیاستدانوں کے مکر و فریب، حکمرانوں کی نفس پرستی و کنبہ پروری، قانون کی بے عملی، معاشرے کا اخلاق دشمن رجحان، غربت کا احساس، امارت کا نشہ، اخبارات و رسائل، ریڈیو، ٹیلی وژن اور سینما وغیرہ کی بُری تلقین اس پستی میں اضافے کا سبب ہے۔ یہ سب چیزیں پست اور مذموم اخلاقی صفات کو تسلسل اور دوام بخشنے والی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اسباب سے

بڑھ کر تباہ کن زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک ایسا نقطہ نظر ہے جس میں حیوانیت کو انسانیت خیال کیا جاتا ہے۔ شکم پروری اور نفس پرستی تہذیب و شائستگی کے ہزاروں سال پر پھیلے ہوئے طویل سفر کا حاصل قرار پاتی ہے۔ یہی وہ خطرناک نقطۂ نظر ہے جو اس وقت بڑی سرعت سے ہمارے معاشرے پر غلبہ حاصل کرتا جا رہا ہے۔

اخلاقی حس انسان کی فطری حس ہے، قدرت نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ہی اس میں نیکی اور بدی کا شعور بھی ودیعت کر دیا ہے۔ انسان فطری طور پر جانتا ہے کہ کون سی بات اچھی ہے اور کونسی بُری۔ اسی طرح وہ اخلاقی صفات کی خوبی و خرابی سے بھی باخبر ہے۔ پھر مذاہب عالم نے بھی اخلاقی قدروں کے بارے میں انسان کی رہنمائی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی اور بُری اخلاقی صفات تمام انسانوں پر بالکل واضح ہیں۔ اس کے باوجود ہر دور کے انسان نے ان صفات کی معنویت کو اپنے ذاتی مفادات اور جاہلی تعصبات کے تحت محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نتیجے میں جو اخلاقی بگاڑ رونما ہوا اس نے پورے معاشرے کو ہلاکت و تباہی کا لقمۂ تر بنا دیا اور یہ معاشرے تاریخ کا جزو بن گئے۔ لیکن بعد کے آنے والوں نے بھی ان کے انجام سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ اخلاقی بے راہروی کا یہ سلسلہ عصر حاضر کی زبردست علمی و فلسفیانہ ترقی کے باوجود جاری ہے۔ اقوام مشرق مغربی اقوام کی مادی ترقی سے اس حد تک متاثر ہیں کہ وہ اپنی اصلاح اخلاق کے لیے بھی مغربی اقوام کی طرف دیکھ رہی ہیں، حالانکہ وہ قومیں خود زبردست اخلاقی انتشار سے دوچار ہیں جن کی تہذیبی ترقی کے افسانے عام و خاص کی زبان پر ہیں۔ جو قومیں ترقی سے ہمکنار ہیں اور علم، اخلاق اور تہذیب میں دنیا کی قیادت و سیاست کی دعویدار ہیں تقریباً وہ سب بنیادی طور پر خدا، وحی اور رسالت کے تصور سے محروم ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب ایک غیر عقلی رویہ ہے اور اگر اس پر ایمان ضروری ہے تو پھر یہ انسان کا نجی اور ذاتی معاملہ ہے۔ اجتماعی معاملات سے مذہب کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے، حتیٰ کہ اخلاق کی اصلاح و تعمیر کے سلسلے میں بھی وہ مذہب کی رہنمائی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بیسویں صدی کے اواخر میں امریکا سے ایک اخلاقی تحریک شروع ہوئی جس نے بعد ازاں یورپ کے ممالک کو بھی متاثر کیا۔ اس کے مقاصد میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی کہ "انسانی زندگی کے تمام تعلقات میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، قومی ہوں یا بین الاقوامی ایسے اخلاق کی اہمیت پر زور دینا جس میں مذہبی عقائد یا مابعد الطبیعی خیالات کا کوئی دخل نہ ہو۔"

اس طرح کی تحریکوں کے فروغ کا نتیجہ یہ نکلا کہ خیر، مسرت، کمال اور حق وغیرہ کی باتیں

کرنے کے باوجود یہ قومیں اور ان کے فلسفی ان چیزوں کی اصلیت و حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکے۔ ان سب باتوں کے متعلق ہر مفکر کا نقطۂ نظر دوسروں سے مختلف ہی نہیں متضاد بھی ہے۔ اخلاقی حسن و قبیح کا معیار کیا ہے؟ خیر و شر کے علم کا ماخذ کیا ہے؟ اخلاقی قوانین کی پشت پر کون سی قوت کارفرما ہے؟ وہ محرکات کیا ہیں جو انسان کو ان اصولوں کی پابندی پر آمادہ کرتے ہیں؟ ساری سوچیں اور سارے فلسفے ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اس تمام نارسائی کی وجہ یہ ہے کہ سوچنے والے ذہن کائنات، انسان اور حیات ایسی بنیادی حقیقتوں کے بارے میں صاف نہیں ہیں۔ کائنات کا خالق کون ہے؟ کائنات کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے؟ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ جب تک ان باتوں کا صحیح اور یقینی علم حاصل نہیں ہوتا، اخلاق کے کسی مسئلے کا حل ممکن نہیں۔

عصرِ حاضر کی ترقی یافتہ اقوام نے ان بنیادی حقائق کا مطالعہ بھی مذہب اور وحی کی رہنمائی کے بغیر کیا ہے۔ وہ کائنات اور زندگی کی روحانی بنیاد کا انکار کرتی ہیں اور مادہ پرستی پر فخر کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اخلاق کی تعمیر کی اہم بنیاد سے محروم ہو چکی ہیں۔ ان کے نزدیک اخلاق ایک روحانی ضرورت نہیں بلکہ ایک ایسا رویہ ہے جو شخصی اور گروہی مفادات کے تابع ہے لہٰذا انھوں نے اخلاق کی اصلاح اور تعمیر کے لیے قومی، وطنی، نسلی، طبقاتی، تجارتی اور کاروباری اغراض و مقاصد کا سہارا لینے میں عافیت خیال کی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی اخلاق کے لیے کوئی عالمگیر، مستقل اور مستحکم بنیاد مہیا نہیں کر سکتی۔ اس طرزِ عمل نے اخلاق کے دوہرے، تہرے معیار قائم کر دیے ہیں، ہر شخص اور ہر گروہ اپنا الگ اور منفرد معیار رکھتا ہے جو نہ صرف دوسرے اشخاص اور گروہوں سے مختلف ہوتا ہے بلکہ باہم متصادم بھی ہوتا ہے۔ ایک ہی ملک کے باشندے، ایک ہی قوم کے افراد اور ایک ہی معاشرے کے ارکان اخلاق کے جدا جدا اصولوں کے قائل ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ایک آدمی ایک ذہین اور قابل جج، وکیل، استاد، سیاستدان اور تاجر ہے لیکن دوسری طرف اچھا انسان نہیں ہے۔ اس کی نجی اور شخصی زندگی ایک اخلاقی اصول کے تابع ہے اور اجتماعی اور معاشرتی زندگی دوسرے اصول پر مبنی ہے۔ پھر وہ جس گروہ سے تعلق رکھتا ہے اس کے باہمی معاملات ایک اخلاقی اصول کے مطابق سرانجام پاتے ہیں لیکن دوسرے گروہوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے اس کے اصول تبدیل ہو جاتے ہیں! پھر یہ سب لوگ اپنی قوم کے ساتھ جو اخلاقی رویہ اختیار کرتے ہیں دوسری قوموں کے ساتھ اس سے قطعی مختلف رویہ اپنانے میں فخر

محسوس کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں قتل و خونریزی اور معاشی لوٹ مار کا بازار گرم کرنے والے لوگ وہی ہیں جو اعلا اخلاق کے دعویدار ہیں۔ اس اخلاقی زوال کے عالمگیر اثرات مغربی اقوام پر جس طرح مرتب ہو رہے ہیں اس کا اندازہ خود مغربی مفکرین کی تصانیف سے ہو سکتا ہے۔ وہ اس صورت حال کو انتہائی پریشان کن اور مایوس کن قرار دیتے ہیں لیکن اس کا کوئی مداوا ان کے پاس نہیں ہے۔

امریکا اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور وہ سب سے زیادہ مہذب و متمدن ہونے کا دعوا کرتا ہے۔ وہ زندگی کی جن آسائشوں، رنگینیوں اور رعنائیوں سے ہمکنار ہے ان کا محض ذکر ہی سن کر ایشیائی لوگوں کی رال ٹپکنے لگتی ہے، لیکن اخلاقی اعتبار سے وہ کس منزل پر ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو ۱۳ر جولائی ۱۹۷۷ء کی شام کو رونما ہوا۔ آسمانی بجلی گرنے سے نیویارک کے بہت سے ٹرانسفارمر جل گئے جس کی وجہ سے پورے شہر کی برقی رو معطل ہو گئی برقی رو کا معطل ہونا تھا کہ شہر میں قیامت آ گئی۔ شہر تاریکی میں ڈوب گیا۔ لفٹیں جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔ لوگ ان میں پھنسے ہوئے تھے، کوشش کے باوجود نکل نہیں سکتے تھے۔ لوگ موم بتیاں تلاش کر رہے تھے لیکن اندھیرے میں نہ موم بتی مل رہی تھی نہ دیا سلائی۔ گھروں کے اندر جو حالت تھی وہ تو الگ رہی اصل قیامت بازاروں اور کاروباری مراکز میں بپا ہوئی۔ سماج دشمن عناصر نے اس تاریکی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور زبردست لوٹ مار مچائی۔ اس اندھیرے میں نہ تو دکاندار اپنے مال کی حفاظت کر سکتا تھا نہ چور پکڑ سکتا تھا۔ ہزاروں دوکانوں، اسٹوروں اور تجارتی عمارتوں میں ڈاکے ڈالے گئے اور کروڑوں روپے کا سامان لوٹ لیا گیا۔ شہر میں آتش زنی کی سولہ واردات‌یں ہوئیں۔ پچھتر عمارتیں اس آتش زنی سے شدید متاثر ہوئیں، لاتعداد کاریں چوری ہو گئیں شہر کے ہر محلے میں شراب کی بوتلیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ مختلف علاقوں میں ان سماج دشمن عناصر نے گھروں میں گھس کر نہ صرف ڈاکے ڈالے بلکہ کئی جگہ سے مجرمانہ حملوں کی اطلاع بھی ملی۔ بعض مقامات پر غنڈوں نے پولیس کا باقاعدہ مقابلہ بھی کیا جس سے ۱۳۲ پولیس والے زخمی ہو گئے۔ چھوٹے دکاندار تو بالکل تباہ ہو گئے۔ ان تمام تر وارداتوں کے سلسلے میں پولیس نے تقریباً تین ہزار تین سو افراد کو گرفتار کیا۔

یہ تو نمونہ ہے امریکی تہذیب کا۔ اب آئیے برطانیہ کی طرف جس کی اخلاقی برتری کے نعرے تہذیب کے ایوانوں میں گونج رہے ہیں۔ برطانیہ نے جس طرح اہل مشرق کو حرص و آز کا نشانہ بنایا، استعماری مفادات کے لیے جس طرح مشرقی اقوام کو باہم لڑایا وہ ایک الگ داستان ہے، حال ہی میں وہاں غیر مقامی لوگوں پر جس طرح ظلم و ستم کیا گیا اس سے برطانیہ کے اخلاقی برتری کے نعرے کی اصلیت واضح ہو جاتی ہے۔

یہ اخلاقی انتشار اور افراتفری امریکا اور برطانیہ ہی کا خاصہ نہیں ہر وہ معاشرہ اور قوم اس کا شکار ہوگی جس میں اخلاق کی تعمیر کے لیے روحانی عقائد اور مذہبی اصولوں کو پس پشت ڈالا جائے گا۔ اخلاق کی بہترین بنیاد وحی کے عالمگیر اور ابدی اصول بن سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس وقت تک انسانیت کے لیے مفید نہیں بن سکتا جب تک اس کی بنیاد وحی ربانی پر نہ رکھی جائے۔ وحی کا اصل کام یہ ہے کہ وہ انسانی اغراض کو ایک بڑے نصب العین کے تابع کر دیتی ہے اور یہ نصب العین ہے اللہ کی خوشنودی، اور یہ نصب العین بہت سی دوسری چیزوں سے وابستہ ہے، یعنی رسالت پر ایمان، آخرت کا عقیدہ، جزا و سزا کا یقین وغیرہ ان سب کے مجموعے کو ہم ایمان کہتے ہیں۔ اسلام پہلے ایمان کی دعوت دیتا ہے اور پھر اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔

زندگی کی ہر تعمیر سے پہلے عقائد کی تعمیر ضروری ہے انسانی اذہان ذغلوب جب سچے عقائد کو قبول کر لیتے ہیں تو پھر فکر و عمل کے میدان میں انقلاب لانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اصلاح کا یہ فطری طریقہ ہے۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے یہی طریقہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس نے سب سے پہلے کائنات اور حیات کے بارے میں انسانی ذہن کو غلط قسم کے خیالات اور توہمات سے نجات دلائی۔

کائنات کے متعلق اسلام یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ اس کا ایک خالق ہے، وہی اس کا انتظام کرنے والا ہے، وہی سب مخلوقات اور انسانوں کا آقا و مالک ہے، ہر چیز فانی ہے لیکن خالق ہمیشہ باقی رہنے والی ہستی ہے۔ وہ حکیم اور قادر مطلق ہے، وہ ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے، انسان اس کا بندہ اور نائب ہے اور اپنے ہر کام کے لیے اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس عارضی دنیا کے بعد دوسری دنیا یا آخرت لازماً آئے گی جس میں دنیا کی زندگی میں اس کی جملہ مساعی کا مکمل حساب ہوگا۔ اس کے مطابق وہ عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ کا مستحق ہوگا۔ دنیا کی زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے۔ انسان کی سہولت کے لیے کائنات کی ہر چیز مسخر کر دی گئی ہے۔ اس کو نہ صرف اپنے جسم پر اختیار عطا کیا گیا ہے بلکہ نیکی بدی، اطاعت و سرکشی کی راہیں بھی اس کو سمجھا دی گئی ہیں۔ اس کی ابدی فلاح اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی منشا کے تابع کر دے اور اس کے دل میں ہر وقت یہ احساس جاگتا رہے کہ اس کا واسطہ ایک ایسی ہستی سے ہے جو اس کی حرکات و سکنات ہی نہیں اس کے خیالات و احساسات کی باریک سے باریک تفصیل سے بھی بخوبی باخبر ہے اور جزا و سزا دینے کی پوری قدرت بھی رکھتی ہے۔

کائنات و حیات کا یہ تصور اس خیر اور بھلائی کو بھی متعین کرتا ہے جس کے لیے انسان کی ہر سعی و کوشش وقف ہونی چاہیے اور وہ کائنات کے رب کی خوشنودی کے سوا اور کچھ نہیں بھلائی کا یہ تصور انسان کی اخلاقی زندگی کا محور ہے۔ اس تصور کی روشنی میں اخلاقی صفات اپنی فطری اور اصلی صورت میں متعین طور پر سامنے آتی ہیں۔ رضائے الٰہی کو مقصود قرار دینے سے اخلاق کو نہ صرف بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی نشوونما کے امکانات ردوش تہ ہونے ہیں بلکہ ذاتی مفادات اور زمانی تغیرات سے بالاتر اخلاقی اقدار قائم ہو جاتی ہیں۔

کائنات و حیات کے اس تصور میں وہ قوتِ نافذہ بھی موجود ہے جس کا کسی بھی اخلاقی قانون اور ضابطے کی پشت پر ہونا ضروری ہے۔ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے اور عالم غیب ہونے کا تصور، آخرت کی باز پرس کا اندیشہ، اللہ کے غضب کا ڈر اور ابدی زندگی کی خرابی کا خوف اخلاقی قانون کا دائمی پشتیبان ہے۔ یہ خوف جب انسان کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو پھر اس قانون کی تعمیل کے لیے کسی پولیس، عدالت اور جیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ اسلام ایک رائے عامہ بھی اس اخلاق کے حق میں تیار کرتا ہے اور حکومت کو بھی اخلاق کی نگرانی کا ذمہ دار بناتا ہے، لیکن ان سب ذرائع سے بڑھ کر وہ اللہ کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے عقیدے کو مستحکم بنانا ضروری سمجھتا ہے۔ جب یہ عقیدہ مستحکم ہو جاتا ہے تو پھر اخلاق کی عمارت ناقابلِ شکست بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے۔ افرادِ معاشرہ کسی قانون، پولیس اور عدالت کے بغیر خود ہی ایک دوسرے کے حقوق اور مفادات کی نگہداشت میں سرگرم رہتے ہیں، یہی چیز ہے جو زندگی کی ہر سرگرمی کو دنیا کے دائرے سے نکال کر دین بنا دیتی ہے جو دیوانی اور فوجداری مقدمات کو صرف عدالتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتی بلکہ آخرت کی نجات کے ساتھ مربوط کر دیتی ہے۔

یہ بنیادی تصور وہ محرکات بھی مہیا کرتا ہے جو انسان کو اخلاقی قوانین کے مطابق عمل کرنے پر ابھارتے ہیں۔ اللہ کو اللہ ماننا اس کی اطاعت و بندگی پر راضی ہو جانا اس کی مرضی و منشا کو مقصدِ حیات بنانا ان قوانین کی تعمیل کے اصل محرکات ہیں، جن کے بارے میں اسے یقین ہو کہ اس کے رب نے ان کا حکم دیا ہے کیونکہ صرف اسی صورت میں اس کے لیے آخرت کی ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل مضمر ہے۔ اپنے رب کے سامنے جوابدہ ہونے کا تصور انسان کو اس کی رحمت کا امیدوار اور اس کے غضب سے خوفزدہ رکھتا ہے، لہٰذا وہ دنیا کی عارضی زندگی میں ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کر کے آخرت کی کامیابی اور اللہ کی خوشنودی کے حصول میں کوشاں رہتا ہے۔ پھر اسلام نے اخلاقی قوانین کا ماخذ بھی مہیا کر دیا ہے۔

اس نے اخلاقی صفات کو محض عقل، علم، تجربہ، خواہشاتِ نفس کے بجائے ایک واضح اور معین ذریعے پر منحصر قرار دیا ہے اور وہ ہے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ۔ یہ دونوں چیزیں مل کر اسلامی قانونِ اخلاق کے لیے ماخذ مہیا کرتی ہیں۔ یہ ماخذ ہنگامی، علاقائی یا گروہی نہیں بلکہ مستقل، دوامی اور عالمگیر قدر و حیثیت کا مالک ہے اور زمانی و مکانی تغیرات سے محفوظ ہے۔ اس ذریعے اور ماخذ سے ہمیں جو ہدایات ملتی ہیں وہ ہر علاقے، ہر نسل اور ہر دور کے انسانوں کے لیے لائقِ تعمیل اور قابلِ عمل ہیں۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے رہنما بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذریعہ سے دنیا کو جو اخلاقی نظام دیا ہے وہ ہر اعتبار سے جامع کامل اور ہمہ گیر ہے۔ اس میں ہماری زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات سے لے کر قوموں کے مابین تعلقات کے لیے واضح ہدایات ملتی ہیں۔ اس نظام کی موجودگی میں کسی دوسرے ذریعے سے اخلاقی ہدایات لینے کا اب کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ اسلام نے نہ صرف اعلا اور بلند اخلاقی صفات کو صفاتِ الٰہی کا عکس قرار دے کر بندوں کو خدائی اخلاقی صفات اپنانے کی تلقین کی بلکہ ان صفات کو سہل الحصول اور مرغوب بنانے کے لیے عبادات کا نظام بھی قائم کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی عبادات کے متنوع فوائد ہیں لیکن ان کی ایک اہم غرض و غایت اخلاقِ حسنہ کی تربیت بھی ہے۔ یہ عبادات انسان کو اپنے نفس پر قابو پانے کے قابل بناتی ہیں، اس کے معروف پر عمل کرنے اور منکر سے بچنے پر آمادہ کرتی ہیں۔

عبادات کے نظام سے کام لے کر حضور ﷺ نے ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو ان تمام صفات سے متصف تھی جن کی تلقین قرآن مجید نے کی اور جن کا عملی نمونہ حضور ﷺ نے پیش فرمایا۔ صحابہ کرامؓ کی اس جماعت نے صدق و صفا، امانت و دیانت، ہمدردی و غمگساری، ایثار و قربانی، اور عدل و انصاف کی ایسی مثالیں قائم کیں جو آنے والے لوگوں کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ اور مینارۂ نور کا کام دیں گی۔ قرآن کی تعلیمات، حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرامؓ کی زریں مثالوں نے ہر دور کے مسلمانوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلامی اخلاق کے یہی وہ عناصر ہیں جنھوں نے اس دور میں بھی ہمارے معاشرے میں بلند اخلاقی قدروں کو سہارا دے رکھا تھا جو ہمارے زوال کا دور تھا۔ علم و فن، تہذیب و تمدن، سیاست و حکومت کے میدان میں ہم دوسری اقوام سے پیچھے رہ گئے تھے لیکن مجموعی طور پر ہمارا تعلق

اسلام کی اخلاقی تعلیمات سے قطع نہیں ہوا تھا مگر گزشتہ صدیوں کے طویل غیر ملکی تسلط سے ہماری قوتِ مدافعت کو جو ضعف پہنچا اس نے غیر اسلامی افکار و نظریات کی یلغار کی راہ ہموار کر دی۔ اس یلغار نے سب سے زیادہ ہمارے بنیادی عقائد کو توڑنے پھوڑنے کی کوشش کی۔ ہمارا جاہل طبقہ رسم و رواج کی جکڑ بندیوں میں پھنس کر رہ گیا اور ہمارا ذہین طبقہ اسلام دشمن قوتوں کے لیے تر نوالہ ثابت ہوا۔ مغرب کی مادی ترقی نے اس کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات اس کے نزدیک از کار رفتہ اور فرسودہ قرار پائیں۔ مادّی ترقی کے مقصود اور حُبِ مال و جاہ کے جذبے نے ہماری اخلاقی اقدار کے سارے نظام کو تہ و بالا کر دیا۔ آج ہم کسی سے ہنستے بولتے ہیں، کسی کو سلام کرتے ہیں، کسی کی خیریت دریافت کرتے ہیں، اظہارِ غم کرتے ہیں یا نمائشِ مسرت کرتے ہیں تو اللہ کی رضا کے لیے نہیں بلکہ ڈیل کارنیگی کی کتابوں کے تازہ ترین ایڈیشن کے مندرجات پر پورا اترنے کے لیے! ہم اگر کسی کو تحفہ دیتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ حضورؐ کا فرمان ہے کہ "ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجا کرو تو آپس میں محبت پیدا ہوگی اور دلوں کی کدورت دُور ہوگی۔" (مشکوٰۃ) بلکہ اس لیے کہ اس طرح ہمیں کسی سے مالی فائدہ پہنچنے کی توقع ہوتی ہے۔ یہ طرزِ عمل ہمارے اس طبقے کا ہے جس نے نہ جانے کن کن یونیورسٹیوں سے علم و فن کی کیسی کیسی سندیں لے رکھی ہیں۔

ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی حالت سے ہمارے عوام کا متاثر ہونا قدرتی عمل تھا اور ایسا ہی ہوا۔ اب شاید ہی کوئی طبقہ ایسا ہو جو اس مہیب اخلاقی بحران سے دوچار نہ ہو۔ ہمارے کسان، مزدور، اساتذہ، وکیل، عالم، رہنما، کارکن اور حاکم سب اخلاقی افلاس اور بے مایگی میں مبتلا ہیں، یہی وجہ ہے کہ کھیتوں، کارخانوں، تعلیم گاہوں، عدالتوں، انتظامی دفتروں وغیرہ میں گہماگہمی ہونے کے باوجود قوم جہاں سے چلی تھی آج بھی وہیں کھڑی ہے۔ ہماری مثال قدیم داستانوں کے ان شہزادوں کی ہے جو گوہرِ مقصود کی تلاش میں بڑے جوش اور جذبے سے نکلتے ہیں لیکن کسی خبیث جن کی قید میں آکر پتھر کے بُت بن جاتے ہیں! مایوسی کی مکڑی نے ہمارے وجود کے اردگرد ایسا جالا تن دیا ہے جس نے ہمیں اپنے انجام کے مشاہدے سے محروم کر دیا ہے۔ وقت کا ہر لمحہ سانپ کی طرح ہمیں ڈس رہا ہے اور ہر گھڑی ناگن کی طرح پھنکارتی سنائی دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ہمت ہار دیں، ناموافق حالات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، اخلاقی بے راہروی سے سمجھوتہ کر لیں اور اخلاقی صفات کی تدریج و ترقی کے اس منصب سے دست بردار ہو جائیں جس کے لیے حضورؐ کی امت کو مقرر کیا گیا ہے؟ میرا جواب ہے: ہرگز نہیں جب تک

ہمارے سینوں میں ایمان کی مشعل فروزاں ہے ہمیں تاریکیوں کے خلاف جنگ کرتے رہنا ہے۔ ہمیں اپنی حد تک، اپنی سمت کے مطابق صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد ضرور کرنا ہے۔ ایک چینی کہاوت میں کتنی اچھی بات کہی گئی ہے :

"تاریکی کو کوسنے کے بجائے ایک دیا جلا لینا بہتر ہے"

موجودہ حالات کے تناظر میں اس کام کی اہمیت اور ضرورت پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ حکومت نے پاکستان کے مقصدِ وجود کی تکمیل کی غرض سے اسلامی نظام کے قیام کے لیے لائقِ ذکر پیش رفت کی ہے۔ اس نے معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لیے زکوٰۃ اور ایک صحت مند معاشرے کے قیام کے لئے اسلامی حدود و تعزیرات کے نفاذ کے ضمن میں ضروری اقدامات کیے ہیں۔ قومی وقار اور تشخص کے لیے اردو زبان اور قومی لباس کی ترویج کے لیے کوششیں کی ہیں۔ حکومت کی ان باتوں کو لوگوں نے جس طرح سراہا ہے اس سے ان کی اسلامی نظام سے محبت اور قومی تشخص سے لگاؤ کا پرجوش اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس موقع پر ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی بیج کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو اگر اس کو بونے سے پیشتر زمین میں صحیح طور پر ہل نہ چلایا گیا ہو اور زمین کو جھاڑ جھنکاڑ سے پاک نہ کیا گیا ہو تو اس بیج سے مطلوبہ فصل حاصل نہ ہوگی۔ اس حقیقت کو ایک اور طرح یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ دودھ ایک خالص اور مکمل غذا ہے لیکن اگر معدہ اس کو ہضم کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو تو وہ جسم پر مطلوبہ فوائد مرتب نہ کر سکے گا۔ اسی طرح اگر کوئی قوم کسی نظام کو قبول کرنے کے لیے ذہنی اور اخلاقی طور پر تیار نہیں ہے تو محض قانون کے نفاذ سے اس نظام کے فوائد اور برکات منظر عام پر نہیں آسکیں گے۔

اسلام ایک پاکیزہ نظام حیات ہے، یہ اپنے نفاذ کے لیے اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ دلوں اور دماغوں کو جہالت اور جاہلیت کی خرابیوں سے پاک کیا جائے۔ حضورؐ نے یہی طریق کار اپنایا تھا۔ آپؐ نے اہلِ ایمان کا پہلے تزکیہ کیا اور پھر اُن کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی اور اُن کو اسلامی احکام و ضوابط پر عمل کرنے پر آمادہ کیا۔ اگر اسلامی نظام کے نفاذ کے ساتھ اخلاقی تربیت کا کام جاری نہ رکھا گیا تو اسلامی نظام قانون کی کتابوں میں تو محفوظ ہو جائے گا لیکن عمل کی دنیا میں اس کا سکہ نہ چل سکے گا۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس وقت اخلاقی بحران سے دوچار ہونے کے باوجود بے حسی کا شکار نہیں ہیں، ہمیں احساس ہے کہ ہم ان اخلاقی اوصاف سے محروم ہیں جو امت مسلمہ کا طرۂ امتیاز رہے

ہیں۔ یہ احساس تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنی قوتوں کو مجتمع کرلیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے ہاں اخلاقی بے راہروی اس لیے عام ہو رہی ہے کہ شر کی قوتیں بے لگام ہیں، منظم ہیں اور جارحانہ اقدامات کر رہی ہیں؟ جبکہ اخلاقِ حسنہ کے شیدائی منتشر ہیں اور مدافعانہ جدوجہد پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں سورۂ والعصر کو حرزِ جان بنانا چاہیے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۧ

ترجمہ: زمانے کی قسم۔ انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

صحابہ کرامؓ کی نظر میں اس سورت کی اہمیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں حضرت عبیداللہ بن حفص الدارمی ابومدینہ کی روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ میں جب دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے تھے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے تھے جب تک ایک دوسرے کو سورۂ والعصر نہ سنا لیتے تھے"۔ اس سورت میں عالمگیر اور ہمہ گیر خسارے سے بچنے کا طریق کار یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ ایمان لائیں، عمل صالح کریں اور دوسروں کو نیکی اور بھلائی کی تلقین کریں۔ اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کو برداشت کریں اور دوسرے ساتھیوں کو صبر کی تلقین کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے قیام اور اصلاحِ اخلاق کی اہم مہم کو کامیاب بنانے کے لیے چار صفات اپنانے کی ضرورت ہے: ایمان، عمل صالح، نصیحتِ حق اور تلقینِ صبر۔ یہ چاروں صفات باہم لازم و ملزوم ہیں۔ نصیحتِ حق میں تعلیمِ اخلاق اور تلقینِ صبر میں تعمیرِ کردار کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

یوں تو اصلاحِ اخلاق ہم سب کی ذمہ داری ہے لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ مؤثر اور فعال کردار تعلیم یافتہ افراد ادا کر سکتے ہیں۔ ان میں استاد، عالم، ادیب، شاعر، صحافی، حکیم، ڈاکٹر اور وکیل وغیرہ سب شامل ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہر شخص دوسرے شخص کی طرف اور ہر شعبے کے لوگ دوسرے شعبوں کے لوگوں کی جانب دیکھتے رہیں ہر شخص اور گروہ کو اپنی حالت پر غور کرنا چاہیے، اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اور سب سے پہلے خود اپنا علاج کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کا فریضہ بھی سرانجام دینا چاہیے۔ اس عظیم فریضہ کی ادائی سے نہ تو

عوام بیچ سکتے ہیں نہ حکام، نہ اخبارات و رسائل کے مالکان بیچ سکتے ہیں نہ ذرائع ابلاغ کے کارپردازان۔ اگر اخلاق کے علمبردار چاہتے ہیں کہ وہ معاشرے میں ایک مظلوم اقلیت بن کر نہ رہ جائیں تو انہیں معروف اخلاقی قدروں کی ترویج کے لیے مسلسل جدوجہد کا آغاز کرنا پڑے گا۔

نوٹ

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے:

(۱) اخلاق اور فلسفۂ اخلاق	از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
(۲) اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
(۳) سیرۃ النبیؐ، جلد ششم	از مولانا سید سلیمان ندوی
(۴) زادِ راہ	از مولانا جلیل احسن ندوی
(۵) پیام انسانیت	از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
(۶) تزکیۂ نفس	از مولانا امین احسن اصلاحی

عدل اجتماعی ـــــ تصوّر و نفاذ

جناب محترم ڈاکٹر امان اللہ خان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا" ۝ (سورۃ الاسراء) پ ۱۵

اور بے شک ہم نے افراد نسلِ انسانی کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں اور انھیں پاک چیزوں سے رزق دیا نیز بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو فضیلت عطا کی۔

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ع ...." (سورۃ الحدید) پ ۲۷ ع ۲۵

(اور بے شک ہم نے اپنے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل کے سہارے کھڑے ہو جائیں)۔

"سوشل جسٹس" یا "عدلِ اجتماعی" کی اصطلاح عصر حاضر میں بڑی ہر دلعزیز ہوئی ہے، اور بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک نیا تصور ہے جو تہذیب حاضر کا وضع کردہ ہے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ مختلف نظامات بالخصوص اسلامی نظامِ حیات اور نبوی تعلیمات سے ناواقفیت ہے۔ سوشل جسٹس کے جدید تصور اور عدل اجتماعی کے اسلامی تصور کا جب بہ نظرِ غائر تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مغربی تصور ادھورا، نامکمل اور نسل انسانی کے لیے حقیقی معنوں میں نفع رساں نہیں۔ اس کے بر عکس نبوی تصور عدل تمام پہلوؤں کے لحاظ سے کامل ہے اور اس میں افرادِ نسلِ انسانی کے نفع، ان کی اصلاح اور تعمیر و سکون کی پوری پوری ضمانت موجود ہے۔

کتاب "SOCIAL JUSTICE" کے مشہور مصنف بالڈون (R.W. BALDWIN)

مغربی تصور کی اہمیت اور تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"JOINTLY WITH ECONOMIC GROWTH, SOCIAL JUSTICE HAS BECOME THE FAVOURITE THEME OF POLITICAL PLATFORMS, ALMOST SUMMARY DEFINITION OF THE ACCEPTED GAOL OF MODERN SOCIETY. YET JUSTICE ITSELF IS ESSENTIALLY A QUALITY OF THE BEHAVIOUR OF ONE MAN TO ANOTHER, THAT IS OF MAN IN SOCIETY, SO THAT ALL JUSTICE IS SOCIAL JUSTICE ...."

"SOMETIMES THE TERM MAY BE USED TO DISTINGUISH MORAL OR NATURAL JUSTICE FROM THE LEGAL JUSTICE OF THE LAWS ENFORCED BY PARTICULAR STATES. MORE OFTEN, HOWEVER, IT IS PROBABLY MEANT TO DESCRIBE JUSTICE IN THE BROAD FIELDS OF SOCIAL AND ECONOMIC POLICY, AS CONTRASTED WITH THE JUSTICE IN PERSONAL AND PRIVATE AFFAIRS WHICH THE LAW COURTS OF ALL AGES AND COUNTRIES HAVE TRADITIONALLY ADMINISTERED" (PAGE 1)

اجتماعی انصاف کے حصول کو جدید سوسائٹی کا بنیادی مقصد قرار دینے والی تہذیب مغرب اس مقصد کے حصول میں کہاں تک کامیاب ہوسکی ہے اہل دانش بڑی اچھی طرح سے جانتے ہیں اور وہ اس ناکامی کے اس اہم ترین عیب سے بھی آگاہ ہیں کہ وہ افکار، تصورات اور نظام جن کی بنیاد خالص عقلی اور مادی ہے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ پُر خلوص، پُر ایثار اور نفع رساں رویہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ تجربے اور تاریخ نے اس

بات کی پوری پوری شہادت دے رکھی ہے۔

شوپن ہار، جرمن مفکر مغرب کی مادی و الحادی تہذیب کے پیدا کردہ انسان سے مکمل طور پر ناامید ہو کر اسی لیے پکار اٹھا:

"MAN IS WOLF OF MAN"

بالڈون اجتماعی انصاف کے حصول کے سلسلے میں جس انسان پر کام کا آغاز کرتا ہے وہ بھی پیدائشی طور پر خود غرض واقع ہوا ہے۔

"JUSTICE ACCEPTS THAT MEN ARE SELFISH, BUT STIPULATES THAT ONE SELF IS AS IMPORTANT AS ANOTHER, AND THEREFORE REGULATES THEIR CONFLICTING INTERESTS. (PAGE 230)

اس کے برعکس اسلام نے جس انسان پر کام کا آغاز کیا وہ عزت دار ہے، خدا کا نائب ہے، اعلا ترین امانت کا حامل ہے اور لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا مصداق اور ثم اجتبٰہ ربہ فتاب علیہ وھدٰی کا خطاب یافتہ!

اجتماعی عدل کی اگر یہ تعریف کی جائے کہ یہ ایک ایسے تصور کا نام ہے جس میں انسانوں کے معاشرتی، قانونی و عدالتی، معاشی اور سیاسی حقوق و فرائض کی نشان دہی کی جاتی ہے تو بے محل نہ ہوگا۔ اس تصور کے قیام سے مقصود ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں اعتدال، توازن اور امن ہو۔ جو خوف سے پاک ہو، جس میں انسانوں کو اُن کے مذکورہ بالا حقوق حاصل ہوں، ان کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت ہو۔ اور ان حقوق کو پامال کرنے والوں کو ناکام بنانے کا پورا پورا انتظام ہو۔

ہماری یہ خوش بختی ہے کہ اجتماعی انصاف کے ان چاروں پہلوؤں کے بارے میں نہ صرف قرآن و سنت کی واضح تعلیمات موجود ہیں بلکہ اس کا عملی نمونہ اس معاشرے کی صورت میں موجود ہے جو سرکار دوعالم ہادیٔ دوجہاں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکیل دیا تھا۔

اصلاح فرد

آپؐ نے فرد کی روحانی و اخلاقی اصلاح و تعمیر پر سب سے زیادہ توجہ فرمائی اور اپنے ساتھیوں کے دلوں کو روحانیت سے بھر دیا۔ رنگ و نسل، خاندان، علاقہ اور وطن کے امتیازات کو مٹا دیا۔ انھیں عظمت و عزت کے ایک نئے تصور سے آگاہ کیا، اخوت و حریت کی تشکیل و تاسیس کی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ .... (نساء: ۱)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ - (حجرات ۱۳)

حدیث: لا فضل لعربي على عجمي .... (مسند احمد بن حنبل)

انسانوں کو یہ سب حقوق انقلابِ فرانس اور یو این او کے بنیادی انسانی حقوق کے چارٹر سے صدیوں پہلے عطا ہوئے۔

قانونی وعدالتی انصاف

عدل کے بارے میں قرآنی آیات لاتعداد ہیں۔ ان کے حوالے سے عدل کا اعلا ترین معیار قائم ہوا۔

قانون کے سامنے مساوات کی عملی مثالیں موجود ہیں۔ عدلیہ و انتظامیہ کی علاحدگی اسلامی تعلیمات کا جزو ہے۔

معاشی انصاف

- معاشی اصول و تعلیمات اسلام کے پورے نظام کا ایک اہم حصہ۔
- معیشت کی اساس اخلاق پر رکھدی گئی۔
- نفع رسانی کا اصول "اما ما ينفع الناس فيمكث في الارض"۔
- گردشِ دولت اکتناز و احتکار کی ممانعت۔

- حلال و حرام کی تمیز، ربا کی حرمت، حرص و بخل کی ممانعت۔
- محنت کی عظمت و اہمیت۔
- زکوٰۃ ۔ انفاق فی سبیل اللہ۔ قرض حسنہ۔
- اجتماعی کفالتِ عامہ۔
- معیشت کو درہم برہم کرنے والے جملہ عناصر کا سدباب۔

سیاسی انصاف

i "وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم"

ii "امرھم شوریٰ بینھم"

"کلکم راعٍ و کلکم مسؤل عن رعیتہ" (الحدیث)

عدل اجتماعی کے اس واضح، جاندار اور انتہائی نفع رساں تصور پہ نبوی معاشرہ قائم ہوا۔ خلافت راشدہ بھی اس کی ایک گرانقدر عملی مثال ہے۔

صالح مسلمان حکمرانوں نے بھی ان تعلیمات پہ حتی الامکان گامزن ہونے کی پر خلوص کوشش کی۔

دورِ حاضر میں اس کے نفاذ کی عملی تجاویز

فرد کی اصلاح، تعلیم و تربیت اس انداز پہ ہو کہ اس کا دل روحانیت سے بھر جائے کیونکہ دین کا مقصد ایک روحانیت بھرا دل ہی پورا کرتا ہے۔

اس سلسلے میں ہماری رہنمائی وہ عظیم طریق تعلیم و تربیت اور دستورِ تزکیۂ نفوس کرتا ہے جسے معلّم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا۔

o فرد کی تعمیرِ شخصیت میں ہمارا نظام تعلیم اور بالخصوص نصاب تعلیم بڑی بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔

جب تک جملہ نصاب تعلیم کی اساس اسلامی اصولوں پہ نہیں اٹھائی جاتی اور اسے الحادی مادی و لادینی اصول و افکار کی زد اور یلغار سے بچایا نہیں لیا جاتا منتشر اور الجھا ہوا ذہن رکھنے والے طلبہ و افراد پیدا ہوتے رہیں گے جن سے اجتماعی عدل

پامال ہوتا رہے گا۔

- فرد کی روحانی تربیت وارتقا کے بارے میں ذرائع ابلاغ کو اپنی ذمہ داری مستعدی سے پورا کرنی چاہیے۔
- علمی اور فکری سطح پہ جدید مادی والحادی تہذیب کو پورے طور پہ بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے۔
- قلوب واذہان پہ ہونے والے منفی اثرات کا موثر سدباب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی سلسلے میں نہ صرف مغرب سے آنے والے بدنیتی پہ مبنی لٹریچر پہ کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ملک میں لکھے جانے والے پہ بھی۔
- اجتماعی عدل کے قیام کے لیے ایسے منظم اجتماعی اور فعال ادارے بنانے کی ضرورت ہے جن کی اساس نبوی تعلیمات ہوں اور جن کا انداز بھی نور نبوت سے مستنیر ہو۔ نیز موجود اداروں کی تشکیل نو کا اہتمام بھی ہو۔ فلاح عامہ اور معاشرتی بہبود کے پروگراموں کو اللہ زیادہ منظم، وسیع، فعال اور حقیقی معنوں میں نفع رساں بنانے کی ضرورت ہے۔ احتساب و قانون کی قوت بھی اس سلسلے میں بڑا اہم کردار سرانجام دے سکتی ہے۔

اخلاق

نبوت سے اکتسابِ فیض کی شرط اور علامت

جناب محترم پروفیسر حافظ احمد یار

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (الاعراف ۱۹۹)

سیرت نگارانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک سے زیادہ نے اس سوال پر اپنے اپنے رنگ میں بحث کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی رسالت اور اپنے آخری نبیؐ کی بعثت کے لیے اہل عرب کو ہی کیوں منتخب فرمایا ؟

مشہور مصری مؤلف لطفی جمعہ نے اپنی کتاب "ثورۃ الاسلام وبطل الانبیاءؐ" کا آغاز ہی اس طرح کیا ہے :

فی تاریخ العالم وقصص الحضارۃ الانسانیۃ وفی اخبار العمران وانباء المدنیات القدیمۃ والحدیثۃ صفحات غامضۃ والغاز معقدۃ یقف الباحث والقارئ حیالها مدھوشا حائرا ....

.... ومن ھذہ الالغاز المعقدۃ اختیار العنایۃ الالھیۃ جزیرۃ العرب لتکون مشرقا لانوار النبوۃ ومصدر الرسالۃ الانسانیۃ ومھد الحضارۃ العربیۃ ؟

دنیا کی تاریخ، انسانی تمدن کی داستان اور قدیم و جدید تہذیبوں کی کہانی میں کتنے ہی ناقابلِ توجیہہ واقعات اور پہیلی یا معمہ سے بھی زیادہ حیران کن چیزیں سامنے آتی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر یا سُن کر آدمی محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ ....

.... اور اسی قسم کے ناقابلِ فہم معموں میں سے یہ چیستان بھی ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے انوارِ نبوت و رسالت کی تجلی گاہ بنانے کے لیے جزیرۃ العرب کو ہی کیوں منتخب کیا ؟ (لطفی ص۲)

اور کچھ آگے چل کر اہلِ عرب کا عموماً اور قریش کا خصوصاً حوالہ دیتے ہوئے یہی سوال دہرایا ہے،

بِمَ اختارھم اللہ لیکونوا مصدر ھذا الدین و منبعہٗ
و منبعثہ دون سائر خلقہ ؟

آخر اللہ تعالیٰ نے باقی ساری مخلوقات کو چھوڑ کر ان لوگوں ہی کو کیوں اس دین
کا سرچشمہ اور اس کا مرکز و منبع بنانے کے لئے کیوں چن لیا ؟ (لطفی ص ۳۸)

اسی طرح سید سلیمان ندوی ؒ نے سیرۃ النبیؐ کی جلد چہارم میں عربوں کی خصوصیات اور
خیرالامم بننے کی صلاحیت کے عنوان سے ایک باب میں اس سوال کے جواب میں بحث کی ہے۔ اس
موضوع پر تازہ ترین اور بہترین بحث مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "نبیؐ رحمت" میں
کی گئی ہے۔ جس کے ایک باب کا عنوان ہے : "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۃ العرب
میں کیوں مبعوث ہوئے ؟"

اس قسم کے سیرت نگاروں نے اپنی اپنی دانش کے مطابق اس انتخاب ربانی کے لیے
اہل عرب کے دنیا کی دوسری قوموں سے زیادہ اہل اور مستحق ٹھہرنے کے مختلف
اسباب و نکات گنوائے ہیں مگر ان سب میں مشترک چیز اہلِ عرب کی بعض خاص
اخلاقی خوبیوں کا ذکر ہے جس نے ان لوگوں کی فطرتِ سلیمہ کو مسخ ہونے سے بڑی حد تک
محفوظ رکھا۔

یہ سوالات کہ آخر اللہ نے اُس وقت کی تمام مہذب اور متمدن قوموں کو چھوڑ کر
عرب کے ان گمنام صحرانشینوں کو اس منصبِ عظیم کے لئے کیوں چُن لیا ؟ اگر یہی نبیؐ
ہندوؤں، بدھوں، یہودیوں یا چینیوں، ایرانیوں اور رومیوں میں سے کسی ایک
میں مبعوث کر دیئے جاتے تو کیا وہی نتائج حاصل نہ ہوتے ؟ اور ویسا ہی انقلاب برپا نہ
ہو جاتا جو اہل عرب کے ذریعہ سے ہوا ؟ —— جو وقت کی "برترین" طاقتیں (SUPER
POWERS) تھیں کیا ان میں سے کوئی بھی بہترین امت بننے کے فرائض سرانجام نہیں دے
سکتی تھی ؟ کیے جا سکتے ہیں۔

بظاہر یہ سوالات لغو نظر آتے ہیں اس لئے کہ مصالح کلیۂ الٰہیہ کا احاطہ انسان کے
بس کی بات نہیں ہے۔ اور اسی لیے خود قرآن کریم نے اس مسئلے پر یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ
اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (الانعام ۱۲۴)
- اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کا پیغام کہاں اور کس کے حوالے
کیا جائے۔

اس اندازِ فکر سے غالباً ایک اور سوال کا جواب سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں آج اللہ کی کتاب اور اس کے آخری نبیؐ سے انتساب اور اسلام اسلام کے نعرہ ہائے بے حد وحساب کے باوجود ان کے فیوض و برکات سے اکتساب کی علامات کیوں نایاب ہوتی جا رہی ہیں؟ ——— کیا ہم کہیں عہد جاہلیت کے یہود و ہنود یا روم و عجم کی طرح بعض ایسی بنیادی اقدار سے تو منحرف نہیں ہو گئے جن کو نبوت سے اکتساب فیض کی شرط قرار دیا جا سکتا ہے؟

کہیں فساق کے اخلاق اپنا کر ہم آیاتِ مندرجہ ذیل کا مصداق تو نہیں بن رہے مثلاً:

کالذین اوتوا الکتب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم۔ وکثیر منھم فاسقون (الحدید: ۱۶)

ان لوگوں کی طرح جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان کی اکثریت فاسقوں کی ہے۔

وما یضل به الا الفاسقین ۝ الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقه و یقطعون ما امر اللہ به ان یوصل و یفسدون فی الارض۔ اولٰئک ھم الخاسرون (البقرہ: ۲۷)

اور وہ اس سے گمراہ کرتا (بھی) ہے تو ان بدعملی لوگوں کو جو پکا قول قرار کیے پیچھے خدا کا عہد توڑ دیتے اور جن جن تعلقات کے جوڑے رکھنے کو خدا نے فرمایا ان کو توڑتے ہیں اور زمین میں بدعنوانیاں پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ (آخرکار) نقصان اٹھائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اہل عرب کی جس طرح کایا پلٹ دی وہ عجائباتِ تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ عربوں کی اس قلبِ ماہیت اور تاریخ عالم کے اس سب سے حیرت انگیز انقلاب کی اہمیت اور عظمت اور اس کے نتائج کی ہمہ گیری اور وسعت کو سمجھنے کے لئے سیرت نگار ظہور اسلام کے وقت دنیا بھر کی عموماً اور اہل عرب کی خصوصاً دینی، معاشی، سماجی اور اخلاقی حالت ——— بلکہ ان سب حالتوں کی ابتری کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق اخلاقی حالت سے ہے عجمی یعنی غیر عرب اقوام کی ناگفتہ بہ اخلاقی حالت کا بیان یوں تو کم و بیش سیرت یا تاریخ اسلام کی ہر ایک کتاب میں مل جاتا ہے۔ لیکن ان تمام اخلاقی خرابیوں کی اصل اور اساسی

وجہ کا تجزیہ اور تذکرہ جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں کیا ہے کسی اور کتاب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اور اگرچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانے کی اصطلاحات اور دور کے رسم و رواج کی زبان میں بات کی ہے مگر معناً یہ بڑی حد تک آج ہم پر منطبق ہوتی نظر آتی ہے، بلکہ اس میں ہماری اخلاقی بیماری کی صحیح تشخیص نظر آتی ہے ———— حضرت دہلویؒ کا یہ بیان اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ان کے بعد آنے والے مؤلفین کو اس موضوع (چھٹی صدی مسیحی میں اقوام و مذاہب عالم کی حالت) پر لکھتے ہوئے جدید یورپی مطبوعات و تالیفات سے استفادہ اور دائرہ ہائے معارف (انسائیکلوپیڈیا) کے ذریعہ سے اپنی معلومات میں اضافے کا موقع ملا جن کا شاہ صاحب کے زمانے میں کہیں وجود تک نہ تھا۔ اس لحاظ سے ان کا یہ بیان تاریخ اور فطرت انسانی کے بارے میں ان کے علم لدنی کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

یہاں بوجہ قلت وقت حجۃ اللہ البالغہ کے اس اقتباس اور اس کے ترجمے کو حذف کیا جاتا ہے جو حجۃ اللہ کے مکتبہ المثنیٰ بغداد کے ایڈیشن کی جلد اول کے صفحہ ۲۲۰ — ۲۲۲ سے لیا گیا تھا۔

حضرت شاہ صاحب کی اس ساری تحلیل و تفصیل سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تعیش پسندی، تن آسانی اور دنیوی لذائذ و مفاخر کی خاطر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے لوگوں کے لئے بحیثیت ایک قوم یا ملت کے (کیونکہ غیر معمولی افراد کی قلیل تعداد تو ہر جگہ ممکن ہے) نبوت سے اکتساب فیض کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں خصوصاً اس درجے کا اکتساب جس سے خیر الامم بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے (جیسا کہ صحابہ کرامؓ کی صورت میں ہوا) یہ تو ہرگز ممکن نہیں ہوتا ———— اور شاید یہی وجہ تھی کہ مشیت الٰہی نے ان اقوام کو اس منصب عظیم کا اہل نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اب دوسری طرف اگر اہل عرب یعنی ان لوگوں کے قبل از اسلام رذائل و فضائل پر ایک نظر ڈالیں جو فیضان نبوت کی بدولت بہترین امت بن گئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دینی حالت تو ناگفتہ بہ تھی ہی ان کی اخلاقی حالت بھی سخت دگرگوں تھی۔ اور سیرت نگاروں نے بجا طور پر اسے "شب ظلمت"، "عرب کا تاریک دور" اور "فساد بر و بحر" وغیرہ عنوانات کے تحت اس کی کیفیت بیان کی ہے۔

یہ لوگ بغض و انتقام، سنگدلی و سفاکی، چوری اور رہزنی، قتل و غارت، بے حیائی و بدتمیزی، زنا اور فواحش، نسبی تعصب و غرور، قمار بازی و شراب نوشی اور دختر کشی و

سود خوری میں ضرب المثل تھے اور ان سب معائب کی تفصیل سے ادب و تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

لیکن سب معائب اور ساری خرابیوں کے باوجود مختلف عوامل نے ان کے اندر بنیادی اور اصولی اخلاق کے احساس کو بالکل مردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ محاسنِ اخلاق سے یکسر معرّٰی نہ تھے بلکہ اخلاقی تعلیمات کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نظامِ اخلاق کے بدترین اجزا میں بھی اخلاقِ حسنہ کی ایک جھلک موجود تھی۔ شراب نوشی اور قمار بازی فیاضی اور سخاوت کا مظہر تھی۔ دختر کشی کا رواج غیرت کا نتیجہ تھا۔ اور قبائلی عصبیت دراصل قومی حمیت کی ہی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ غیرت، پابندیٔ عہد، شجاعت، فیاضی اور صلہ رحمی ان کے معروف اخلاق تھے۔ اسی طرح وہ معروف (بھلائی)، امانت، صدق الحدیث (راست گوئی) اور عفاف (پاکدامنی) کو کرم الخلق اور خصال الخیر میں شمار کرتے تھے۔ اور جس آدمی میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اسے توقیر و تکریم کا مستحق سمجھتے تھے۔

یہ درست ہے کہ ان کے ہاں اخلاقِ حسنہ کی بنیاد زیادہ تر شہرت طلبی، حبِ جاہ اور ناموری پر تھی۔ تاہم ان کے اخلاق و اعمال میں ایسے عناصر و اجزا بھی شامل تھے جنہیں اسلام نے بھی محاسن و مکارم شمار کیا ——— مشہور حدیث: خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا (الجامع الصغیر ج ۲ ص ۹۵) میں اسی "تحویلِ قبلۂ اخلاق" کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ دوسری جگہ خود حدیث میں ہی خیارکم کی تفسیر "خیارکم احاسنکم اخلاقاً" سے کی گئی ہے (الجامع الصغیر ج ۲ ص ۹۵)

دورِ جاہلیت کے جن واقعات و حوادث میں اہلِ عرب خصوصاً اہلِ مکہ کے اخلاقی محاسن کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے اس کی ایک مثال تاریخ نے "حلف الفضول" کی صورت میں محفوظ رکھی ہے۔ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر منعقد ہونے والے اس حلف میں (جس کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو) شامل ہونے والے قریش کے بعض شریف خانوادوں کے نمائندوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ مکہ میں ظلم اور ناانصافی کے واقعات کو محض غیر جانبدار مبصر یا خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھیں گے۔ بلکہ مظلوم کی عملی اور ٹھوس مدد کیا کریں گے۔

یہ حلف جسے سیرت نگار "اکرم حلف وا شرفه سمع به فی العرب" (عربوں کی تاریخ کا سب سے شریفانہ اور بہترین معاہدہ) قرار دیتے ہیں۔ ابن ہشام کے مطابق اس کے اغراض و

مقاصد یوں تھے:

فتعاقدوا و تعاهدوا الا یجدوا بمکة مظلوماً من اهلها وغیرهم ممن دخلها من سائر الناس الا کانوا معه و کانوا علی من ظلمه حتی ترد علیه مظلمته۔

(سیرت ابن ہشام ج ا ص ۱۴۲ - ۱۴۳)

انھوں نے عہد و پیمان باندھا کہ مکہ میں مقامی یا غیر مقامی جس آدمی پر بھی وہ کوئی ظلم ہوتے دیکھیں گے تو وہ سب مل کر مظلوم کی مدد کریں گے۔ اور ظالم کو مجبور کر دیں گے کہ وہ مظلوم پر کیے گیے ظلم کی پوری پوری تلافی کرے۔

کہا جا سکتا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ اس معاہدے کا دائرۂ نفاذ بہت محدود تھا۔ اس کا مقصد صرف حرم مکہ میں مظالم کی روک تھا۔ اور اس کا فائدہ بھی بالآخر اہل مکہ ہی کو تھا۔ تاکہ حرم کی عزت و حرمت لوگوں کے دلوں سے کم نہ ہونے پائے۔ (نطقی ص ۱۴۵)

مگر حضرات! کیا اپنے وطن عزیز کے کسی ایک شہر بلکہ کسی گاؤں میں بھی اس طرح کا کوئی ادارہ یا تنظیم قائم ہے؟۔ چلیے اپنے وطن یا شہر کی ساکھ کی خاطر ہی سہی۔ حالانکہ ایسا کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔

پھر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس معاہدے کے شرکاء نے اپنی بات کو صدق دلی اور بے لاگ منصفانہ قوت کے ساتھ نافذ بھی کیا تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت ابن کثیر جلد ا ص ۲۶۰ - ۲۵۹)۔

آج یو این او اور سلامتی کونسل تک میں مہذب ترین لوگ انصاف اور حق کو کس طرح اپنی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں، اسے سامنے رکھیں تو حلف الفضول منعقد کرنے والوں کی اخلاقی قوت، ان کی فطرتِ سلیمہ کا وزن اور ان کے اندر خیر الامم کے ہراول دستوں میں شمولیت کے شرف کی اخلاقی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

آقائے دو جہاں ﷺ خود بھی (بعمر ۲۰ سال) عربوں کے اس سب سے شریفانہ معاہدے میں شامل ہوئے تھے۔ آپؐ اس معاہدے سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپؐ نے اس کی تعریف و تحسین کی۔

الغرض اگرچہ اہل عرب کی خوبیاں بھی جاہلی رذائل کے خس و خاشاک میں دب کر رہ گئی تھیں تاہم یہ ثابت ہے کہ ان میں بعض نہایت اچھے اخلاقی اوصاف موجود تھے۔ کم از کم حفاظتِ حق اور اعانتِ مظلوم کی حد تک تو آج کی متمدن ترین اقوام بھی ابھی تک عرب جاہلیت سے بھی کچھ نیچے

ہی کے درجے پر ہیں ۔۔ بقول امین دودیار (صور ص ۱۱۳) اہل عرب کی مثال ایک ایسی زرخیز زمین کی تھی جو کاشت ونگہداشت کے نہ ہونے کے باعث خود رو خاردار جھاڑیوں کا جنگل بن گئی تھی ان میں خیر کے سوتے اٹ ضرور گئے تھے مگر بالکل خشک نہیں ہوئے تھے ۔۔ وہ ایک ایسا بیج تھے جو قوت نمو سے محروم نہیں ہوا تھا۔ ہادی برحقؐ نے اس قوم کے ان اخلاقی محاسن کو تربیت دیکر مکارم اخلاق کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ واقعی وہ ایک طرح سے اس کے اہل اور حقدار ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وکانوا احق بها واهلها (الفتح ۲۶)

ہمارے اس موقف کی ۔۔ کہ نبوت سے اکتساب فیض کے لیے اخلاقی خوبیاں ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہیں ـــــــــــ تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہونے والے لوگ اخلاقی محاسن کے مداح بھی تھے اور ان سے متصف بھی۔ سب سے پہلے ام المومنین خدیجہؓ کا معاملہ دیکھئے وہ جاہلیت میں اپنی پاکبازی کے باعث طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔

کانت تدعی فی الجاهلية بالطاهرة لشدة عفافها وصيانتها (ابن ہشام ج ۱ ص ۱۷۸ (حاشیہ)

وہ زمانۂ جاہلیت میں اپنی پاکیزگی اور پاکدامنی کے باعث طاہرہ کہہ کر پکاری جاتی تھیں۔

حضرت خدیجہؓ کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی رغبت کا باعث بھی آنحضورؐ کے اخلاقی محاسن تھے۔

حضرت خدیجہؓ نے نکاح سے قبل ایک عورت کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کرنے کے بعد آپ کو گھر بلوایا اور مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنا رشتہ خود پیش کیا۔

یا ابن عم! انی رغبت فیک لقرابتک وسطتک فی قومک وامانتک وحسن خلقک وصدق حدیثک (ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۹)

اے میرے چچازاد! میرے اندر آپ کی طرف میلان کئی وجوہ سے پیدا ہوا ہے۔ انہ الجملہ یہ کہ آپ سے میری برادری کی رشتہ داری بھی ہے۔ آپ اپنی قوم میں صاحب عزت بھی ہیں ان سب پر مستزاد آپ کی امانت، اخلاق اور راست گفتاری ہے۔

پہلی وحی کے نزول اور بعثت کے ابتدائی ایام میں جو واقعات و حالات پیش آئے تھے

ان کی بنا پر حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں تسلی دی تھی:

کلا واللہ! ما یخزیک اللہ ابدا، انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقوی الضیف وتعین علی نوائب الحق۔

(تجوید البخاری ص ۴)

ہرگز نہیں بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا آپ رشتہ داری کا پاس لحاظ کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں، محتاجوں کے کام آتے ہیں، مہمان نوازہیں اور راہ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں۔

مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے اُن کے بارے میں بھی سیرت نگار لکھتے ہیں:

...... کان (ابوبکرؓ) ....

رجلاً تاجرا ذا خلق ومعروف ....

..... حضرت ابوبکرؓ .... ایک

با اخلاق اور نیک دل تاجر تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قبل اسلام اخلاقی محاسن کی ایک گواہی ابن الدغنہ کے بیان میں ملتی ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ قریش کی ایذارسانی سے تنگ آکر ابوبکر صدیقؓ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر غالباً حبشہ کی طرف ہجرت کے لئے روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ سے دو ایک دن کے فاصلے پر انھیں ابن الدغنہ ملا (اصل نام سبیعہ بن ربیع تھا اور وہ اس وقت احابیش کا سردار تھا، جو ایک مجموعہ قبائل تھا) اس نے پوچھا این یا ابو بکر۔ کہ تم کہاں چلے؟ جب انھوں نے بتایا:

اخرجنی قومی فآذونی وضیقوا علیّ۔

کہ میری قوم نے مجھے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انھوں نے مجھے بہت ہی اذیت پہنچائی اور سخت مصیبت میں ڈال دیا۔

تو ابن الدغنہ نے کہا:

ولِمَ؟ فواللہ انک لتزین العشیرۃ وتعین علی نوائب الحق وتفعل المعروف وتکسب المعدوم ارجع فانت فی جواری

(ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۲ – ۳۷۳)

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بخدا آپ تو قبیلہ کے مایۂ ناز فرزند ہیں آپ مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہیں نیکی اور بھلائی کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور محتاجوں کے کام آتے ہیں۔ واپس چلیے میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔
ہم ان دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ تمام "سابقین اولین" صحابہ کرامؓ میں قبل از اسلام ہی کسی نہ کسی خاص اخلاقی خوبی کے وجود پر دلالت کرنے والے واقعات مل سکتے ہیں۔

اور شاید اہل عرب کی محاسن شناسی اور محاسن پذیری کی اس صلاحیت اور اعمال و اخلاق میں حسن و جمال کی ستائش کی اہلیت کی بنا پر ہی ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاکؐ کے محاسن و فضائل کے جمال بے مثال میں سے آپؐ کے ہم وطنوں کو سب سے پہلے آپؐ کے "خلق عظیم" ہی کی وہ جھلک دکھائی جس نے ان کے دل موہ لیئے تھے۔ آنحضرتؐ کا قبل از بعثت ہی اپنے نام کے بجائے الصادق اور الامین کے لقب سے پکارا جانا تو سیرت کے مبتدی طالبعلم کو بھی معلوم ہے (عیون الاثر ج ۱ ص ۴۴) مگر حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کے صاحب خلق عظیم ہونے کا تعلق بھی آپؐ کی قبل از بعثت زندگی سے ہے۔
تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اخلاقیات نبوی کے کسی بھی بیان میں آیت کریمہ:

وانک لعلی خلق عظیم

(کہ آپؐ کی اخلاقی عظمت تو یقیناً ایک مسلّم امر ہے) کو کورس کے بند کی حیثیت حاصل ہے اس آیت سے اور اس کی تفسیر میں حضرت عائشہ سے مروی مشہور حدیث:

کان خلقه القرآن

(کہ آپؐ کا اخلاق تو قرآن تھا) سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ کے اخلاق کی تشکیل اور مکارم کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعے اور اس کے مطابق ہوئی — مگر حضرات! قابل غور بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ وانک لعلی خلق عظیم سورہ القلم کی چوتھی آیت ہے اور اس بات پر قریباً سب اہل علم کا اتفاق ہے کہ سورہ القلم بلحاظ نزول قرآن کریم کی دوسری یعنی بالکل ابتدائی دور کی مکی سورت ہے اور یہ آیت مبارکہ (وانک لعلی خلق عظیم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر سب سے پہلی عقلی دلیل ہے جو قرآن کریم نے پیش کی ہے۔
(اس مضمون کی دوسری آیات جو سورۃ یونس اور سورۃ عنکبوت میں آئی ہیں وہ بھی مکی

دور کی ہیں مگر بعد کی ہیں)

قرآن حکیم کا آپؐ کے خلقِ عظیم کو بطور دلیلِ نبوت پیش کرنے سے مذہبی پہلو کے علاوہ چند مزید امور سامنے آتے ہیں از انجملہ:

۱ - اولاً یہ کہ — اہلِ مکہ (جو جاہلیت عرب کے رذائل و فضائل کے نمائندہ قرار دیے جا سکتے ہیں) میں اتنی اخلاقی حس ضرور تھی کہ وہ اخلاقی عظمت پر مبنی اس استدلال سے قائل کیے جا سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ کے اخلاق عالیہ کی طرف یہ بلیغ اشارہ کرنے کے بعد اسی صورت کی اگلی آیات (۱۰ تا ۱۴) میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو آدمی مجموعۂ رذائل ہو، چاہے وہ کتنا ہی صاحب جاہ و مال ہو اسے ہیچ سمجھو۔ فرمایا:

فَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝

(القلم ۱۴ - ۱۰)

ہرگز نہ دبو اس شخص سے جو قسمیںؐ کھانے والا، پست فطرتؑ، طعنہ جوؐ، چغل خورؑ مانع خیرؐ، دھاندلی بازؑ، بدعملؑ، جفا کارؑ اور سا تھ ہی بداصلؑ بھی ہے محض اس بنا پر (جوہدری بنا پھرتا ہے) کہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مخاطبینِ "خلق عظیم" اور ان آیات میں بیان کردہ رذائل تسعہ کے تغایر اور تباین کو (CONTRAST) سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

۲ - ثانیاً یہ کہ — اس آیت (وانک لعلی خلق عظیم) کے مضمون اور اس کے زمانۂ نزول کو سامنے رکھنے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرتؐ قبل از بعثت ہی صاحبِ خلق عظیم تھے۔

محمد عزت دروزہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

وهذا يعني الخلق العظيم الذي كان عليه النبي عليه السلام ومستحق بهذا الثناء الرباني، قد كان تحلّى به قبل البعثة وهو الذي أهّله للاصطفاء والمهمة العظمى والله أعلم حيث يجعل رسالته (التفسير الحديث ج ۱ ص ۵۴)

اور یہ خلق عظیم جس کی بنا پر آنحضورؐ اس ثنائے ربانی کے مستحق ٹھہرے: اس سے آپ یقیناً قبل از بعثت آراستہ ہو چکے تھے۔ بلکہ اسی چیز نے آپ کو اس برگزیدگی

اور اس منصب عظیم کا اہل بنا دیا تھا اور یوں تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی رسالت کے لیے کون اور کتنا موزوں ہے ؟

یوں لگتا ہے کہ قرآنِ کریم نے آنحضور ؐ کے خلق کی تشکیل یا تکمیل نہیں کی بلکہ اسے تدریجاً نمودار UNFOLD کیا ہے۔ قرآن و سنت میں اخلاقیات پر جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کے خدو خال کی مکمل تصویر کشی ہے۔ اور اسی لیے آپ کی ذات گرامی کو امت کے لیے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا۔ خود اسوہ کے لفظ میں عمل اور کمال کی موجودگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

۳ - ثالثاً یہ کہ ـــ اتنی بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ نبوتِ محمدی ؐ (علی صاحبہا السلام) کی صداقت پر جملہ عقلی و نقلی دلائل کی تبلیغ و اشاعت مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اس لیے عہد رسالت اور قرنِ اوّل کی طرح آج بھی دنیا کے سامنے صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف دو ہی معجزوں کو پیش کرنا کافی ہے ـــ ایک قرآن دوسرے اخلاق النبی ؐ۔ ابتدائے اسلام میں جو بھی مسلمان ہوا وہ یا قرآن سن کر متاثر ہوا، یا نبی ؐ کا خلق عظیم دیکھ کر۔

اہلِ مکہ خلق محمدی ؐ کا مشاہدہ کر سکتے تھے ـــ مابعد النبی ؐ ادوار میں دنیا کو اس کا مشاہدہ کرانے کی ذمہ داری امت پر ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت مبارکہ (انک لعلی خلق عظیم) کا تقاضا یہ ہے کہ ایک طرف اخلاقیات نبوی ؐ سے متصف اور متخلق ہونا ہر مسلمان پر (حسب استطاعت) فرض عین ہے اور دوسری طرف اخلاقیات نبوی کا مطالعہ اور اس کی تبلیغ و اشاعت سب مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

۴ - رابعاً یہ کہ ـــ آج بھی اسلام کی تبلیغ ان ہی لوگوں میں اور ان ہی قوموں میں زیادہ مفید اور موثر ہو گی جن کی اخلاقی حس زندہ ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کی اشاعت کے لیے اس کے غلبہ کا دورِ ثانی لانے کے لیے اور فیوض و برکات نبوت کو پھیلانے کے لیے حرف اور صرف گرمیٔ گفتار، پروپیگنڈا اور اشتہار یا محض مذاکرے اور سیمینار نہیں، بلکہ اس کے ساتھ سب کے مشاہدہ اور تجربہ میں آنے والی زبردست اخلاقی قوت درکار ہو گی ـــ اسلام جہاں بھی پہنچا ہے زیادہ تر صلحائے امت کے اخلاق و کردار کی بدولت پہنچا ہے۔

یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا سے ہی صرف اخلاقی تنظریاتی تعلیم نہیں بلکہ عملی اخلاق پر زور دیا ـــ اور توحید و رسالت، آخرت پر ایمان کی طرح محاسن اخلاق سے عملاً مزین ہونا مسلمانوں کی ایک لازمی خصوصیت ـــ یا بالفاظ دیگر نبوت سے

اکتسابِ فیض کی علامت قرار دیا ایسے ہے کہ یوں تو قرآن کریم کی متعدد آیات اور عہد رسالت کے بکثرت واقعات اور صحابہ کرام کے کارنامہ ہائے حیات میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے ۔ مگر ابتدائی دور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔

۱ ۔ حضرت ابوذر غفاریؓ پہلے پانچ یا سات مسلمانوں میں سے ہیں انہوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے بارے میں سنا تو اپنے بھائی کو دریافت احوال کے لیے مکہ بھیجا ۔ تو اس نے واپس جاکر آنحضورؐ کے بارے میں بھائی کو یہ رپورٹ دی تھی :

انہ یامر بالمعروف و ینھی عن المنکر و یأمر بمکارم الاخلاق (طبقات ج ۴ ص ۲۲۴)

وہ بھلائی کا حکم دیتا ، برائیوں سے منع کرتا ہے اور مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے ۔

یہاں اخلاق کے ضمن میں "تعلیم" ، "تلقین" یا "تبلیغ" وغیرہ کے بجائے امر کا لفظ قابلِ غور ہے ۔ اخلاق کا تعلق محض فکر و دانش سے نہیں قوتِ عمل سے ہے ۔ یہ کچھ پڑھنے کی مشق نہیں بلکہ کچھ کرنے کی تربیت کا نام ہے ۔

۲ ۔ ہجرت حبشہ ۵ نبوی میں ہوئی ۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ بن ابوطالب نے اپنے معروف خطبہ میں جس طرح جاہلیت کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ اسلام کا تعارف کرایا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور اصلاحِ عقائد کا کام ساتھ ساتھ اور ابتداہی سے شروع ہو گیا تھا بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت سے اکتسابِ فیض کے بعد مسلمانوں کے عقائد و افکار کے ساتھ ان کے اعمال اور اخلاق میں کیا تبدیلی آجاتی تھی ۔ اس خطبہ کے جستہ جستہ فقرے قابلِ غور ہیں ۔ کہا :

ایھا الملک کنا قوما اھل جاھلیۃ نعبد الاصنام و نأکل المیتۃ و نأتی الفواحش و نقطع الارحام و نسیئ الجوار و یأکل القوی منا الضعیف . . . .
. . . . حتی بعث اللہ رسولا منا نعرف نسبہ و صدقہ و امانتہ و عفافہ . . . .
فدعانا الی اللہ لنوحدہ و نعبدہ و لا نشرک بہ شیئاً . .
. . . . و یامرنا بصدق الحدیث و اداء

بالامانة وصلة الرحم وحسن الجوار والکف عن المحارم والدماء ونهانا عن الفواحش وقول الزور واکل مال الیتیم .... فآمنا به ....
واتبعناہ .... وحرمنا ما حرّم علینا وحللنا ما احل لنا ۔ (سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱ ـ ۱۸ ملخصاً)

اے بادشاہ! ہم پروردۂ جاہلیت قوم تھے، بتوں کو پوجتے، مُردار کھاتے اور بے حیائیوں میں مبتلا تھے رشتہ داروں کا حق مارتے تھے اور ہمسایوں کو دکھ دیتے تھے اور ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو پھاڑ کر کھا جاتا۔ .... پھر اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے خاندان حسب و نسب اور جس کی سچائی، امانت اور پاکبازی سے ہم پہلے سے واقف تھے ....
انھوں نے ہم کو ایک اللہ پہ ایمان لانے اور صرف اسی کی عبادت کرنے کی دعوت دی .... اور انھوں نے ہم کو سچ بولنے، امانت ادا کرنے، رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے، پڑوسی سے حسن سلوک کرنے، ناجائز اور حرام باتوں اور خونریزی سے پرہیز کا حکم دیا۔ بے حیائی کے کاموں، جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے منع فرمایا ....
پس ہم ان پہ ایمان لائے اور ان کی پیروی کی ....
جو انھوں نے حرام قرار دیا اسے حرام مانا اور جو انھوں نے حلال بتایا اس کو حلال تسلیم کیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق کی اہمیت یوں بھی واضح فرمائی کہ بعض دفعہ آپؐ زمانہ جاہلیت کے اصحاب مکارم و محاسن کی قدر دانی فرماتے اور ان کے اخلاقی کردار کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔

۱ - عبداللہ بن جدعان (بانیٔ حلف الفضول) کو آپؐ نے کئی دفعہ تعریف بھرے الفاظ سے یاد فرمایا۔ حالانکہ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ جس آدمی نے (ایمان لاکر) زندگی میں ایک دفعہ بھی: اللهم اغفرلی خطیئتی یوم الدین نہ کہا ہو اس کی مغفرت کیسے ہو؟

۲ - اسی قسم کا ایک واقعہ حاتم طائی کی بیٹی کا ہے وہ اسیر ہو کر جنگی قیدیوں کے ساتھ آئی

تھی۔ اُس نے آنحضورؐ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی:

یا محمّد! هلک الوالد وغاب الوافد۔ فان رأیت ان تخلی عنا فلا تشمت بی احیاء العرب فانی ابنة سید قومی وان ابی کان یحمی الذمار ویفک العانی ویشبع الجائع ویکسو العاری ویقوی الضعیف ویطعم الطعام ویفرج عن المکروب ولم یرد طالب حاجة قط . . . .

انا بنت حاتم طییٔ۔

فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم:

یا جاریة هٰذا صفته المومنین حقاً ولو کان ابوک اسلامیاً لترحمنا علیه ــ خلوا عنها! فان اباها کان یحب مکارم الاخلاق والله یحب مکارم الاخلاق

حضور میرا باپ رہا نہ فدیہ گزار۔ اگر مناسب جانیں تو مجھے رہا کر دیں اور قبائل عرب میں میری بے عزتی نہ ہونے دیں میں اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں۔

میرا باپ لوگوں کو مصیبت سے نکالتا تھا وہ نیک شہرت کا مالک تھا، مہمان نوازی کرتا تھا اور بھوکوں ننگوں کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ اور اس نے کبھی کسی حاجت مند کو خالی نہیں جانے دیا۔

میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بچی! یہ باتیں (جو تو نے بیان کیں) یہ تو ٹھیک ٹھیک اہل ایمان کی صفات ہیں۔ اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لئے دعائے رحمت بھی مانگتے۔ پھر حکم دیا اسے رہا کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کا باپ مکارم اخلاق کو پسند کرتا تھا ــ اور اللہ تعالیٰ بھی مکارم اخلاق کو پسند فرماتا ہے۔

یہ سن کر ایک صحابی ابو بردہ بن نیارؓ کھڑے ہوئے اور سوال کیا۔ یا رسول اللہ کیا مکارم اخلاق آپؐ کو۔۔ اسقدر پسند ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

والذی نفسی بیده لا یدخل احد الجنة الا بحسن الخلق۔

(سیرۃ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۳۲ ملخصاً)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ کوئی ایک آدمی بھی جنت میں حُسن عمل کے بغیر نہیں جائے گا۔

جب بھی ہم مکارم اخلاق اور اخلاقیات نبویؐ کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہمیشہ تعمیر کردار کا مثبت پہلو مراد ہوتا ہے۔ اس درجہ کے حصول کے لیے منفی پہلو یعنی رذائل سے اجتناب ضروری ہے ــــ سزا اور مذمت و ملامت سے بچنا ایک بات ہے مگر انعام اور مدح و ثناء کا حقدار ٹھہرنا عظیم تر بات ہے۔ قرآن کریم میں تعمیر اخلاق کے ان دو مراحل کو ہی "اجتناب کبائر" اور "مسابقت الی الخیرات" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱ - ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنه نکفر عنکم سیئاتکم وندخلکم مدخلا کریماً

یعنی جن باتوں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اگر تم ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہوگے تو تمہارے چھوٹے موٹے قصور محو کر دیں گے اور تم کو مقام عزت میں جگہ دیں گے۔

۲ - ولکل وجهة هو مولیها فاستبقوا الخیرات

اور ہر ایک (قوم) کا ایک مرکز توجہ (مطمح نظر) ہوتا ہے جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے۔ سو تم نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی تگ و دو کرو۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کی تربیت اور تکمیل کے لیے اسی ترتیب اور تدریج کو ملحوظ رکھا۔ آپؐ نے سب سے پہلے ان اصولی اور بنیادی اخلاق پر زور دیا جو کم و بیش ہر معاشرے کے سلیم الفطرت افراد میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے افراد میں اسلام کی طرف ایک فطری کشش موجود ہوتی ہے۔ اور ایسے شخص میں نبوت سے اکتساب فیض کی ایک شرط یا اہلیت اور فطری استعداد موجود ہوتی ہے۔

دوسرے درجے پر وہ لوگ آئے جن میں پہلے سے یہ شرط یا وصف اخلاق عملاً موجود نہ تھا۔ نبیؐ سے تعلق ایمان قائم ہو جانے یعنی اسلام قبول کرنے یا اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اب وہ کم از کم ان بنیادی اور اصولی اخلاق کی پابندی لازماً اختیار کریں ــــ اسلام لانے کے بعد مسلمان کہلانے کے بعد بھی اخلاق کا روز بروز بہتر نہ ہوتے جانا اگر مطلق ایمان کے فقدان کا نہیں تو کم از کم نبوت کے فیض سے محرومی کا نشان ضرور ہے۔

آنکہ از صدق و امانت بے خبر — از رہِ تمہیدِ رسالت بے خبر
کار او گفتارِ بے کیفِ عمل — از نیامِ علم بے سیفِ عمل
لذتِ ایماں فزاید در عمل — مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل (اقبال)

نبوت سے اکتسابِ فیض کا بلند ترین مرتبہ مکارمِ اخلاق ہیں جنہیں مقصودِ بعثتِ نبوی کہا گیا ہے۔

حدیث شریف ہے:

بعثتُ لاتمم مکارم الاخلاق

(و فی روایۃ) محاسن الاعمال

میں مکارم الاخلاق کو (یا محاسن الاعمال کو) مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

مسلمان ہوتے ہوئے بھی مکارمِ اخلاق کے اعلا درجے تک نہ پہنچ سکنا فیضِ نبوت سے یکسر محرومی نہ سہی "کم نصیبی" کی علامت ضرور ہے۔ علامہ اقبال نے رموزِ بے خودی میں گداگر کے واقعہ میں اپنے باپ کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

آنکہ مہتاب از سرانگشتش دو نیم — رحمت اد عام و اخلاقش عظیم
از بہارش رنگ و بو باید گرفت — بہرۂ از خُلق او باید گرفت

ایک حدیث میں (جس کا متن اس وقت مستحضر نہیں) آیا ہے کہ اگر تم اللہ کے ہاں اپنا درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو بس یہ دیکھ لو کہ تمہارے دل میں اللہ کا درجہ کیا ہے؟ اتنا ہی اس کے ہاں تمہارا درجہ ہے۔ اسی طرح اگر یہ دیکھنا ہو کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ہمارا درجہ کیا ہے؟ (کیونکہ مصطفےٰؐ سے بُعد ہی تو بولہبی ہے) تو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ہم نے اخلاقیاتِ نبوی سے کتنا حصہ پایا ہے؟ اسی لیے کہ خود مولائے حقؐ نے فرمایا:

ان احبکم الیّ واقربکم منی یوم القیامۃ احاسنکم اخلاقاً و ان ابغضکم الیّ وابعدکم منی یوم القیامۃ مساویکم اخلاقاً

(مشکوٰۃ طبع دمشق ص ۷۹۴)

قیامت کے دن تم میں سے مجھے سب سے زیادہ پسند اور میرے زیادہ قریب وہ ہوں گے جو تم میں سے بلحاظ اخلاق زیادہ اچھے ہوں گے اور قیامت کے دن تم میں سے مجھے سب سے زیادہ ناپسند اور مجھ سے زیادہ دور وہ ہوں گے جو تم میں سے بلحاظ اخلاق زیادہ بُرے ہوں گے۔

مفتاح المراجع

اس مقالے کی تیاری میں جو کتابیں سامنے تھیں ان میں سے اکثر کا ذکر متن میں حوالہ دیتے وقت مختصر نام کے ساتھ کیا گیا - اس کی وضاحت ذیل میں کی گئی ہے - کتابوں کے نام اسی ترتیب سے ہیں جس طرح مقالہ میں وہ وارد ہوئے ہیں - قرآن کریم کے حوالے سورۃ کا نام آیت نمبر کے ساتھ دیے ہیں -

لطفی : لطفی جمعہ کی کتاب : "ثورۃ الاسلام وبطل الانبیاء" طبع قاہرہ ۱۹۵۹ء

نبی رحمت : مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تالیف کا (اردو ترجمہ) طبع لکھنؤ ۱۹۷۸ء

حجۃ اللہ البالغہ : حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور تصنیف - ایڈیشن مکتبہ المثنیٰ بغداد سنہ ندارد

الجامع الصغیر : مولفہ جلال الدین سیوطیؒ طبع مصر سنہ ندارد

ابن ہشام : سیرت رسول اللہﷺ تصنیف عبدالملک بن ہشام طبع مصر (تحقیق السقا وغیرہ) ۱۹۵۵ء

جواہر : جواہر البخاری : تلخیص بخاری از مصطفٰے عمارہ طبع مصر ۱۳۷۶ھ

التفسیر الحدیث : تالیف محمد عزت دروزہ - طبع مصر ۱۹۶۲ء

طبقات : الطبقات الکبریٰ تالیف محمد بن سعد طبع بیروت ۱۹۷۰ء

ابن کثیر : السیرۃ النبویہ تالیف حافظ ابن کثیر تحقیق مصطفیٰ عبدالواحد طبع بیروت ۱۹۷۶ء

رموز : رموز بے خودی (مثنوی) علامہ اقبال طبع لاہور سنہ ندارد

مشکوۃ : مشکواۃ المصابیح تالیف ابن الخطیب تبریزی طبع دمشق ۱۹۶۱ء

صور : صور من حیاۃ الرسولﷺ تالیف امین دویدار طبع مصر ۱۹۵۴ء

عیون الاثر : ابن سید الناس کی سیرۃ پر تالیف طبع بیروت ۱۹۷۸ء

اجتماعی عدل

جناب محترم ڈاکٹر سید معین الحق

اخلاقیات نبوی کا مطالعہ مختلف جہتوں سے کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیے، اور ہر جہت کے متعدد پہلو ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے نیز اُن اثرات کی روشنی میں جو اسلامی معاشرے کی تشکیل و ترقی میں نمایاں ہوتے رہے ہیں یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس کا مختصر بیان بھی ایک ایسے مقالے میں جس کو پیش کرنے کے لیے وقت محدود ہو، سمونا ممکن نہیں، اس لیے اس مقالے میں صرف چند اُن خصوصیات اور واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جن سے اسلام میں اجتماعی عدل اور مساوات کے تصور اور اس کی عملی شکل کا تاریخی پس منظر میں اندازہ لگانے کے سلسلے میں مدد مل سکتی ہے۔

اسلام تاریخ عالم کا عظیم ترین انقلاب ہے۔ اس نظریہ کی صداقت ثابت کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر شواہد موجود ہیں لیکن ہم اس موقع پر صرف چند واقعات کی طرف اشارہ کریں گے۔ اس انقلاب عظیم کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ہمیں معاشری اور فکری تاریخ کے بعض پہلوؤں کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا، خاص طور پر اُن خامیوں کا جن کی جڑیں بعثتِ نبویؐ کے وقت معاشرے میں اتنی گہری اور مضبوط ہوگئی تھیں کہ اخلاقی معیارات عملی طور پر تقریباً ختم ہو چکے تھے۔

اس بحث کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ انسانی مساوات اور اجتماعی عدل کا ہے، چونکہ نسلِ انسانی ایک ہی باپ کی اولاد سے وجود میں آئی تھی یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی دور میں سب انسان، حقوق اور حیثیت کے لحاظ سے برابر ہی رہے ہوں گے، لیکن زمانۂ ماقبل تاریخ کے طویل ادوار میں ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا عوامل اور محرکات تھے جن کے باعث انسان، غریب اور امیر اور کمزور اور طاقتور لوگوں کے طبقوں میں تقسیم ہوتا گیا۔ بہر حال تاریخی معلومات کی روشنی میں جب سے ہمیں انسانی زندگی کی حالت نظر آنی شروع ہوتی ہے تو یہ طبقاتی تقسیم صاف اور نمایاں طور پر دکھلائی دیتی ہے۔ انیشینٹ لا (ANCIENT LAW) کے مشہور مصنف میں (MAINE) کی اس رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ غلامی کی ابتدا انسان کی اس پیدائشی اور جبلی خصلت کا نتیجہ ہے کہ وہ دوسرے کی قوت اور صلاحیت کو اپنے آرام اور فائدے کے لیے استعمال کرنا

جاتا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ جہاں ایک طرف عیاشی، آرام طلبی، اقتدار کی ہوس اور خود غرضی پھیلتی جاتی ہے، دوسری طرف مساواتِ انسانی کا تخیل اور اس کو قائم کرنے کی کوششیں کم سے کمتر ہوتی جاتی ہیں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم متمدن اقوام کی معاشرتی زندگی پر ایک بدنما داغ طبقاتی تقسیم تھی، اور اس پہلو کا بدترین مظاہرہ غلامی اور اس کی وسیع پیمانے پر تجارت کی شکل میں موجود تھا۔ غلاموں کو جانوروں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ وہ اپنے آقاؤں کی دیگر منقولہ جائداد کی طرح ملکیت سمجھے جاتے تھے اور اُن کو (آقاؤں کو) ہر طرح کا، حتیٰ کہ جان لینے کا بھی حق تھا۔ طبقاتی تقسیم کا اثر امیر اور غریب طبقوں کی حیثیت اور اہلِ اقتدار اور عوام کی زندگیوں کے نمایاں فرق میں بھی نظر آتا تھا۔ سلطنتِ روم میں ایک طبقہ خصوصی اختیارات اور حقوق کا مالک تھا اور عام لوگ ان سے محروم تھے اور پلیبین (PLEBEIAN) کہلاتے تھے۔ اور ہمارا برصغیر تو اس لحاظ سے سب سے زیادہ طبقاتی تقسیم کا شکار رہا تھا۔ یہاں ذات کی تقسیم انتہائی حد کو پہنچ گئی تھی اور معاشرے میں اس کی جڑیں اس قدر گہری ہو گئی تھیں کہ آج تک وہی کیفیت موجود ہے اور شودر ذات کے لوگ اچھوت سمجھے جاتے ہیں۔ ان خطرناک طبقاتی تقسیموں نے مختلف علاقوں کے معاشروں کو مساواتِ انسانی کے تخیل بلکہ ذکر تک سے محروم کر دیا تھا، اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ طبقاتی تقسیم کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، بلکہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

اسلام جو انقلاب لایا اُس کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے یہ نکتہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ اصحابِ سیر اور مسلم مورخین نے زمانۂ جاہلیت کے صرف عرب معاشرے کی خرابیاں اور نقائص تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی بعثت اصلاحِ عالم کے لیے تھی۔ جیسا کہ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

(الانبیاء ، ۱۰۷)

سے صاف ظاہر ہے۔ تاریخ عالم کی بعض تحریکات و عوامل کا گہرا اور تحقیقی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن اقوام کے علاوہ جنہوں نے دین اسلام قبول کیا، دیگر اقوام نے بھی اسلام کے لائے ہوئے بعض انقلابی اصولوں کو تسلیم کیا ہے۔ تاریخ کے طلبہ جانتے ہیں کہ انسانی حقوق کے تین بنیادی اصولوں یعنی اخوت، مساوات اور آزادی کا مطالبہ یورپ میں فرانسیسی انقلاب یعنی ۱۷۸۹ء کے بعد کیا گیا، لیکن اسلام ان اصولوں کو ساتویں صدی میں منوا چکا تھا۔

انقلابِ اسلامی

اب ہم اسلامی انقلاب کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ان کے ذکر سے پہلے یہ واضح کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس عظیم انقلاب کے عظیم المرتبت قائد کی منفرد خصوصیت یہ تھی کہ جن اصولوں کی تعلیم دی جاتی تھی اس پر بدرجہ اتم خود آنحضرتؐ اپنی نجی اور اجتماعی زندگی میں عمل فرماتے تھے۔ حضورؐ کے اخلاقِ کریمہ کی تفصیلات ہمیں حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں لیکن سب سے زیادہ اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپؐ نے اپنی زندگی کی بنیاد فقر پر رکھی اور ہر وہ زحمت برداشت کی جس کا غریب آدمی کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وسیع فتوحات کے بعد بھی جب غنیمت کا مال بکثرت مدینہ آتا تھا، آپؐ نے اپنے اصولوں سے ذرہ برابر انحراف نہیں کیا، حکمرانی کے لوازمات یعنی تخت و تاج، رہائشی محل اور قیمتی پوشاک وغیرہ تو کیا آپؐ نے اپنے لیے خصوصی نشست کا رواج بھی نہیں ڈالا۔

اسلام کی سب سے پہلی اور بنیادی تعلیم عقیدۂ توحید پر مبنی تھی۔ ہم اس کے متعلق چند امور کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے دینی پہلو پر یعنی شرک اور بت پرستی وغیرہ کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے لیکن دنیوی امور پر اس کے اثرات کا جائزہ بہت کم مصنفین نے لیا ہے، دوسرا اہم اصول جو قابلِ غور ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلق یا موجودہ دور کے محاورے میں انگریزی زبان کی اصطلاح (SOVEREIGNTY OF ALLAH) سے متعلق ہے۔ مغربی تہذیب اور تصورات سے جو لوگ متاثر ہیں وہ ہمارے ان نظریات بالخصوص دنیوی امور میں ان پر عمل پیرا ہونے کے خیال سے سخت چراغ پا ہوتے ہیں۔ مغربی تہذیب نے خود کو ان پیچیدگیوں سے محفوظ رہنے اور دنیوی امور میں مطلق العنانی بسنتے کے لیے یہ اصول ایجاد کیا کہ مذہب کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں اور وہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ بہ الفاظ دیگر انھوں نے سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے علاحدہ اور بے تعلق تسلیم کر لیا۔ یہ ان کے لیے ممکن تھا کیونکہ ان کے پاس کوئی خدا کا دیا ہوا نظامِ حیات نہ تھا، اسلام نے برخلاف اس کے جو نظام دیا ہے وہ دینی اور دنیوی دونوں زندگیوں کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور اس کی نظر میں ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس اہم نظریہ کے تحت متعدد مسائل پر بحث کی جا سکتی ہے اور تاریخ کی روشنی میں اس کا وسیع پیمانہ پر تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مقالہ میں ہم مساوات اور اجتماعی عدل کے صرف چند گوشوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ ابتدائی حصے میں ذکر کیا گیا ہے، انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں جو تہذیبیں اور تمدنی نظام ہائے زندگی منظرِ عام پر آئے اور ان کی سرپرستی میں جو معاشرے وجود پذیر ہوئے ان کی مشترک اور

نمایاں خصوصیت طبقاتی تقسیم انسانی نظر آتی ہے۔ اس کی جڑ اور بنیاد انسان کی اس جبلی خواہش میں ملتی ہے کہ وہ خود کو دوسرے لوگوں سے بہتر اور بالاتر سمجھتا ہے اور دوسروں کی محنت اور کارکردگی کے فوائد اور نتائج اپنی عیاشی اور آرام طلبی کے اسباب مہیا کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ طبقاتی برتری قائم کرنے کے لیے مختلف اصول بنائے گئے جن میں نسل و رنگ، زبان، علمی استعداد اور طاقت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ برصغیر میں آریائی تہذیب کی سرپرستی میں جس معاشرہ نے جنم لیا اور پروان چڑھا اس میں پیشہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، ایک اور ذریعہ اس طبقاتی تقسیم کا پروہتائی نظام (PRIESTHOOD) تھا۔ تاریخ اس سے ناواقف نہیں کہ ہندوستان میں برہمنی برتری اور یورپ میں کلیسا اور ریاست کی کشمکش سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ جہاں تک حکمرانی کے اصولوں کا تعلق تھا، ان عوامل نے شاہی مطلق العنانی کی حوصلہ افزائی کی۔ ان حالات میں جمہوریت کا تو ذکر ہی کیا، جمہور کے حقوق کا بھی سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ حکمران کے الفاظ قانون بلکہ قانون سے بالاتر تصور کیے جاتے تھے، اور اس کے درباری اور فوجی سردار وغیرہ درجہ بدرجہ خصوصی حقوق اور اختیارات کے مالک بن جاتے تھے یا بنا دیے جاتے تھے اور عوام ہر طرح سے ان کی زیادتیوں اور مظالم کے نیچے پستے رہتے تھے۔

اب دیکھیے کہ اسلام کی انقلابی تعلیمات اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ اخلاق و اعمال نے انسانیت کے نام پر چھائے ہوئے ان داغوں کو کس طرح یکسر مٹا دیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم معاشروں میں بعد میں یہ خرابیاں رونما ہوئیں لیکن فرق یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان لوگوں کو چاہے وہ حکمران ہی کیوں نہ ہوں خطاکار اور گنہ گار ٹھہرایا اور اکثر ظالم اور جابر حکمرانوں کی انھوں نے مخالفت بھی کی، نظریۂ توحید اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت نے اس خطرناک صورت حال کا خاتمہ نظری طور پر تو ہمیشہ کے لیے کر دیا، عملی لحاظ سے اس کا خاتمہ فوری طور پر عرب میں ہوا۔ اب حکمران سے لے کر غریب اور معذور ترین شخص ایک ہی سطح پر، یعنی خدا کی حاکمیت کے تحت آ گیا۔ قانون کے بنیادی اصول بذریعہ وحی اور رسول اکرمؐ کی تشریحات اور عملی زندگی کے لباس میں انسان تک پہنچ گئے۔ اُن کی ابدی حیثیت اور بالا دستی پر کسی کو حرف گیری یا ان میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ ان نظریات کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی مطلق العنانیت خواہ وہ فرد کی ہو خواہ ایک جماعت کی قطعی طور پر ختم ہو گئی۔

ازمنہ قدیم اور قرونِ وسطیٰ میں ملوکیت کی تاریخ پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مطلق العنان حکمرانوں نے کیسے کیسے مظالم اور ناانصافیاں کی ہیں۔ دورِ حاضر میں پارلیمانی طرز

حکومت کو آزادی اور مساوات انسانی کا بہترین مظہر سمجھا جاتا ہے، لیکن بعض ممالک میں پارلیمان کے قانون سازی میں لامحدود اختیارات سے کسقدر عجیب وغریب نتائج پیدا ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ ہم بعض اخلاق سوز اور رنگ ونسل کے امتیازات سے لگا سکتے ہیں۔ یہ صورت حال اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ بعض انسانوں یا جماعتوں کو دوسروں پر برتری حاصل ہے، نسل پرستوں کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے پر فوقیت صرف اس بنا پر حاصل ہے کہ وہ کسی خاص نسل سے تعلق رکھتا ہے یا اس کا رنگ دوسروں سے مختلف ہے۔ عدم مساوات کی یہ شکل اسلامی نظام میں اس لیے ممکن نہیں کہ یہاں حاکمیتِ اعلا صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور انسان اس دنیا میں صرف اس کا نائب، یا قرآنی الفاظ میں، "خلیفہ" ہے اور اس کے دیے ہوئے قوانین کی حد سے باہر نہیں جا سکتا۔ قرآن نے یہ نظریہ پیش کر کے کہ اللہ کے نزدیک برتری کا صرف ایک ذریعہ تقویٰ ہے، انسانی مساوات کے نظریہ کو اس طرح قائم کر دیا کہ اس میں اب کسی ترمیم وتبدیلی کی گنجائش نہیں۔ متعلقہ آیت (الحجرات - ۱۳) [1] کی بہترین وضاحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے مشہور خطبے میں ان الفاظ میں فرمائی:

لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ (آدم علیہ السلام) ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اس موقع پر آپؐ نے غلاموں کے متعلق یہ حکم دیا:

"تمہارے غلام! تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔" [2]

---

[1] بعض مفسرین نے اس آیت (الحجرات - ۱۳) کی شانِ نزول یہ بتلائی ہے کہ آنحضرتؐ مدینہ کے بازار میں جا رہے تھے تو آپؐ نے ایک حبشی غلام کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ مجھے صرف وہ شخص خریدے جو مجھ کو پانچوں نمازیں رسول اللہؐ کی اقتدا میں ادا کرنے کی اجازت دے۔ چنانچہ اس شرط پر اس کو ایک شخص نے خرید لیا۔ وہ غلام بیمار ہوا تو رسول اللہؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ جب وہ مر گیا تو آپؐ اس کے جنازے میں شریک ہوئے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غلام کے مقابلہ میں حیثیت یا پیدائش کے لحاظ سے اس کے آقا کو برتری حاصل نہیں۔

غلامی کو فوری طور پر بند کرنا ممکن نہ تھا اس لیے کہ یہ عالمی تجارت کا ایک اہم مسئلہ بن چکا تھا۔ لیکن رسول اللہؐ نے غلام کو آزاد کرنے اور اس کو جملہ حقوق، جن سے دوسری قوموں نے اس کو محروم کر دیا تھا، دلوانے کے لیے مختلف طریقوں سے نصیحت فرمائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرے میں غلام کی حیثیت دوسرے معاشروں سے قطعی طور پر مختلف ہو گئی۔ یہاں یہ خاندان کے ایک فرد کی طرح تھا اور اگر وہ با صلاحیت ہوتا تو ترقی کے لیے تخت و تاج کا مالک بھی بن جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سلطان معز الدین غوری (ف - ۶۰۳ / ۱۲۰۶) سے اس کے ایک امیر نے اظہار افسوس کرتے ہوئے ذکر کیا کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں جو بعد میں اس کے تخت کا مالک ہو۔ سلطان نے فوراً جواب دیا کہ اُس کے ہزاروں غلام اس کے بیٹے ہی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اُس کے کئی غلام سلطنت کے مختلف علاقوں پر حکمران ہوئے۔ اسلامی تاریخ کے صفحات میں زندگی کے مختلف شعبوں میں ہمیں نمایاں شخصیتیں ملیں گی جو ابتداً غلام تھیں لیکن بعد میں اعلیٰ مراتب و مناصب پر فائز ہوئیں۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ سلطان فیروز تغلق نے جس کے پاس غلاموں کی بہت بڑی تعداد تھی ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا تھا۔ ایسے واقعات کی لاتعداد مثالیں ہمیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دوسری قوموں میں جو غلام کی حیثیت اور غلامی کا تصور تھا اس کا اسلام میں غلام کے تصور سے کوئی مقابلہ نہیں ان دونوں میں حرف لفظی مماثلت ہے۔

اس مختصر مقالے کے اختتام سے پہلے ہم اس امر پر زور دینا چاہتے ہیں کہ قرآنِ پاک کے احکامات نے اسلامی معاشرے پر یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ اخوت اور مساواتِ انسانی کو ہر نظام میں ضروری سمجھے۔ یہاں آزادی، مساوات اور اخوتِ انسانی بے معنی الفاظ نہیں۔ مطلق العنانی کسی شکل میں بھی خواہ وہ ایک فرد کی ہو خواہ ایک جماعت کی قابلِ برداشت نہیں۔ ان تمام تعلیمات کا عملی زندگی میں مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی بنیاد صرف فلاح اور دنیوی بہبود پر ہی نہیں بلکہ انسانی اخلاق کے اعلا معیارات پر ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ:

"میں اعلا اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔"

اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

---

۲ - خطبہ مذکورہ کے مختلف حصے سیر اور حدیث کی کتابوں میں کہیں کہیں مذکور ہیں۔ دیکھو علامہ شبلی کی سیرت النبیؐ - جلد ۲ - مزید دیکھو ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۸۵۔

میدانِ جنگ اور اخلاقیاتِ نبوی

جناب محترم بریگیڈیر گلزار احمد

اخلاق، انسان کے اس طرزِ عمل کا نام ہے جو وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ روا رکھتا ہے اور جس کے اثر کے تحت اجتماعی زندگی کے دوران اس سے مختلف اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کا طرزِ عمل اس کے اخلاق کا پتہ دیتا ہے جو اس فلسفہ پر مبنی ہوتا ہے جس پر وہ اپنی زندگی کو استوار کرتا ہے۔ اس فلسفے کی بنیاد انسان کے ایمان و ایقان پر مبنی ہوا کرتی ہے جسے اس نے اپنے معبود کے متعلق اپنے قلب و ذہن پر ثبت کیا ہوتا ہے۔ فلسفۂ زندگی اپنا مستقل مقام نہیں رکھتا، اس کا وجود ایسی مستقل بنیاد پر ہوتا ہے جو دلائل و براہین سے ماورا ہو کر انسان اور خالقِ کائنات کے تعلق کو واضح کرتی ہے۔

جس انسان کا ایمان ہو کہ یہ کائنات از خود وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کا ایک خالق ہے جس نے اس کی تخلیق کا مقصد بھی پیشِ نظر رکھا ہے، وہ اس کائنات کی وسعتوں، اس کی بلندیوں، اس کے عجائب اور ان کے اندر مضمر قوتوں کو ہمہ وقت لگاہوں کے سامنے رکھتا ہے۔ جوں جوں کائنات پر اس کا غور و فکر بڑھے گا اسی مناسبت سے اس کے قلب و ذہن پر خالقِ کائنات کی بزرگی اور قوت کا تصور گہرا ہوتا جائے گا۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا ہر قول و فعل خالقِ کائنات کے احکام کے تابع رہے گا۔

جو انسان خالقِ کائنات کے وجود کا منکر ہوگا یا خالقِ کائنات کے تصور کو شرک و شکوک کے نتیجے میں دھندلا دے گا اس کے ذہن سے جزا و سزا اور عمل و احتساب کا خیال محو ہو جائے گا۔ ان حالات میں ہر عمل منتہائے مقصود بن جاتا ہے اور انسان ہر رکاوٹ، ہر خوف، ہر طرح کی پرسش اعمال کے خیال سے آزاد ہو کر اپنے شب و روز کو صرف خواہشاتِ نفس کے تابع بناتا ہے اور یوں غیر ذمہ دارانہ رویہ کو حاصلِ زندگی کا مقام عطا کر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے فلسفۂ زندگی کی تہہ ایمان و ایقان کی مضبوط بنیاد سے عاری

ہوتی ہے۔

خاتم الرسل، سید البشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نظامِ زندگی کی بنیاد رکھی اس کی اساس وحدتِ خداوندی پر ہے۔ اس کے علاوہ اس نظامِ زندگی کا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ نظامِ زندگی خود خالق کائنات کا عطا کردہ ہے۔ وحدتِ خداوندی اور حاکمیتِ الٰہ العالمین پر استوار کیے ہوئے نظامِ زندگی کو حضورِ اقدسؐ نے اپنی پوری زندگی پر محیط کر کے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو قیامت تک کے لیے ہر موقع و محل پر کمال اخلاقیات کا مقام رکھتی ہے۔ اس بے مثل زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔ ہر پہلو اپنی جگہ پر مکمل مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ ان ہی مختلف پہلوؤں میں سے اہم ترین پہلو جنگ، یعنی میدانِ کارزار کی زندگی کا پہلو ہے۔ جنگ خاک و خون سے نبرد آزما ہونے کا نام ہے۔ اس کے دوران جذبات کی شدت پر قابو رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ آج کی اس مجلس میں اس بات کا مطالعہ مقصود ہے کہ حضور سرورِ کونین رحمۃ للعالمین نے میدانِ جنگ اور اس سے متعلق امور کے دوران کس طرح کے اخلاق بطور مثال پیش کئے۔ بادی النظر میں عجیب سی بات محسوس ہوتی ہے کہ جو ہستی سراپا رحمت ہے، جو محبت و شفقت کا پیکر ہے، جو رحم و کرم میں کمالِ انسانی کی مثال ہے، جو عفو و درگزر اور عطا و بخشش میں اپنا ثانی نہیں رکھتی اور جس بزرگ و برتر انسان کو خالقِ جن و بشر نے رحمۃ للعالمین کے خطاب سے نوازا ہے، ان کے اخلاقیات کو اس پس منظر سے متعلق کیا جائے جو قتل و خون اور تباہی و بربادی کا مظہر ہو۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اخلاقیات کا یہی پہلو سب سے زیادہ توجہ طلب ہے اس لیے کہ جنگ کے دوران انسانی تیور غضب اور غصے کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں اور افراط و تفریط یا ناانصافی سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر خون کی ندیوں کی موجودگی میں رحم و کرم اور عفو و درگزر سے کام لینا ہی حقیقی معنوں میں اخلاقیات کی معجز نما مثال بنایا جا سکتا ہے۔

اہلِ عرب اور خاص طور پر ان کے شعرا اپنے باپ دادا کی شجاعت کی داستانیں انتہائی رنگ آمیزی سے پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں داستان طرازی زیادہ ہوتی تھی اور حقیقی شجاعت کم تر اور وقتی۔ اہلِ عرب لوٹ مار قسم کے غزوہ کے عادی تھے۔ وہ پُر استقلال لڑائی کے عادی نہ تھے اور اس لیے صف آرا لڑائی کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ بدر و احد کی لڑائیاں جس طور پر لڑی گئیں وہ اس خیال کی شاہد ہیں۔ علاوہ بریں میثاقِ مدینہ کی

شق نمبر ۴۴ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ عرب کا ہر باشندہ دلیر نہ تھا مگر اللہ کی حاکمیت کو قبول کرنے والا ہر فرد صبر و استقلال کی وجہ سے بہادری کا مظہر بن گیا تھا۔ دورِ جدید میں مستشرقین سے استفادہ کرنے والے مسلمان منکرین بھی اس گمراہی کا شکار ہو گئے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابیوں اور آپؐ کے اخلاقیات کی بنیاد اہل عرب کی شجاعت، ان کی مہمان نوازی اور ان کے مضبوط کردار پہ استوار ہوئی تھی۔ یہ خیال انتہائی گمراہ کن ہے۔ قرآن پاک تازہ واردانِ حلقۂ اسلام کا موت کے خوف سے گر گر پڑنے کا ذکر کرتا ہے۔ غزوۂ تبوک تک ایسے افراد موجود تھے جو جنگ میں عدم شمولیت کے لیے بہانے بناتے رہے۔ اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیانہ خصائل، آپؐ کی بے مثل جرأت اور آپؐ کے صبر و استقلال کی اساس آپؐ کے گردوپیش پر نہیں تھی بلکہ خالق و مالکِ کائنات کی مشیت اور نہ نظر آنے والے ارادوں کا اسے نتیجہ تصور کرنا چاہیے۔

آپؐ کے والد ماجد کا انتقال آپؐ کے پیدا ہونے سے قبل ہو گیا تھا۔ آپؐ والدہ ماجدہ کی شفقت سے بھی ناآشنا رہے تھے۔ دادا کو بھی قدرت نے اتنی مہلت نہ دی کہ سیادت و قیادت کے طور طریقے سکھائے جاتے۔ چچا تو کفالت کی ذمہ داریوں سے بھی بمشکل عہدہ برا ہو سکتے تھے۔ یعنی آپؐ حقیقی معنوں میں اُمی تھے۔ علاوہ ازیں آپؐ از اوّل تنہائی پسند تھے اور جوانی کے ایام کا زیادہ حصہ غار حرا میں گزارا کرتے تھے۔ وہاں عرب کا ماحول یا عرب کی داستانوں کا اثر کیسے ہو سکتا تھا۔ وہاں تو تصور کائنات اور انہماک در خالق کائنات ہوا کرتا تھا۔ آپؐ کے اخلاق اس پوشیدہ امرِ ربی اور مشیت خالقِ کائنات کے ہاتھوں استوار ہوئے تھے جس نے لفظِ کُن کے بعد سے آدمؑ اور ان کی اولاد کی پیش رفت اور تربیت ان خطوط پہ کی تھی جن کی آخری کڑی، آخری دین، آخری وحی اور آخری رسول نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہ پہنچ کر تا قیامت نسلِ انسانی کے لیے مشعلِ راہ بنی رہنی تھی۔

جنگ فرد کی زندگی پر تو اثر انداز ہوتی ہی ہے، اجتماعی سطح پہ معاشرتی دھاروں کو بدلنے اور نیا رُخ دینے میں بھی جنگ انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہجرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے مکہ والوں نے اعلانِ جنگ کے بعد مدینہ پہ حملے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ جنگ نو سال تک جاری رہی۔ اس جنگ کے دوران ریاست و مملکتِ مدینہ کے تمام تر وسائل ملت و مملکتِ اسلامیہ کے دفاع و تحفظ کے لیے استعمال کئے گئے۔ اس طویل جنگ کے سائے حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے مدنی دور پہ چھائے رہے۔ ظاہر ہے کہ ریاستِ مدینہ کے انتظامی،

معاشی اور معاشرتی امور پر حالتِ جنگ کے اثرات پڑتے رہے ہوں گے خُذُوْا حِذْرَکُمْ کا یہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا، یعنی زندگی کے ہر پہلو کی حفاظت اور ملّت کے ہر فرد اور اس کی ہر شے کا تحفظ۔ یورپ کا عالم انسانی ملّی جنگ (NATIONAL WAR) کی اصطلاح سے انیسویں صدی عیسوی میں نپولین کی جنگوں کے ذریعہ سے روشناس ہوا، مگر دنیائے اسلام کو حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ صدیاں قبل ملّی جنگ کے جزئیات سے آگاہ فرما چکے تھے۔ اس جنگ اور اس کے ہر غزوہ کے دوران ملّت کے ہر فرد کی دولت اور اس کی ذات کو ہر ممکن طریقے سے استعمال میں لایا گیا۔ اس لیے اس جنگ کو بہ ہر معنی کُلّی جنگ یعنی (TOTAL WAR) بھی کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے جنگ، فرد اور معاشرہ دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے، اس لیے کہ جنگ کے مطالبات زمانۂ امن کے مطالبات سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ اور فرد و جماعت کو اپنی زندگی اور اس سے متعلق نظریات کو حالاتِ جنگ اور مطالباتِ جنگ سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔ ۹ سال کے طویل عرصے کی جنگ کا اثر یہ ہوا کہ جنگ کے سایہ تلے مرتب ہونے والے معاشرے کے افراد کے کردار و اخلاق کی تربیت ہادیٔ برحقؐ نے ایسے خطوط پر استوار کی تھی کہ وہ عین میدانِ کارزار میں شفقت و محبت اور رحم و کرم کے جذبات کا اظہار کر سکتے تھے اور زمانۂ امن کے صلح کُن ماحول میں عزم و استقلال اور انتہائی شدت سے کلمۂ حق کی پاسداری اور تحفظ کرتے رہتے تھے۔ یہی مکمل کردار تھا جس کے اظہار نے خیر البشر خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور ان سے صدیوں بعد آنے والے نام لیوانِ رسولِ مکّی و مدنیؐ نے بھی جنگ ختم ہوتے ہی بدترین مفتوح دشمن کی عزت و آبرو، اس کے مال و متاع اور اس کے زن و مرد کو مکمل آزادی عطا کر دی اور جنگ کے دوران کی شدتِ جذبات کو نفرت کی جانب رُخ نہ کرنے دیا۔

یہ سب کچھ اس لئے ہوتا رہا کہ جس ہادیٔ برحقؐ کی سیرت کے مطابق عمل کرنا وہ اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے تھے اس نے عمر بھر کے دشمنوں کو لا تثریب علیکم الیوم کہہ کے سینے سے لگا لیا تھا اور ان کے لیے زمانۂ مابعد جنگ کو حسین اور خوش رنگ بنا دیا تھا۔ جنگ کو فتح تو ہر سپہ سالار کر سکتا ہے مگر زمانۂ مابعد جنگ کی فتح صرف اولین سپہ سالارِ افواجِ اسلامیہ کا خاصّہ رہا ہے۔

جس نظامِ زندگی کو عملاً آپؐ انسانیت کے سامنے پیش کر رہے تھے، اس کے فلسفے

کی بنیاد وحدت و حاکمیتِ خداوندی پر استوار ہوئی تھی اور خالقِ کائنات کا حکم تھا کہ "جب میری راہ میں سفر کر رہے ہو تو چاہے وہ دفاعی جنگ کا سفر ہی کیوں نہ ہو زیادتی سے بچے رہنا۔ اس لیے کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" یہ لا تعتدوا کا حکم ہی تھا کہ جس کی روشنی میں آپؐ نے عمر بھر کے دشمنوں کو لا تثریب علیکم الیوم کہہ کے بندۂ بے دام بنا لیا تھا۔

اسلام کی بنیاد ہی حاکمیتِ خداوندی پر ہے۔ یہ ایسا اساسی نکتہ ہے کہ حضور اقدسؐ نے اسے میثاقِ مدینہ میں بھی شامل کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ریاست مدینہ کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی یہ اعلان کرا دیا گیا تھا کہ اس ریاست میں قانونِ خداوندی نافذ ہوگا تو یہ بہر معنے درست ہوگا۔ سلہ ہجری میں حضور کی جانب سے عطا کردہ میثاقِ مدینہ کی شق ۲۸ کے الفاظ ہیں:

"اگر اس دستاویز سے متعلق تمہارے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو معاملہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو پیش کیا جائے گا۔"

میثاقِ مدینہ میں یہ بات بھی مصدقہ طور پر تسلیم کر لی گئی تھی کہ حاکمیتِ خداوندی کے اثر اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اخلاق مضبوط ہو گئے تھے۔ اس اہم اور تاریخی دستاویز کی شق نمبر ۴۲ کے الفاظ ہیں:

"چونکہ مسلمان اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے (جنگ کے دوران) دوسروں کی نسبت ان کا صبر و استقلال قوی تر ہوتا ہے اور انہیں اللہ کی جانب سے ہدایت عطا ہوتی ہے۔"

صبر و استقلال کو تو اللہ تبارک تعالیٰ، اللہ کی جانب سے عطا کردہ نعمت قرار دیتا ہے اور وہ ثمر ہے اللہ پر ایمان لانے اور اس کے نازل کردہ احکام کے مطابق زندگی کو سمت عطا کرنے کا۔ آپؐ نے یہ صبر و استقلال ہر میدانِ جنگ میں دکھایا اور دکھایا گیا، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نصرت سے فتوحات حاصل ہوئیں۔ احد اور حنین کے دو اہم میدانوں میں جب لڑائی کا رُخ مسلمانوں کے خلاف تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثل بہادری نے فوج کو دوبارہ یکجا کیا اور دونوں موقعوں پر حالات یکسر بدل گئے۔

یہ اخلاقیاتِ نبوی کا وہ پہلو ہے جو فنِ جنگ کے ماہرین سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ

آپؐ نے کسی طرح کی جنگی تربیت، تجربہ یا مشاہدہ کے بغیر بگڑے ہوئے حالات کو سنوارنے کے لیے جس طرزِ عمل کی ضرورت ہوتی ہے وہ کس طرح حاصل کیا تھا۔ اخلاقیاتِ نبوی کا یہ پہلو وحدتِ خداوندی پر مکمل ایمان کا نتیجہ تھا۔ غارِ ثور کی تنہائیوں میں، بدر کے دوران پختہ کار کماندار کی سی مضبوط گرفت کے وقت، اُحد کے میدان میں دشمن کے قیامت خیز گھراؤ کے باوجود، غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے سے لے کر عرب کے اجتماعِ عظیم کے منتشر ہونے تک، حدیبیہ کی تا حد شہادت بیعت کے فیصلہ پہ غور کرتے ہوئے، خیبر کے بارہ قلعوں کی تسخیر کے دوران، اور حنین کی تنگ وادی میں دشمن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے بالمقابل اخلاقیات نبویؐ کے صبرو استقلال کی بنیاد خالق رب العالمین پر وہ محکم ایمان تھا جو تا قیامت عاشقانِ ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مینارۂ نور بن کر ہدایت کے سامان مہیا کرتا رہے گا۔

مکہ اور مدینہ کے درمیان اعلانِ جنگ کے بعد کئی چھوٹے چھوٹے معرکے بپا ہو چکے تھے مگر پہلا صف آرا معرکہ بدر کے مقام پر ہوا۔ اس روز قریش مکہ کا لشکر باجے گاجے اور جذبات ابھارنے والے رزمیہ و رجزیہ اشعار کی صداؤں کو بلند کرتے ہوئے مدینہ کے مٹھی بھر مجاہدوں پر حملہ کے لیے آگے بڑھا۔ سراپا رحمتؐ نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تک لڑائی کا باقاعدہ آغاز نہ ہو بدر کے واحد چشمہ سے دشمن کو پانی پینے سے نہ روکا جائے۔ کہاں خون کی ندیاں بہنے کا یقین اور کہاں دشمن کو اپنے قبضے میں لیے ہوئے چشمہ سے پانی پی کر تازہ دم ہونے کی اجازت! دشمن کے غصے کے مقابلے میں رحم وکرم کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر! یہی اخلاقیات نبویؐ کا وہ پہلو ہے جسے "خلق عظیم" کا نام دیا گیا ہے۔

بدر کی لڑائی مابعد جنگ کی اخلاقیات کی مثال بھی پیش کرتی ہے۔ بدر میں قریش کے ستّر قیدی لیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ انتہائی ہمدردانہ سلوک کیا گیا۔ حضور اقدسؐ نے احترامِ آدمیت کا جو بلند مقام قائم کیا ہے وہی بقائے انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ان جنگی قیدیوں کو جس آسانی سے اور جن آسان شرائط پہ آزاد کیا گیا وہ دورِ جدید کے لشکر سازوں اور کارپردازانِ حکومت کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

جنگی قیدیوں کا سوال یہ خیال بھی ذہن کے پردے پہ اُبھارتا ہے کہ کیا وجہ تھی کہ حضور اقدسؐ تو دشمن کے قیدی حاصل کر لیتے تھے مگر آپؐ کی نو سالہ جنگ کے دوران آپؐ کا ایک آدمی بھی جنگی قیدی نہ بنایا جا سکا۔ یہی نہیں بلکہ راقم الحروف کے مطالعہ میں ایسی ایک مثال بھی نہیں

آئی کہ دورِ شیخینؓ میں دنیا کی دو بڑی مملکتیں کسی مسلمان سپاہی کو میدانِ جنگ میں قیدی بنا سکی ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو حاکمیت خداوندی پر ایمان رکھتے ہوں وہ قرآن و سنت کے علاوہ کسی دوسرے قانون کو نہ تسلیم کرتے ہیں اور نہ اس کے تحت زندگی گزارنا قبول کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں شکست کھاکر غیر اللہ کے قانون کو قبول کرنا کفر کے مترادف ہے۔ دورِ نبوی اور دورِ خلافت راشدہ کی مسلمان افواج کا یہ عمل اخلاقیات نبویؐ کے پرتو کے طفیل تھا۔

غزوۂ احزاب کے دوران جب پورے عرب کے قبائل کا طوفان امڈ کر مدینہ اور اسلام کو ختم کرنے کے لیے آیا تھا اس وقت آپؐ کے فیصلہ کے مطابق نصف شہر کے گرد نو ہزار گز لمبی خندق کھودی گئی تھی۔ اس دفاعی تیاری کے دوران آپؐ نے اپنی فوج کے ادنٰی ترین سپاہی کے ساتھ مل کر جو مصائب برداشت کیے اور جس صبر و استقلال سے تقریباً ایک ماہ کے محاصرے کے دوران ہی کمانڈر اعظم کے فرائض انجام دیے وہ اخلاقیات نبویؐ کی صورت میں مساوات انسانی کا ایسا درس ہے جس پر وہی عمل پیرا ہو سکتے ہیں جو الٰہیت و حاکمیت خالق العالمین اور رسالت و نبوتِ مصطفوی پر ایمان رکھتے ہوں۔

حدیبیہ میں قیام کے دوران حضرت عثمانؓ سفیر کے طور پر مکہ گئے تھے انھیں واپسی میں غیر متوقع دیر لگ گئی۔ افواہ مشہور ہوگئی کہ مکہ والوں نے ان کو قتل کر دیا ہے۔ آپؐ نے فوراً صحابہؓ سے "بیعتِ جہاد تا شہادت" لی اور کامل سنتے ہوتے ہوئے مکہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ سفیر کا قتل ریاست و مملکت کی حاکمیت کے خلاف للکار کے مترادف تھا۔ جو حاکمیت اللہ کی قائم کردہ حدود کی مطابقت میں قائم کی گئی ہو اس کے سفیر کا قتل اللہ کی حاکمیت کو للکارنے کا مقام رکھتا ہے اور وہ اعلانِ جنگ سے بڑھ کر جنگ کا آغاز متصور ہوتا ہے۔ اسی لیے خاتم النبیینؐ کے لیے اس مسئلے میں صحیح مثال قائم کرنی تھی تاکہ مابعد کی مسلمان ریاستوں کے سربراہوں کے لیے نشانِ راہ واضح رہے۔ آپؐ کے اس عزم کی تہہ میں وہ محکم ایمان باللہ تھا جس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ عین میدان جنگ میں اخلاقیات نبویؐ کے اس فیصلے کو احترام ذاتِ مومن کا مقام حاصل ہے۔ جب حضرت عثمانؓ صحیح و سالم واپس لوٹ آئے اور مکہ والوں نے آپؐ کے اس عزم محکم کو دیکھ کر دس سال کے لیے جنگ بندی پر رضامندی ظاہر کی تو آپؐ نے یہ جنگ بندی اور وقتی صلح چند ایسی شرائط پر قبول فرمائی جو بادی النظر میں مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نظر آرہی تھیں۔ مگر اللہ کا حکم تھا کہ "جب دشمن صلح کی جانب جھکے تو تم بھی اس جانب جھک جاؤ۔"

اللہ کے اس حکم کی موجودگی میں آپؐ صلح کی پیش کش کو ٹھکرا نہ سکتے تھے۔ سرورِ کونینؐ کا یہ فیصلہ اتنا اہم ہے کہ خالقِ ارض و سماء نے اسے فتح کے نام سے یاد فرمایا ہے اور وعدہ فرمایا تھا کہ اس فیصلہ کے محرک بننے والے اصحاب خاتم الرسلؐ جنھوں نے درخت کے نیچے آپؐ کے ہاتھ پہ بیعت جہاد تا حدِ شہادت کی تھی انھیں جلد ایک جنگی فتح سے نوازا جائے گا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ جلد پورا ہوا۔ صادق الوعد رسول آخر الزمانؐ نے اس وعدہ پہ یقین رکھتے ہوئے آنے والے غزوہ کے لئے سولہ ہزار کی جمعیت کے خلاف صرف ان چودہ سو اصحابؓ کو ساتھ جانے کی اجازت دی جنھوں نے ببول کے درخت کے سائے میں ریاست مدینہ کی آزادی کی ضمانت اور حاکمیت خداوندی کی شہادت کے طور پہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

جنگ آزما ہونے والے اور تباہی کا عزم لے کر حملہ کرنے والے دشمن کے خلاف عفو و درگزر سے کام لینے کے لیے جس بلند اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے وہ اولین سپہ سالارِ افواجِ اسلامؐ کے علاوہ تاریخ جنگ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جاسوسی، فتنہ و فساد، بغاوت اور درپردہ دشمن کی مدد کرنے کے مرتکب ہوئے تھے، مگر آپؐ نے انھیں بخش دیا اور ان کی تمام منقولہ دولت ان کو لے جانے کی اجازت دے دی۔ اسی طرح سریۂ ذات الاطلاح غزوۂ حنین و طائف، سریۂ قطبہ اور سریہ عُطے کے قیدیوں کو معافی مانگنے پر بغیر فدیہ کے بخش دیا۔

تاریخ جنگ میں کئی سپہ سالاروں نے جنگیں جیتی ہیں اور دشمن پہ حکومت کے ذریعہ سے نئے قوانین اور نیا نظام عاید کیا۔ مگر یہ تبدیلیاں ہمیشہ بجبر قبول کی گئیں۔ حضورؐ واحد سپہ سالار ہیں جنھوں نے جنگ جیتنے کے بعد مابعدِ جنگ زمانے کو بھی کامیابی سے سر کیا۔ آپؐ نے پرانے معاشرتی نظام کو یکسر بدل دیا تھا اور اک نیا سیاسی و اقتصادی نظام دے کر ایسے انقلاب کا آغاز کیا تھا جو آج صدیوں تک کم و بیش جاری ہے اور اس کی نشاۃِ نو کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ اب تک ان چودہ صدیوں میں جہاں کہیں یہ نظام زندگی نافذ کیا گیا وہاں خوش حالی اور امن و سکون میں اضافہ ہوا اور ہر مقام پہ اس کا خیر مقدم کیا گیا۔

میدانِ جنگ میں اخلاقیاتِ نبویؐ کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی رہا ہے کہ آپؐ کے نقشِ قدم پہ چلنے والے، آپؐ کی سنت کو برقرار رکھتے ہوئے، عفو و درگزر سے کام لیتے رہے ہیں۔ جب مسلمان دورِ فاروقی میں بیت المقدس میں داخل ہوئے تو کسی کا بال بیکا نہ ہوا۔ مگر جب عیسائی

اسی بیت المقدس میں داخل ہوئے تو شہری آبادی کے خون کی ندیاں بہائی گئیں مگر چھیانوے سال بعد جب مسلمان دوسری بار اس شہر میں داخل ہوئے تو پھر بھی امن و امان اور عفو و درگزر کی ہی فراوانی نظر آئی۔

بیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کو ایک بار پھر اس مقدس سرزمین سے نکال باہر کیا گیا ہے۔ اس بار پھر مظالم کی انتہا نہ رہی جو اب بھی جاری ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہر مقام پر اور ہر دور میں جنگ کے نتیجے میں مظالم ڈھائے گئے مگر جب مسلمانوں نے جنگ فتح کی تو انھوں نے رحم و کرم کی بارش کر دی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ مسلمان سپہ سالاروں کے سامنے ہمیشہ سنت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم رہی ہے اور دیگر ادیان کے فاتح کسی ایسی مثال کو سامنے رکھنے سے قاصر ہیں۔ میدانِ جنگ میں اخلاقیاتِ نبوی کا یہ کمال ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آپ ﷺ کی سنت بنی نوع انسان کو رحم و کرم اور عفو و درگزر کا سبق دے رہی ہے اور اللہ کا دیا ہوا رحمۃ للعالمین کا لقب اتنا ہی زندہ و پائندہ ہے اور رہے گا جتنا کہ اور سارا کلام ربانی ہے۔

معلّم اور تعمیر کردار

سیرت طیبہ کی روشنی میں

جناب محترم ڈاکٹر احمد محی الدین

قرآن وسنت میں معلم اور تعمیر کردار کا ذکر بکثرت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ معلّم ہے اور انبیاء بھی معلّمین ہیں۔ انبیاء کرامؑ کی معلمانہ حیثیت کی تعلیم وتربیت کا خداوند کریم نے خصوصی اہتمام فرمایا ارشاد ہے:

اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو سب چیزوں کے اسماء کا علم دیا۔ (البقرہ: ۳۳)۔

پھر فرمایا:

رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ (الرحمٰن: ۱-۲) اور پھر سورہ علق میں فرمایا:

(پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (پر جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا) اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجیے۔ جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپؐ قرآن پڑھا کیجیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے (لکھے پڑھوں کو) قلم سے تعلیم دی اور عموماً انسان کو (دوسرے ذرائع سے) ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔ (علق: ۱-۵)

اللہ تعالیٰ نے نبی آخر زمان صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام فرمایا۔ پروردگار عالم نے نبی کریمؐ کو روشن چراغ (سراجاً منیرا) کہا۔ حدیث نبوی ہے:

ادبنی ربی فأحسن تادیبی

یہی وجہ ہے کہ نبی کریمؐ کا مناصب نبوت میں تعلیم دینا خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں میں قرآن کریم کے دو حوالوں پہ اکتفا کروں گا۔

"حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی صفائی کرتے ہیں۔ اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتاتے رہتے ہیں۔ اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے"۔ (آل عمران: ۱۶۴)

"وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا۔ جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ اور اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں۔ اور ان کو کتاب اور دانشمندی (حکمت) سکھاتے ہیں۔ اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے"۔ (جمعہ: ۲)

خود پیغمبر اسلامؐ نے معلّم کہلاتے ہوئے ہمیشہ خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک حدیث مروی ہے۔ جس کا ترجمہ یوں ہے:

(ایک مرتبہ) رسول اللہؐ دو مجلسوں میں سے گزرے جو مسجد میں منعقد ہوئی تھیں آپؐ نے فرمایا: دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں۔ لیکن ان میں ایک دوسری سے بہتر ہے۔ ان دونوں مجلسوں یا جماعتوں میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے اور خدا تعالیٰ سے دعا کر رہی ہے۔ اور اس سے اپنی خواہش و رغبت کا اظہار کر رہی ہے۔ اور دوسرے لوگ سو وہ دینی بصیرت حاصل کر رہے ہیں اور جاہلوں کو علم سکھا رہے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ بہتر ہیں۔ اور میں بھی معلّم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں" (وانما بعثت معلّماً)

آخری معلّم کی حیثیت میں آپؐ نے اپنے مشن کی وضاحت یوں فرمائی:

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

(میں تو اس لیے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں)

ایک اور جگہ فرمایا:

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ۔

(میرا مقصد اصلاح معاشرہ ہے جتنا مجھ سے ممکن ہو۔ اور نہیں ہے میری توفیق مگر جو خدا مجھے دیدے)

ان ارشادات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حضورؐ کے پیش نظر تعلیم اسلامی کے دو پہلو رہے: ایک پہلو کے اعتبار سے وہ محض فرد کی اصلاح و تکمیل ہے۔ لیکن دوسرے پہلو کے لحاظ سے وہ ایسی اصلاح و تکمیل ہے جس کا نتیجہ معاشرتی بہبود ہے۔ ایک معلّم کی حیثیت سے فرد کی انفرادی زندگی اور اس کی حیاتِ اجتماعیہ کی اصلاح ہمہ وقت آپؐ کے پیش نظر رہی۔ اس اعتبار سے آپؐ کی مساعی کا مقصود فرد کی ایسی تعمیر کرنا رہا جس سے وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر کائنات کے لیے رحمت بن سکے۔ اسی لیے حضورؐ نے ایسی تعلیم اور ایسے علم سے

پناہ مانگی جس کا اثر انسان کی عملی زندگی پر نہ ہو۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ ۝

(اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے)

معلّم کا معیار

دنیا کے آخری معلّم کی حیثیت سے آپؐ نے معلم کا ارفع ترین معیار نہ صرف وضع فرمایا بلکہ اس کی عملی تفسیر زندگی بھر پیش کی۔ معیار کے عناصر حسب ذیل ہیں:

الف۔ معلّم کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

ب۔ اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

ج۔ اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

معلّم کا یہ مختصر مگر جامع معیار تربیت اساتذہ کا سرعنوان ہونا چاہیے۔ اور دورِ حاضر کے مسلمان اساتذہ کی علمی کم مائیگی اور تدریس سے بے رغبتی کا علاج یہی ہے کہ ان کے نظامِ تربیت کو مذکورہ معیار کی روشنی میں از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور اس پہ سختی سے کاربند رہا جائے، تاکہ اصلاحِ اعمال کا عمل سہل اور سریع ہو۔ یہ اس معیار کی عملی تفسیر ہے۔ "حضورؐ کی درس گاہِ اعظم کو دیکھو تو معلوم ہوگا۔ ایک عمومی جامعہ ہے۔ جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے۔ خود معلّم کی ذات پوری جامع ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ قائم ہے۔ اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔"[1]

جہاں حضورؐ نے معلّم کے لئے ایسا جامع معیار عملاً پیش کیا، دنیا کے آخری معلّم نے اپنی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، امر ربانی اور حکم فطرت اور کتاب و حکمت کی آمیزش کی۔ آپؐ کے پیش رو انبیا کی تعلیم میں یہ آمیزش نہیں ملتی۔ حضورؐ نے نہ صرف معلّم کے لیے ایک ابدی اور جامع معیار عملاً پیش کیا بلکہ قرآن حکیم اور اپنے طرزِ عمل سے اصول تعلیم و تدریس بھی وضع فرمائے۔ ان میں چند ایک حسب ذیل ہیں:

---

[1] علامہ سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی جلد ۶ ص ۴۳ - ۴۴

الف - کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو؟ (البقرہ: ۴۴)
ب - تو اپنے رب کے راستے کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت سے بلا - (نحل: ۱۲۵)
ج - تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔ (طٰہٰ - ۴۴)
د - اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات (نساء ۶۳)
س - اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں فرماتے۔
ش - فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اس طرح پیش فرماتے کہ سننے والا فضائل کی طرف مائل ہو۔
ص - رذائل کو قابلِ نفرت صورتوں میں اس طرح پیش فرماتے کہ سننے والا اس سے روگرداں ہو۔
ط - خاص خاص لوگوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر ان کو خاص خاص طور پر نصیحتیں فرماتے۔
ع - مختلف اخلاقی باتوں پہ بیعت لیتے۔
ن - حضورؐ ایک سوال کرتے۔ سوال سن کر لوگ متوجہ ہوتے۔ مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں حضورؐ خود ہی جواب دیتے۔
ق - کبھی حضورؐ آپ ہی آپ سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے۔ حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے۔ اور مشتاق ہو کر پوچھتے۔ جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا۔
ل - بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے کلام کے مقصد کو ذہن نشین کراتے۔

یہ فہرست خاصی طویل ہے۔ مذکورہ اصولِ تعلیم و تدریس سے اس حقیقت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے، کہ دنیا کے آخری معلّم نے اصولوں کا ایک ایسا ضابطہ عملاً پیش فرمایا جس کے تحت تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے جاہل افرادِ انسانی معراج کی رفعتوں کو چھونے لگے۔ ہمارے تدریسی مسئلوں اور تعلیمی کوتاہیوں کی چارہ گری مذکورہ رہنما اصولوں کی روشنی میں بسہولت ممکن ہے۔ افکارِ مغرب کی خوشہ چینی آخر کب تک؟ بالخصوص جب ان افکار و تجربات کی بنیاد محدود احوال و کیفیات پہ ہو۔

اسلامی نظامِ تعلیم

حضورؐ نے جہاں معلّم کے لئے عملی معیارات مقرر فرمائے اور تعلیم و تدریس کے مؤثر اصول وضع فرمائے، وہاں اسلامی نظامِ تعلیم کے بنیادی تصورات کی نہ صرف نشان دہی فرمائی بلکہ ان تصورات کی اپنے اسوۂ حسنہ سے توضیح بھی فرمائی۔ ان بنیادی تصورات کا تعلق

دین، انسان، علم و معرفت، حکمت، عدل، اعمال و آداب، تکمیل انسانیت سے ہے۔ ان تصورات پر انسان غور کرے تو اسے بہت کچھ مل سکتا ہے تصورِ دین سے اسے مقصدِ حیات حاصل ہوگا۔ تصورِ انسان سے علومِ انسانی کی بے کرانی۔ تصورِ علم و معرفت سے تجربات و مشاہدات وغیرہم۔

محدود وقت کے پیشِ نظر میں نے معلّم کی حیثیت سے حضورؐ کے تین تعلیمی احسانات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ میں چاہوں گا کہ ان کا محض اعادہ کر دوں۔ یہ تین تعلیمی احسانات ہیں: معلّم کے لئے ایک جامع معیار، چیدہ چیدہ اصولِ تعلیم و تدریس اور اسلامی نظامِ تعلیم کے بنیادی تصورات۔ ان تینوں میں جو قدرِ مشترک ہے وہ ہے ان کی آفاقی، اخلاقی اور روحانی اساس۔ بدقسمتی سے یہی اساس ہمارے موجودہ نظامِ حیات میں مفقود ہے۔ اور اس کے باعث مختلف شعبہ ہائے حیات تضادات و انتشارات کا شکار ہیں، جن میں شعبۂ تعلیم بھی شامل ہے۔ معلمِ انسانیت نے اپنے بے مثال معلّمانہ کردار و عمل سے ایک مختصر عرصے میں ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جس کا ہر فرد جذبۂ عمل، قوتِ تخلیق اور عرفانِ حق سے سرشار تھا۔ آپؐ نے ان امور کی بھی وضاحت کی کہ قرآنی تعلیمات حصولِ علم، تحقیق و تدقیق، مادی ترقی، سائنسی ایجادات کی کوئی حدیں مقرر نہیں کرتیں۔ صرف ان کے حصول اور استعمال کو پابندِ آداب کرتی ہیں تاکہ حیاتِ انسانی کو مادی اقدار کے ساتھ ساتھ روحانی اور اخلاقی اقدار پہ قائم کیا جا سکے۔ ماضی یا موجودہ دَور میں تعلیم کی مادی اور روحانی، اخلاقی اقدار کے مابین عدم توازن نے ہی انسانوں اور معاشروں کو تباہ کن بحرانوں سے دوچار کیا ہے۔ ہماری سوچ اور ہمارے عمل میں خارج پرستی اور خارج پسندی اس درجہ در آئی ہے کہ اجتماعی اعتبار سے آج کا عالمی معاشرہ خود بینی و خود آگہی کی صفات سے کم و بیش محروم ہے۔ قومیں اور معاشرے ایسے اصول و نظام ہائے تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں جو انہیں مخصوص ظاہری کردار کے حامل افراد مہیا کر سکیں۔ لیکن تعلیمی نظریات اور مادی سہولتوں میں بے پناہ پیش رفت کے باوجود ہر معاشرہ ہر قسم کے بحرانوں سے دوچار ہے۔ تعلیم ہی کو لیجیے۔ بڑھتی ہوئی تعلیمی سہولتوں کا مسئلہ، معیارِ تعلیم کا مسئلہ، وسائل کی کمیابی کا مسئلہ، ریاست کے اساسی نظریے کی ترویج کا مسئلہ، مروّج نظامِ تعلیم کی صلاحیت و اہلیت کا مسئلہ بین الاقوامی تعلیمی پیش رفت سے استفادے کا مسئلہ، زیرِ تعلیم نسل کی خالی ایاغی، تاریک جانی، کم نگاہی، بے یقینی اور تشنہ لبی کا مسئلہ، اور نظامِ تعلیم کی محکومی و تقلید اور زوالِ تحقیق کا مسئلہ۔ میرے نزدیک یہ آخری دونوں مسئلے ہماری فوری توجہ کے طالب ہیں۔

ہمارے گردوپیش میں پھیلے ہوئے معاشرے بھی کم وبیش ایسے ہی تعلیمی حالات وکوائف سے دوچار ہیں۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں تعلیم کے میدان میں عالمی سطح پہ ایک ایسی سوچ اُبھر رہی ہے جو تعلیم کی میکانکی توضیع کے ساتھ تعمیر کردار پہ زور دے رہی ہے۔ آج کے دور میں اہل فکر ونظر ہر تعلیمی مرحلے میں تعمیر کردار کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں اور مغرب ومشرق کے قابل قدر ادارے اپنے نصابات میں اس امر کی واضح نشاندہی کر رہے ہیں۔ کیونکہ معاشرے لاتعداد مادی فوائد وترقی کے حصول کے باوجود ناآسودہ ہیں اور ان کا مستقبل مبہم وغیر یقینی۔ اس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ جدید دور نے انسان کو محض ایک تخلیقی فعلیت تک محدود سمجھا۔ حالانکہ انسان تخلیقی فعلیت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی فعلیت بھی ہے جو خدا تک پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی نظام تعلیم میں ان دونوں اقسام کی فعلیتوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ضروری ہے۔ اور معلم انسانیتؐ نے اپنے اسوۂ حسنہ، طلب علم اور تربیت خاص سے صحابۂ کرامؓ کے لیے اس کا اہتمام کیا۔ آپ معلم انسانیتؐ کے مذکورہ تینوں تعلیمی احسانات کا استحضار کریں۔ تو آپ کو یہ محسوس کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ ہر مرحلہ میں فرد کی اصلاح اور حیاتِ اجتماعیہ کی بہبود آپؐ کے پیشِ نظر رہی۔

تعمیر کردار کا سرچشمہ اعتقادات ہیں۔ اور اس کا مظہر عادات واطوار، جب تک اعتقادات درست نہ ہوں گے عادات واطوار صحیح نہیں ہوسکتے۔ افکار بدلنے ہی سے اعمال میں انقلاب پیدا ہوسکتا ہے۔ اور یہی نکتہ خاص تھا حضورؐ کی تعلیمات کا اور بعد کے مسلمان مفکرین نے اس نکتے کی تصریحات کرکے دنیا پہ عظیم علمی احسانات کیے۔ جن کی مثال مستقبل میں بھی ملنا محال ہے۔

جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ انسان کی تخلیقی فعلیت کے ساتھ ایک روحانی اور اخلاقی فعلیت بھی ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر معلم انسانیتؐ نے تعلیم کے مقاصد کی بنیاد دینی امور وعقائد اور دنیوی مقاصد دونوں پہ رکھی۔ اور فرمایا:

> "تم میں افضل ترین وہ نہیں جو اس دُنیا کو دوسری دُنیا کی خاطر نظر انداز کر دیتا ہے ـــــ یا آخرت کو اس دُنیا کی خاطر۔ بلکہ افضل وہ ہے جو دونوں کے لیے کام کرتا ہے۔"

تعلیم کی جو دینی اساس آپؐ نے مقرر فرمائی اس میں خدا پہ ایمان، قرآن حکیم بطور سرچشمۂ علم وہدایت۔ خدا کے نزدیک انسانوں کا برابر ہونا۔ ایمان کی صفات پہ یقین وعمل وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح تعلیم کے دنیوی مقاصد میں آپؐ نے حسب ذیل امور شامل فرمائے:

ا - علوم محمودہ کے لیے سعی بلیغ کرنا۔
ب - مظاہراتِ فطرت کا گہرا تجرباتی مطالعہ کرنا۔
ج - ہر فرد کے لیے تعلیم کے موزوں، مساوی مواقع فراہم کرنا۔
د - اختیاری مضامین کا انتخاب طالب علم کی ذاتی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کی روشنی میں کرنا۔
ہ - حصولِ علم وفن کے لیے باضابطہ تدریس و رہنمائی کا اہتمام کرنا۔

ان مقاصد کے حصول اور انسان کی تخلیقی، روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کی تربیت کرنے اور انھیں کا ملاً بروئے کار لانے کے لیے تربیت اساتذہ کا ضابطہ وضع فرمایا۔ جس میں ضروری ہے کہ استاد کو قرآنِ حکیم کی جزئیات کا پورا پورا علم ہو۔ اور وہ عمومی اور سائنسی علوم کے علاوہ وجدانی صلاحیتوں کا بھی حامل ہو۔ تربیت اساتذہ کے لیے مسلمان مفکرین نے اصول منضبط کیے ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

ا - تعلیم کے باب میں صاحبِ شریعتؐ کی اقتدا کرے۔
ب - شاگردوں پر شفقت کرے اور انھیں اولاد کے برابر سمجھے۔
ج - شاگرد کو نصیحت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔
د - جہاں تک ممکن ہو شاگرد کو بری عادتوں سے کنایۃً اور پیار کے ذریعے منع کرے۔
ہ - استاد جو علم سکھاتا ہو، شاگرد کے دل میں اس علم کے مقابلے میں دوسرے علوم کی برائی مہیا نہ کرے۔
س - شاگرد کے سامنے بیان کرنے میں اس کی سمجھ پر کفایت کرے۔
ص - استاد اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہو۔ اس کے قول وفعل میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔

ان مختصراً بیان کردہ اصولوں پر نظر کریں۔ تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ اصول دینِ فطرت کے تقاضوں اور انسانی اہلیتوں کو سامنے رکھ کر وضع کیے گیے ہیں۔ اور تاریخِ عالم گواہ ہے، کہ اساتذہ جب تک ان پر کاربند رہے ۔ انھوں نے بے بدل عالموں اور قابلِ رشک انسانوں کی تخلیق کی۔ یہ فطری اصولِ تعمیر کردار ہم نے اکثر نظر انداز کر دیے اور جدید نظریاتِ تعلیم میں ان کا دخل عمل برائے نام رکھا۔ البتہ دینی مدارس میں ان اصولوں کی پابندی کسی طور پر ہو رہی ہے اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ عقائد و نظریات کی پختگی کے اعتبار سے دینی مدارس کے

فاضلین عام تعلیمی اداروں کے فاضلین سے بہتر ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیمی افراتفری کے اس دور میں ان اصولوں کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ اور ان کی قابلِ فہم صورت کی ضروری اشاعت کرنے کے ساتھ ساتھ اس پہ عمل درآمد کا اہتمام کیا جائے۔

تربیتِ اساتذہ

مسلمان اہلِ فکر نے جہاں مطالعہ سیرتِ پاک کی روشنی میں اساتذہ کی تربیت کے لیے کچھ اصول منضبط کیے وہاں انھوں نے معلّمِ انسانیتؐ کے کردار و عمل کی روشنی میں طلبہ کی سیرت کی نشوونما اور اخلاقی تربیت کے لیے کئی ایک مفید اصول متعین کیے اور ان کی تفصیلاً تشریح کی۔ یہاں چند ایک کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

"بچے کی تہذیب و تربیت ایک نہایت ضروری امر ہے۔ وہ اپنے والدین اور اساتذہ کے پاس ایک امانت ہے۔"

بچے کے لیے سب سے زیادہ ضروری پاکیزگیٔ نفس ہے۔

ا۔ بچے میں پہلے غذا سے رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی تعلیم کی ابتدا کھانے کے آداب سے کرنی چاہیے۔

ب۔ بچے کو محنت اور مشقت کا عادی بنایا جائے۔

ج۔ بچے کو سادہ اور سفید کپڑے پہننے کا شوق دلایا جائے۔

د۔ جب بچہ کوئی اچھا کام کرے تو تعریف کرکے اس کا دل بڑھانا چاہیے۔ اور اس کو انعام وصلہ دینا چاہیے۔

ہ۔ دن کے وقت سونے سے منع کرنا چاہیے۔

و۔ اس بات پہ کڑی نظر رکھنی چاہیے کہ بچہ کوئی کام چھپا کر نہ کرے۔

ح۔ ہر روز کچھ پیدل چلنا اور ورزش کرنا بچے کے لیے ضروری ہے۔ نیز مناسب کھیل کھیلنے کا موقع دیا جائے۔

ی۔ اپنے پڑھنے لکھنے کے عمدہ سامان پہ فخر و غرور نہیں کرنا چاہیے۔ اس امر کی بچے کو سخت تاکید کی جائے۔

ک۔ بچہ غریب ہو تو اسے بتایا جائے کہ کسی سے کچھ لینا حوصلہ مندی کے خلاف ہے۔

ل۔ جب تک کسی ایک فن کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات حاصل نہ کرلے کسی دوسرے فن

کی طرف توجہ نہ دے ۔

ن ۔ تمام علوم کی تحصیل کا مقصود خوشنودیٔ خدا ہے ۔

ق ۔ جتنے بھی عمدہ علوم ہیں، ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرے ۔

بظاہر مذکورہ اصول معمولی معلوم دیتے ہیں۔ مگر ان کی بنیاد طویل انسانی تجربات اور امور ربانی اور احکام فطرت پر ہے ۔ اس لیے ان کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں۔ بشرطیکہ ان پر اساتذہ خلوص سے عمل کریں ۔ دراصل بچے کی فطرت اس درجہ پیچیدہ نہیں جس قدر مغربی اہلِ فکر نے تاثر دینے کی کوشش کی ہے ۔ فطرت انہی تمام تر بوقلمونیوں کے باوصف سادہ ہے اور ویسے ہی بچے کی فطرت ۔ یہی وجہ ہے کہ معلّمِ انسانیتؐ نے تعلیم اطفال اور تعمیر کردار کے لیے قرآن کریم اور اپنے کردار و عمل سے جو اصول منضبط کرائے ان کی افادیت اور تاثیر کسی بھی شک وشبہ سے بالا تر ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عصری تقاضوں کی روشنی میں انکی تصریحات مرتب کریں ۔ ان کی موزوں اشاعت و تبلیغ کریں اور انھیں تعلیمی نظام کے مختلف مدارج کا ضروری جزو بنائیں ۔ حصول و اشاعتِ علم و فن کے عمل کو مؤثر اور منظم بنائیں ۔ اس سلسلے میں ضروری سہولتوں کو انسانی حقوق کی روشنی میں عام کریں۔ اس سارے عمل میں سیرۃ النبیؐ اور صحابہ کبارؓ کے علم و عمل سے استفادہ کریں ۔

اخلاقیاتِ نبوی

جناب محترم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

جس نقطۂ نظر سے یہاں نبوی اخلاقیات (جس کا ماخذ علم بالوحی ہے) کی وضاحت مطلوب ہے، اسے انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات سے متمیز کیے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ ہمارے تاریخی سرمایۂ علم میں ہمارے معلمینِ اخلاق نے انسانی اخلاقیات اور نبوی اخلاقیات میں جو التباس پیدا کر دیا ہے اس کو رفع کیے بغیر نہ تو دونوں قسم کی اخلاقیات کے درمیان امتیازات واضح ہو سکتے ہیں اور نہ نبوی اخلاقیات تک رسائی ممکن ہے۔ اس لیے امتیازات کو سمجھنے کے لیے بحث کی ابتدا انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات اور اس کے فکری پس منظر کے تجزیے سے کی جاتی ہے۔

اخلاقیات قدما کے نزدیک

اخلاقیات شعورِ اخلاقی کا علم ہے۔ یہ ایک نصب العین یعنی منتہائے مقصود (غایت) کا علم ہے جو غایت خیر کہلاتی ہے۔ اس لیے اخلاقیات خیر کا علم ہے۔

کائنات اور انسان کی خیر

لیکن خیر کے تصور کو بالذات یعنی اپنے بسیط معنی میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا اسے مختلف اسناد کے حوالوں سے قبول کیا جا سکتا ہے۔ یہ کائنات کی خیر ہو سکتی ہے (افلاطون) یا عالم من حیث الکل کی غایت، جس کی طرف انسان اور اس عالم کی عظیم حرکت میں ہر چیز کو محیط ہے۔ یہ اس کائنات کے ایک جزو کی خیر ہو سکتی ہے۔ یعنی انسان کی خیر بحیثیت انسان۔ یہ اس کی فطرت من حیث الکل کی خیر ہو سکتی ہے جس میں اس کی صحت، فارغ البالی، مسرت، تہذیب، علم وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ یا یہ فطرتِ انسانی کے کسی مخصوص پہلو کی خیر ہو سکتی ہے، یعنی انسان کی خیر اس کے کردار کے حوالے سے۔

ماہیت خیر کی جستجو اور ماقبل سقراط فلاسفہ

اب ماہیت خیر کی جستجو، یعنی اخلاقیاتی جستجو تاریخ فکر میں ان تمام مدارج کو لیے ہوئے ہے۔ ماقبل سقراط فکر کا تعلق فلسفہ نظری سے ہے۔ فلسفہ عملی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ کنہ کائنات کیا ہے؟ اس کا مسئلہ یہ نہیں کہ ماہیت خیر کیا ہے؟ بہرکیف جو کوئی کل حقیقت پر غور کر رہا ہے — یعنی فلسفی — وہ اس عالم میں انسان کے، یعنی اپنے مقام و منصب پر غور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نکتے (یعنی انسان کے متعلق) پر غور و خوض مذہبی اور اخلاقی غور و خوض کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ اس طرح فلاسفۂ قدیم کے افکار کے وہ تمام اجزا جو ہم تک پہنچے ہیں، ماہیت خیر کے بارے میں نہایت عمیق اور دقیق بیانات ہیں۔

لیکن یہ بیانات غیر مربوط ہیں، عامی فکر کی طرح غیر آہنگ ہیں اور ماہیت خیر کی جستجو کے طور پر کسی طریق و منہاج کے مطابق ایک منظم، مرتب اور باقاعدہ فکر کی حیثیت نہیں رکھتے۔

سوفسطہ کا ظہور

اس کے بعد سوفسطہ کا ظہور ہوتا ہے۔ علمائے دانش کا یہ گروہ فن حیات اور زندگی میں آگے بڑھنے کے فن کے مقبول اساتذہ پر مشتمل تھا۔ زندگی بسر کرنے کے فن میں یقیناً چند نیکیوں پر عمل پیرا ہونا بھی شامل ہے۔ یہ فن نیکیوں کے ایک مربوط نظام کو بھی محیط ہے اور ایک حد تک فکر کو نیکیوں پر بھی مرکوز رکھتا ہے۔ لیکن اس کا اولین تعلق نیکیوں کی ماہیت کی جستجو سے نہیں بلکہ نیکی سے اس کا سروکار ذاتُقہ کامیابی کی حد تک ہے۔ نیکی کے جزو قابلیت ہونے کی حد تک سوفسطائی فلسفہ اخلاقی کردار کا علم نہیں ہے۔

ماقبل سقراط فلاسفہ کا کوئی اخلاقی فلسفہ نہ تھا

اس طرح ماقبل سقراط فلاسفہ کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا کوئی اخلاقیاتی فلسفہ بھی تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی اخلاقی مسئلہ پیدا ہو، اخلاقیاتی وقوف اور انسانی امتیاز کا پختہ ہو جانا ضروری ہے۔ پہلے مرکب کا وجود ہوتا ہے، پھر بسیط کی نوبت آتی ہے۔ پہلے ہمارے سامنے واقعات ہونے چاہئیں، تب ہی ان پر غور کر سکتے ہیں۔ واقعات علمی تحقیقات کی جانب رہنمائی کرتے ہیں کیونکہ ان کے درمیان تضاد اور التباس ہی سے اخلاقیاتی غور و فکر کی تحریک ہوتی ہے۔

(یہ تضاد والتباس سوفسطا نے پیدا کیا تھا۔ جہاں تک مابعد الطبیعیات کا تعلق ہے، نظریات کی کثرت نے انہیں متشکک بنا دیا تھا)

سقراط کا فلسفۂ اخلاق

سقراط کا موقف یہ ہے کہ :

۱۔ نیکی علم ہے کیونکہ ہر فرد اپنی خیر کی تلاش میں ہے اور اسے نیکی تب ہی حاصل ہو گی جب وہ جانے گا کہ یہ اس کی خیر ہے۔ لہٰذا اچھائی اور برائی کا علم حاصل ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم علت ہے اور نیکی معلول ہے۔ لیکن اس کا میلان یہ ہے کہ علم کو سب سے بلند و بالا رکھا جائے۔

۲۔ نیکی مفید ہے۔ غائیت سے ضرور مسرت اور فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کا فی الحقیقت مطلب یہ ہے کہ نیکی دراصل خوشگوار ہے اور لذت ہی غایت اصلی ہے۔

یونانی ذہن کے نزدیک نیکی اور لذت ہم آہنگ ہیں

یونانی ذہن دونوں خصائل ــــ نیکی اور لذت ــــ کو مخالف قرار نہیں دیتا۔ حقیقتہً یہ غایت قصویٰ کو مسرت کے انداز میں تصور کرنے سے نیکی کو لذت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی حالت ایسی نظر آتی ہے جیسے ایک بچہ، یا ایک متمول آدمی، جس کے لئے ابھی زندگی کی وحدت ختم نہیں ہوئی۔ زندگی کی وحدت واقعی اور معیاری دونوں ایک ہی سمت میں ہیں، مسلسل ہیں اور متمیز نہیں۔ یہ جدا جدا نہیں۔ ان دونوں کے درمیان شگاف نہیں ہے۔ ایک بچہ یا ایک متمول آدمی نیک کرداری یا نیکی کو ایک آسان کارنامہ سمجھتا ہے، جس کی بدولت اسے دوسروں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے، جس سے بالعموم اسے نفع اور طمانیت دونوں چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ فرائض کے ایک محدود اور متعین دائرے میں زندگی بسر کر رہا ہے جنہیں وہ آسانی سے انجام دے سکتا ہے، جنہیں زمین کے بسنے والے اور اس کے زمانے کے سب لوگ سراہتے ہیں۔ وہ اخلاقیت کو غایت کی صورت میں تصور کرتا ہے۔ خواہش اور اس کی تسکین کے طور پر۔ اس کے نزدیک فرض اور لذت ہم آہنگ ہیں۔

دورِ وسطیٰ کی اخلاقیت تکمیلِ فرائض میں متصور ہوتی ہے

ازمنۂ وسطیٰ میں مذہب کے دور میں انسان بالغ ہو جاتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں زندگی کی وحدت ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ انسان حیاتِ ارضی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اور وہ قدم

(ETERNITY) کا باسی ہو جاتا ہے۔ ایک لا محدود وجود اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہاں سے اس کے فرائض کی ابتدا ہوتی ہے، جنہیں اس دنیا کی زندگی سے ہرگز نہیں ناپا جا سکتا۔ ان (فرائض) کے نتیجے میں لذت شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہے اور جہاں اسے لذت حاصل ہوتی ہے، وہ فانی لذتوں کے لیے کوئی ذوق ہی نہیں رکھتا۔ اس طرح وہ فرائض اور تسکین خواہشات (لذت) کو متضاد سمجھتا ہے۔ دونوں کے درمیان شگاف وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ اخلاقیات کو قانون کی صورت میں تکمیلِ فرائض کے انداز میں احکامِ خداوندی کے طور پر تصور کرتا ہے۔

ہمارے معلمین اخلاق کے علمی ولولے کا اثر

ہمارے معلمین اخلاق اور فلاسفہ نے جب قرآن مجید کی اس آیۂ پاک سے ولولۂ علم اخذ کیا:

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ

تو ان کے ذہن اور دل سے انسانی علم اور علم بالوحی کے درمیان فرق کا شعور محو ہو گیا اور وہ سب انسانی استعداد ہی کے زائیدہ علم الاخلاق کو نبوی اخلاقیات تصور کرتے رہے۔

ترقی یافتہ انسانی اخلاقیات اور اخلاقیاتِ نبویؐ

اخلاقیات یا علم الاخلاق کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ اخلاقیات جو انسانی استعدادِ علم کے زائیدہ علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور دوسری وہ جو اخلاقیات نبوی کی حیثیت رکھتی ہے اور علم بالوحی سے ماخوذ ہے۔ انسانی اخلاقیات کا موضوع فضائل اخلاق، ان کا معیار اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں؟ ان کا معیار کیا ہے اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے؟ اس کا وظیفہ معیار اخلاق کے حوالے سے فضائل و رذائل اخلاق کی توجیہ ہے۔ اس کا منہاج یہ ہے کہ پہلے مختلف قسم کے قضیوں سے اخلاقی قضیے کو متمیز کیا جائے، مثلاً:

مکان اچھا ہے (رہائش کے لئے)

گھوڑا اچھا ہے (سواری یا باربرداری کے لیے)

منظر اچھا ہے (اس لیے کہ فرحت بخش ہے)

محاسب اچھا ہے (کیونکہ حساب صحیح کرتا ہے)

طبیب اچھا ہے (کیونکہ اس کے علاج سے جلد شفا ہوتی ہے)

آدمی اچھا ہے (کیونکہ اس کی سیرت اچھی ہے)

بینائی اچھی ہے (کیونکہ دور اور نزدیک کی چیزیں بغیر عینک کے صاف نظر آتی ہیں)
صحت اچھی ہے (کیونکہ بغیر تکان کے دماغی اور جسمانی محنت کی جا سکتی ہے)
سیرت اچھی ہے (کیونکہ عمل اچھا ہے)
نظریہ اچھا ہے (کیونکہ علمی توجیہ ہو جاتی ہے)
گر اچھا ہے (کیونکہ سوال آسانی سے حل ہو جاتا ہے)
عمل اچھا ہے (کیونکہ وہ ایک معیار پر پورا اترتا ہے)

ان قضایا میں صرف تین قضیئے اخلاقی قضیئے ہیں: آدمی اچھا ہے۔ سیرت اچھی ہے۔ عمل اچھا ہے۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معیار کیا ہے؟ یہی انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کا بنیادی مسئلہ ہے۔

انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کی نشو و نما کے بہت سے ارتقائی مدارج ہیں جن سے گزرنے کے بعد وہ اس مرحلے پر پہنچی ہے کہ اخلاقیاتِ نبوی کے حوالے سے اپنی کمی کو پورا کر سکے۔

انسانی اخلاقیات کی نشو و نما "اقدام و خطا" کے طریقے سے ہوتی ہے۔ کبھی یہ سوچا گیا کہ مقصود معیار کیا ہے؟ اس کے معنی یہ تھے کہ جس عمل سے مقصود حاصل ہو وہ نیکی ہے اور جس عمل سے مقصود حاصل نہ ہو وہ بدی ہے ـــــ اور مقصود کبھی تو خواہش کی تکمیل متصور ہوا، کبھی خواہش کی نفی متصور ہوا، کبھی عقلی تقاضے کی تکمیل متصور ہوا، کبھی عقلی تقاضا خواہش اور عقل دونوں کی متناسب تکمیل طے پایا۔ پھر یہ مشکل پیدا ہوئی کہ دونوں کا تناسب کیسے متعین ہوگا؟ اس طرزِ فکر نے مصلحت پرستی کو اخلاق بنا دیا۔ حالانکہ انسان کا شعورِ اخلاقی اس سے بغاوت کرتا ہے۔

چونکہ انبیا کی تاریخ نے نوعِ انسانی کو دو قسم کی وراثت سپرد کی ہے: ایک انفسی وراثت، جو انسان کے باطن میں ہے، جس کی طرف اس آیتِ پاک میں اشارہ ہے:

وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

اور دوسری آفاقی وراثت جو قرآن مجید ہے، جس سے نبوی اخلاقیات اخذ کی جا سکتی ہے۔

تاریخِ انبیا کی انفسی وراثت فجور و تقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار، اپنے نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے اور پورے عالمِ انسانی میں، کسی نہ کسی درجے میں، کم یا زیادہ یہ احساس موجود ہے کہ جو نشو و نما نہ پا سکے، اس کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اسی لاشعور کو نشو و نما دیکر، جس کی طرف اس آیتِ پاک میں اشارہ ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ

جسے بالقوہ فطرت کہہ سکتے ہیں، جیسے نشوونما دیکر ایک زندہ طاقت بنا کر اس کے تحت بالفعل فطرت انسانی کو منضبط اور متقاد بنانے کے لیئے انبیاء علیہم السّلام کی بعثت ہوتی رہی، جس کے لیئے علم بالوحی سے روشنی (تعیین غایت)، رہنمائی (لائحہ عمل) اور ہدایت غایت تک پہنچانے کا ضامن طریق کار میسر آتا رہا، جس کے زیر اثر انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات ارتقا پذیر ہو کر مقصود کے بجائے "اخلاقی حکم" کو معیار بنانے کے مقام عروج پر فائز ہوئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ جو فعل اخلاقی حکم کی پیروی کی نیت سے صادر ہوتا ہے وہ نیکی ہے اور جو فعل اخلاقی حکم کی خلاف ورزی میں صادر ہوتا ہے وہی بدی ہے!

اول تو ذہن انسانی حیات انسانی کو تمام فضائل اخلاق سے مزین کرنے کے لیے اخلاقی احکام کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے اور اگر وہ اخلاقی احکام کا احاطہ کر بھی سکے تو بھی صرف یہ مسئلہ تو حل ہو جائے گا کہ فضائل اخلاق کیا ہیں اور ان کا معیار کیا ہے، مگر انسانی استعداد کا زائیدہ نظام اخلاقیات اس وقت تک مکمل نہ ہو سکے گا جب تک اخلاقیات نبوی کے حوالے سے پہلے یہ مسئلہ حل نہ ہو کر زندگی فضائل اخلاق کے نمونے پہ ڈھلے تو کیونکہ اس لیے اخلاقیات نبوی مقدم ہے اور انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات مؤخر ہے۔

لہٰذا نبوی اخلاقیات کا مسئلہ بعثت نبی علیہ التسلیم والتحیہ کے حوالے سے متعین ہو سکتا ہے۔ نبوی اخلاقیات (علم الاخلاق) کو علم بالوحی یعنی وحی قرآنی سے اخذ کرنا ضروری ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ

یعنی میں مکارم اخلاق کے اتمام کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں ـــــ مگر یہاں یہ غور کرنا ضروری ہے کہ انسانی زندگی سب فضائل ومحاسن ومکارم سے مزین ہو جائے بلکہ اتمام مکارم اخلاق اس وقت میسر آئے گا جب بدی کے مقابلے میں نیکی کو کسی قسم کا اضمحلال نہ ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غایت بعثت وہی ہے جو اس آیت پاک میں بیان ہوئی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

مگر جب سے ہم نے انسانی استعداد کے زائیدہ علم اور علم بالوحی کے مابہ الامتیاز سے صرف نظر کیا ہے ہم انسانی استعداد ہی کی زائیدہ اخلاقیات کو نبوی اخلاقیات سمجھتے رہے ہیں۔ جسے اس میں شک ہو وہ حضرت مولانا سلیمان ندوی کی سیرت النبی ﷺ کی چھٹی جلد کو غور سے دیکھے تو نظر آئے گا کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ بھی ارسطو ہی کے شاگرد رہیں، کیونکہ اس میں فضائل اخلاق بھی ارسطو ہی کے بیان ہوئے

ہیں۔ عفت، شجاعت، حکمت اور راس الحسنات عدالت اور معیار افراط و تفریط کے درمیان نقطۂ اعتدال جو ارسطو کو بھی نہیں معلوم کہ افراط و تفریط کی دو انتہاؤں کے درمیان کہاں واقع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بدی کے درمیان نوعیت کا نہیں بلکہ مدارج کا فرق ہے۔ جو بدی افراط سے پیدا ہوتی ہے اس میں بدی کو کچھ کم کرنے سے وہ نیکی بن جائے گی اور جو بدی تفریط سے پیدا ہوتی ہے اس میں بدی کا اضافہ کرنے سے وہ نیکی بن جائے گی ——— جب سے ہمارے ذہن سے علم بالوحی اور انسانی علم کے درمیان امتیاز محو ہوئے ہیں ہم نے لوٹ کر نہیں دیکھا کہ ہمارے تمام معلمینِ اخلاق ——— ابنِ مسکویہ، محقق طوسی، محقق دوانی ——— اپنی عظیم الشان تصانیف میں ارسطو ہی کے فلسفۂ اخلاق کی جگالی فرماتے رہے ہیں۔ ابنِ مسکویہ کی تہذیب الاخلاق تو ارسطو کی نیکومیکن ایتھکس کا چربہ ہے اور محقق طوسی اپنی اخلاق ناصری کے دیباچے میں یوں رقمطراز ہیں کہ: میرا کوئی شیوہ بجز ارسطو کے فلسفۂ اخلاق کی ترجمانی کے نہیں ہے۔ اور محقق دوانی نے بھی ارسطو ہی کا فلسفۂ اخلاق اخلاقِ جلالی میں پیش کیا ہے۔ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی نے بھی اپنے فلسفۂ اخلاق پر مشتمل رسالے میں ارسطو ہی کے فضائلِ اخلاق کو فضائلِ اخلاق سمجھا ہے جو دورِ جاہلیت کے وثن پرستی کے ماحول میں فضائلِ اخلاق متصور ہوں تو ہوں مگر نبوی اخلاقیات کی روشنی میں ان کی حیثیت رذائلِ اخلاق سے مختلف نہیں رہ جاتی۔

انسانی علم اور علم بالوحی

جب تک انسانی علم اور علمِ بالوحی کے درمیان امتیازات پیشِ نظر نہ رہیں، علمِ بالوحی سے استفاضہ ممکن نہیں۔ انسانی علم تو اس استعداد کے قوت سے فعل کی طرف آنے کا نتیجہ ہے جس کی طرف اس آیتِ پاک میں اشارہ ہے:

عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا

یہ استعداد اور اس سے پیدا ہونے والے علم کی نشو و نما اقدام و خطا کے انداز میں ہوتی رہی ہے۔ اس لئے اس کی نشو و نما کا اتمام کو پہنچنا تو کجا اس کے اتمام کا رُخ بھی متعین نہیں ہو سکا اور انسانی فکر تضادات میں الجھ کر رہ گیا اور انسانی ذہن کا نارسیدہ علم یہ طے نہ کر سکا کہ اخلاق کا معیار "مقصود" ہے یا "حکم" ہے کیونکہ بار بار معیار کے باب میں رائے بدلتی رہی ——— بخلاف اس کے نبوی علم وہبِ خالص، بذلِ مجرد اور فضلِ محض ہے۔ وحی سے ماخوذ ہے،

احتمالِ خطا سے پاک ہے، ہمیشہ سے کامل ہے۔

انسانی علم اور علم بالوحی میں امتیاز

انسانی علم اور علم بالوحی کے درمیان امتیازات کو سمجھنے کی اولین شرط یہ ہے کہ پہلے علم اور عمل کے درمیان امتیاز کو سمجھا جائے کیونکہ علم کا موضوع حقیقت محسوس ہے اور عمل کا موضوع مقصود ہے۔

علم کا مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ اور عمل کا مسئلہ یہ ہے کہ مقصود حاصل کیسے ہو؟
علم کی ابتدا شک سے ہوتی ہے۔ عمل کی ابتدا یقین سے ہوتی ہے۔
علم میں ادراک اہم ہے۔ عمل میں ارادے کو اہمیت حاصل ہے۔
علم کا بنیادی تصور جبر ہے۔ عمل کا بنیادی تصور اختیار ہے۔
علم کا وظیفہ توجیہ و تعلیل ہے۔ عمل کا وظیفہ تخلیقِ نتائج ہے۔
علم کے مضمرات — یعنی وہ شرائط جن کے پورا ہونے کے ساتھ علم مشروط ہے — یہ ہیں کہ ایک طرف ناظر ہو، دوسری طرف منظور ہو۔ ناظر میں ادراک کی صلاحیت ہو اور منظور ایسا ہو جو ناظر کی استعداد سے ادراک میں آسکے تو علم حاصل ہوگا ———— بخلاف اس کے عمل کے مضمرات یہ ہیں کہ ایک طرف فعال عامل ہو، دوسری طرف مقصود ہو۔ حصول مقصد کی جدوجہد کی راہ میں مزاحمت ہو اور فعال عامل کی جانب سے مزاحمت کی مزاحمت ہو تو مقصود حاصل ہو کر رہے گا۔

لہٰذا انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کا مسئلہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں؟ ان کا معیار کیا ہے؟ اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے؟ (یہاں یہ یاد رہے کہ جس مابعد الطبیعیات کا مطالبہ انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کو ہے اس کی استعداد انسان کو عطا نہیں کی گئی)

بعثتِ نبوی کا مقصود حیاتِ انسانی کے انفرادی (اخلاقی)، اجتماعی (معاشرتی، معاشی، سیاسی) اور بین الاقوامی پہلوؤں میں انقلاب لانا ہے۔ اور وحی قرآنی کا پیغمبرانہ قیادت کی دعوت انقلاب میں اسے ہدایت فراہم کرنا ہے۔ اخلاق کا تعلق افراد اور معاشرے سے ہے کیونکہ پیغمبرانہ قیادت جن خصائص کا حامل معاشرہ پیدا کرکے اس کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر دینِ حق کو غالب کرنا چاہتی ہے وہ یہ ہیں؛

- معاشرہ نوعِ انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔
- اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی الذہن افراد پر مشتمل ہو۔
- ان کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف اور غم سے محفوظ رہے۔

نبوی اخلاقیات کے مسائل

لہٰذا انقلابی اخلاقیات نبوی کے مسائل یہ ہیں:

١۔ زندگی کے انفرادی (اخلاقی) پہلو کی اصلاح طلب خاصیت کیا ہے؟
٢۔ اس اصلاح پذیری کا تصور کیا ہے؟
٣۔ کس نصب العین کے حوالے سے اصلاح ہوگی؟
٤۔ حصولِ نصب العین کے یقین کی اساس کیا ہے؟
٥۔ حصولِ نصب العین کا حتماً نتیجہ خیز لائحہ عمل کیا ہے؟
٦۔ اس پر عمل پیرا ہونے کی عملی اساس کیا ہے؟
٧۔ عملی جدوجہد کو پرکھنے کا معیار کیا ہے؟
٨۔ اس جدوجہد میں کامیابی کا نمونۂ کمال کیا ہے؟ اور
٩۔ وہ محرک عمل کیا ہے جو استقامت دلا دے اور انحراف نہ کرنے دے۔

انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات نہ تو تضادات سے پاک ہو سکی ہیں نہ نتیجہ خیزی کی ضمانت سے متصف ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مسئلہ ہی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں اور ان کا معیار کیا ہے؟

انسانی علم اور علم بالوحی میں التباس

علم بالوحی (قرآنی علم) پیغمبرانہ قیادت کی انقلابی جدوجہد کے مسائل کو حل کرنے کے لیے نازل ہوا ہے جو انقلاب کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی حاجتمندی سے بے نیاز کرتا ہے۔ مگر مذہبی ذہن کی معذوری یہ ہے کہ وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ قرآن مجید کے ایک ایک لفظ اور زیر زبر کے محفوظ ہونے کے باوجود قرآنی علم نے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی حاجتمندی سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی ذہن نے قرآنی مفہوم میں اسے کتاب سمجھنے کے بجائے لغت کے حوالے سے توریت کی تمثیل پر قیاس کر کے صرف اوامر و نواہی کا لکھا ہوا ضابطہ تصور کیا ہے۔ اور توریت کی معذوری یہ تھی کہ اس کی پیروِ امت زوال میں مبتلا ہو جانے کے بعد صرف توریت کے حوالے سے نئے

بعثت کے بغیر زوال سے نہ نکل سکی تھی۔ اس لیے مذہبی ذہن کے نزدیک امت مسلمہ کی معذوری بھی یہی ہے کہ وہ بھی زوال پذیر ہوکر قانون سازی کے سہارے زوال سے اس لیے نہیں نکل سکتی کہ جب وحی قرآنی سے ایک دفعہ اوامر و نواہی کا علم حاصل ہوگیا تو وہ انسانی علم بن گیا۔ اور اب یہ انسان ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ احکام شرع کی پیروی کرے تو اصلاح پذیر ہو، نہ کرے تو گمراہی میں مبتلا رہے۔

شرع کو اخذ کیا گیا اور منہاج سے صرفِ نظر کیا گیا

دراصل اس موقف کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آیت
وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ؕ
میں مذہبی ذہن نے اپنی توجہ صرف "شرع" پر مرکوز رکھی اور "منہاج" سے صرف نظر کر لیا حالانکہ منہاج وہ طریق کار تھا جس کے ذریعے زندگی شرعی اقدار و فضائل کے نمونے پہ ڈھلتی کیونکہ علم بالوحی کا تو مسئلہ ہی یہ تھا کہ حیاتِ انسانی کو اپنے انفرادی (اخلاقی)، اجتماعی (معاشرتی، معاشی، سیاسی) اور بین الاقوامی پہلوؤں میں جس نمونے پہ ڈھلنا چاہیے وہ ڈھلے کیونکر؟

دوسری وجہ تکمیلِ دین کے قرآنی مفہوم کو مسخ کر کے اسے تکمیل فقہ قرار دینا ہے۔

ایک اور وجہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینا ہے کہ مؤثرات زندگی (اخلاق، علم، مذہب، معاشرت، معیشت، سیاست) کے بدل جانے سے زندگی کے تقاضے احکام فقہ کی خلاف ورزی ہی سے پورے ہوسکتے ہیں۔ یہ سب کچھ قرآن مجید سے قانونِ حیات اخذ کرنے کے بجائے صرف فقہی قانون کو اخذ کرنے کا نتیجہ ہے۔ قانون سازی اس وقت تک موثر رہی جب تک سلاطین غلبے اور اقتدار سے محروم نہیں ہوئے۔ جب سلاطین اقتدار سے اور قانون قوتِ نافذہ سے محروم ہوا تو قانون بے اثر ہوگیا۔ اگر "کتاب" کا قرآنی مفہوم پیشِ نظر رہتا تو اسے لغت کے حوالے سے اوامر و نواہی کا لکھا ہوا ضابطہ سمجھنے کے بجائے قانونِ حیات کا ماخذ سمجھ کر اس سے زندگی طلب کی جانی چاہیے تھی۔

کتاب کا قرآنی مفہوم

کتاب کا قرآنی مفہوم سمجھنے کے لیے قرآن مجید میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس اندازِ تخاطب پہ غور کرنا ضروری ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ

(کہ یہ بات آپ کا ادراک ذاتی نہیں ہے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے بلکہ آپ کو وحی سے معلوم ہوا ہے)

اگر کتاب کو کتاب سمجھنا وحی کے ساتھ مشروط نہ ہوتا تو توریت تو پہلے سے موجود تھی ہی۔ قرآن مجید سے کتاب کے جس مفہوم کی نشاندہی اس آیت میں کی گئی ہے اسے ان آیات کے حوالے سے سمجھنا ضروری ہے:

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ

(ہر امت کے لیے ایک فیصلہ کن ساعت ضروری ہے)

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ

(ہر فیصلہ کن ساعت کے لیے کتاب ضروری ہے)

جب تک یہ بات سمجھ میں نہ آئے کہ امت کے تعلق میں فیصلہ کن ساعت کے اندر فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ کونسی امت اپنے اعمال کی بنا پر اس بات کی حقدار ہے کہ وہ باقی رہے اور ترقی کرے اور کونسی امت اپنے اعمال کی بنا پر مٹا دیے جانے کی سزاوار ہے۔ اس وقت تک یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ فیصلہ کن ساعت سے کتاب کا کیا تعلق ہے؟ کتاب کا مفہوم کافروں پہ قرآن مجید کے اس طنز کے حوالے سے

لَا هُدًى وَّ لَا كِتَابٌ مُّنِيْرٌ

نہ حیات بخشی کا ضامن مقصود ہے نہ اس مقصود تک پہنچانے کا حتماً نتیجہ خیز عمل ہے اور کافروں پر اس طنز کا جواز تب ہی پیدا ہوتا ہے جب قرآن مجید خود وہ کتاب اور ہدایت ہو۔

نبوی اخلاقیات کے مسائل کا حل

لہٰذا!

نبوی اخلاقیات کے مسائل کا حل یہ ہے:

(۱) زندگی کے انفرادی (اخلاقی) پہلو کی اصلاح طلب خاصیت انسان کی بالفعل فطرت، یعنی جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کا اپنے آپ کو بلا قید پورا کرنے کا میلان اور اس کا مجموعۂ اضداد ہونا ہے، جس کی نشاندہی اس آیۂ پاک میں

کی گئی ہے :

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

(۲) اصلاح پذیری کا تصور یہ ہے کہ انفرادی زندگی ضبط و انقیاد کی پابند بنائی جائے اور اس میں فاعل اخلاق کے اپنے متعلق اور دوسروں کے تعلق میں جن فضائل کا پیدا کرنا ضروری ہے وہ پیدا کیے جائیں۔

(۳) اس زندگی میں ہر تبدیلی نصب العین کے حوالے سے لائی جا سکتی ہے۔ اور وہ نصب العین جس کے حصول کی جدوجہد کے ضمن میں اخلاقی فضائل پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، "انسان مرتضیٰ" یعنی ایسا انسان بننے کا نصب العین ہے جس سے اللہ راضی ہو۔

(۴) اس نصب العین کے حاصل ہو کر رہنے کے یقین کی اساس انسان کی مابعد الطبیعی ساخت ہے جس کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے :

وَ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

یہ انسان کی فطرت کا بالقوہ پہلو ہے جس کی نشاندہی اس آیتِ پاک میں کی گئی ہے :

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

فطرتِ انسانی کا یہ پہلو فجور و تقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار، اپنے نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے جن کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے :

اَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا

(۵) کائنات کی ساخت میں مضمر وہ قانون نشوونما جو اپنی ماہیت میں ناقابل تغیر ہے اور ناقابل شکست ہے، مزاحمت اور مزاحمت کا قانون ہے۔ جس کی تشکیل قرآن مجید

میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :

جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ

(ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے ایک دشمن پیدا کر دیا)

یہ دشمن جب پیغمبرانہ دعوت کی مزاحمت کرتا ہے تو اس مزاحمت کی مزاحمت سے دعوت نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔

جب اخلاق کمال کے حصول کی جدوجہد میں بالفعل فطرت مزاحم ہوتی ہے تو فجور و تقویٰ کے امتیاز اور ربوبیت کے اقرار کے حوالے سے بالقوہ فطرت اس مزاحمت کی مزاحمت سے بالفعل فطرت (جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں) پر غالب آتی ہے۔ اور اسے ضبط و انقیاد کا پابند بنانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

(۶) اس کا لائحۂ عمل عبادت کے ذریعے ایثار، انفاق اور احسان کے جذبات کو نشوونما دیتا ہے۔

(۷) اس کی عملی اساس اخلاق اور معیشت کے درمیان باہمی جوابی اضافی متضائف اور وجوبی تعلق کا ادراک ہے۔ جس کی طرف اس آیۂ پاک میں اشارہ ہے :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

(اگر تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس میں سے خرچ نہ کرو جو تمہاری نظر میں پسندیدہ ہے)

انفاق فاعلِ اخلاق کی تو نیکی ہے اور اس انفاق سے مستفید ہونے والے کے حق میں معیشت ہے۔ اور یوں اخلاق اور معیشت کا وجوبی تعلق متصور ہوتا ہے اور اس کی نتیجہ خیزی کا انکار ممکن نہیں۔

(۸) اخلاقی فضائل کا معیار نبوی اخلاقیات میں تو "حکم" ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو فعل منزل من اللہ حکم کے اتباع سے صادر ہو وہ اخلاقی فضیلت (نیکی) ہے اور جو "حکم" کی خلاف ورزی کی نیت سے سرزد ہو وہ اخلاقی رذالت (بدی) ہے۔

بخلاف اس کے انسانی استعداد کی زائیدہ اخلاقیات کی رو سے مقصد معیار ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ جس عمل سے مقصود حاصل ہو وہ نیکی ہے اور جس سے حاصل نہ ہو وہ بدی اور ہمارے معلمینِ اخلاق ابھی تک جاہلیت کے اخلاقی معیار کی پیروی سے نہیں نکلے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کبھی واعظینِ کرام کی زبان سے افراط و تفریط کے درمیان

نقطۂ اعتدال کے معیارِ اخلاق کی تبلیغ بلکہ ارسطا طالیسی معیارِ اخلاق بھی سننے میں نہ آتا۔

نمونۂ کمال

نبوی اخلاقیات کی رو سے نمونۂ کمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے :
"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ"

استقامت کا محرک

نبوی اخلاقیات کی رو سے اب محرک محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور تکذیب کا، یعنی اسلام اور کفر کا تضاد ہے اور انسان کے لاشعور میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ ہر کامیابی کے لیے فضائل اخلاق ضروری ہیں۔ اگر فضائل و رذائل کے امتیاز سے شعور عاری نہ ہو تو پہلا تضاد خواہش اور فرض کے درمیان متصور ہوگا۔ اور دوسرا خواہشات کے غلاموں اور فرض کی ادائی کے ذمہ داروں کے درمیان ——— اور یہی وہ تضاد ہے جس سے پیدا ہونے والی مزاحمت سے اخلاقی فتح وابستہ ہے !

دعوت و تبلیغ

رسولِ اکرمؐ کا عزم و استقامت

جناب محترم ڈاکٹر ایس۔ایم۔زمان

مجھے اپنی معروضات کا آغاز اس اعتراف و اعتذار کے ساتھ کرنا ہے کہ علما و محققین کے اس مقتدر اجتماع میں کوئی علمی و تحقیقی مقالہ پیش خدمت نہیں کر رہا ہوں۔ محترمی حکیم صاحب نے محض اپنی روایت کریمانہ کے پاس خاطر سے علماؑ اور دانشوروں کی اس محفل میں حاضر ہونے کا بلاوا ارسال فرمایا تو ان کی کرم گستری و عزت افزائی پر اظہار تشکر کے ساتھ اپنی جوابی تحریر میں گزارش کی تھی:

"اخلاقیاتِ نبویؐ کے موضوع پر مذاکرۂ ملّی کے اہتمام کے لیے مبارکباد تو آپ کو کُل عالم دے گا، یہ گنہگار صمیم قلب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ یہ موضوع میری، میرے بچوں کی، میرے احباب اور اقربا اور رفقاء کی اور میری قوم کی شدید ترین ضرورت ہے۔

ایک ماہر نباض کی طرح آپ نے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کی دکھتی رگ۔ ہماری روز بروز انحطاط پذیر اخلاقی اقدار۔کو پکڑا ہے، ایک طبیب حاذق کی طرح اس مہلک مرض کے نسخۂ کیمیا۔ اخلاقیات نبویؐ۔ کی نشاندہی کی ہے اور پھر قومی سطح پر اس کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہمدرد کے وسائل اور معروف تجربہ کو کام میں لانے کی روایت جاری رکھنے کا عزم کیا ہے۔ یہ مرض واقعتاً اہلِ درد (اور اہلِ مرض) کی فوری توجہ کا مستحق ہے۔ کہ بندے بندے کو لاحق ہے۔ کونسی وبا ہوگی جس نے اپنے ہلاکت آفرین پنجے اس ظالمانہ وسعت کے ساتھ انسانوں کے قلب میں پیوست کیے ہوں کہ کوئی اعلیٰ یا اسفل، حکیم یا جاہل نہ بچا ہو۔ستم یہ کہ مرض معلوم دوا معلوم طبیب مشفق و رحیم بلکہ رحمۃ للعالمین، اس کی دعوتِ عام برائے

اہل انام۔ مگر معاذ اللہ کیا ہولناک منظر ہے کہ مریض اپنے رستے ناسور اپنے ہی ناخنوں سے کریدتے نوچتے چلے جائیں، لہولہان ہوتے جائیں، پھر اپنے مرض کو آسان خیال کریں اور در خور اعتنا نہ سمجھیں یا سرے سے مرض ہی نہ مانیں۔ اور اس طرح اپنے رستے ناسوروں کو بہائم کی طرح بھنبوڑتے ہوئے بے بس ہو ہو کر گرتے جائیں۔ اجتماعی خود کشی کرنے والوں کا یہ خود فراموش جرم غفیر!!! کاش کوئی آوازہ اخلاق ہم مظلوموں کو اس قاتل بے حسی کی کیفیت سے بیدار کرکے ان گنہگار زخموں پر طبیب یثرب صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ مرہم رکھ سکے۔ اور ہم گنہگاروں کے ابدی تشکر کی سزاوار ہو۔" آخر میں اس دلی تمنا کا اظہار تھا کہ:

"مجھ گنہگار کی دعا بھی ہے آرزو بھی کہ یہ مذاکرۂ ملّی و علمی و تحقیقی مقالاتِ فاضلہ کے ذہنی پشتارہ کے بجائے اہلِ درد کی عارفانہ صدائے صدق ہو یعنی آوازہ اخلاق ہو۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ اپنی کتاب "سیرت سرور عالم" جلد اوّل کے مقدمہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ و السّلام دونوں ہی بحر ناپیداکنار ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرلے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جاسکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے روحِ دین تک رسائی پائے"[1]

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی گرامی شخصیت انبیاء و مصلحین عالم میں اس لحاظ سے مسلّم طور پر شانِ امتیاز کی حامل ہے کہ آپؐ کی حیات طیبہ کا ہر پہلو تاریخ کی پوری روشنی میں ہے۔ شمعِ رسالت کے پروانوں نے آپؐ کے احوال و اخبار و فضائل ہی نہیں ہر ہر ادا کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرلیا۔ اور ہر دور میں حاملینِ علم کا ایک معزز و محترم گروہ نسلاً بعد نسلٍ ابلاغ کے اس مقدس وظیفے پر سرفراز ہوتا رہا۔ زہے نصیب اس امت کے جس کا نورِ بصیرت، ابدی ہدایت کا نسخۂ کیمیا ہر تحریف و تغیر سے مبرا اور

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی: سیرت سرور عالم۔ جلد اوّل، لاہور، ادارۂ ترجمان القرآن، ۱۹۷۹ء (طبع دوم)، ص ۳۶

جس کے ہادی و مولا کا اسوۂ حسنہ و کاملہ مثلِ آئینہ مصفّا۔ اور حیف اُس قوم کی بے نصیبی پر جو روح کو حرارت ایمان بخشنے والی، آدمی کو انسان بنانے والی، بلکہ معراجِ انسانیت تک پہنچانے والی اُس برقی قوت کے سرچشمہ سے اپنے آپ کو منقطع کر لیتی ہے، جو ہدایت کے آفتاب عالمتاب کی حیات بخش شعاعوں سے فرار اختیار کرتی ہے اور اندھیروں کی وادی میں فروزاں چمکیلی مگر زہریلی روشنیوں کی طرف لپکتی ہے۔ اور اس طلسمات کے سحر میں مسحور ان متعفن اور اذیت ناک ناسوروں سے بے خبر ہے جو اُن مسموم شعاؤں میں پک رہے ہیں جن میں اُن کا وجود گل رہا ہے۔ صدائے جرس برابر سنائی دے رہی ہے، مگر کچھ کان بہرے ہو چکے، کچھ اسے پہچانتے نہیں، کچھ خوفزدہ ہیں، کچھ کان کھڑے ہوتے ہیں مگر زبان کو لبیک کا یارا نہیں۔ کہاں ہیں وہ نفوسِ قدسیہ جن کی آواز اُن بیمار روحوں اور مفلوج جسموں میں حرارتِ زیست دوڑا دے۔ اُن کو کشاں کشاں طبیبِ یثرب کے قدموں میں لا ڈالے جہاں دوا بھی ہے شفا بھی ہے۔ یہیں سے ان کی ابتداء تھی یہیں انتہا بھی ہے۔ انہی قدسی قدموں کے صدقے اس کی اٹھان تھی، اڑان تھی۔ یہیں اس کا ملجا بھی ہے ماویٰ بھی۔

ہر سال ہمارے ہاں میلاد کی محفلیں سجتی ہیں۔ تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے، مذاکرے، مشاعرے، جلسوں جلوسوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ ماہ و سال اپنے ناگزیر سفر میں محوِ خرام رہتے ہیں پر دانش و تحقیق کے پشتاروں تلے دبے دانشورانِ ملک و ملت نے کبھی سر اٹھا کر حساب کیا کہ ہم کتنے قدم آگے بڑھے ہیں اس قدر مقدس نقشِ پا کی طرف جسے نشانِ منزل بنانے کے عہد کے ساتھ ہم نے آزادی کا سفر شروع کیا تھا؟ محلِ فکر بھی ہے اور مقامِ فخر بھی کہ۔

ہم اس پیغمبرِ وفا کیش کے نام لیوا جس نے مشرکین کے ہاتھوں مظلوم و مجبور پابزنجیر نوجوان ابو جندل کو ڈوبتے دل اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ اُس کے والد سہیل بن عمرو کے سپرد کر دیا کہ صلح کی بات طے پا چکی تھی۔ گو عہد نامۂ حدیبیہ ابھی لکھا نہیں گیا تھا، نہ اس پر دستخط ہوئے تھے۔[1]

ہم نے کبھی اپنے خالق و مالک سے ایک عہد کیا جس کی صدائے بازگشت ہمارے بچوں، بوڑھوں، مردوں، عورتوں کی زبان کا ورد ہو گئی۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ

---

[1] ابن ھشام: السیرۃ النبویہ، القسم الثانی، مصر، مصطفی البابی الحلبی، ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء ص ۳۱۸۔

کا نعرہ قریہ قریہ گاؤں گاؤں گونجا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو رب جلیل نے ایک مرد عظیم کے ہاتھوں اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔ ہمارے حصے کی شق باقی رہی۔ ۳۵ برس ہونے کو آئے ہیں اس عرصے میں ایک نئی نسل جوان ہو کر کہولت کو پہنچ گئی۔ کیا ہم اپنا قرض اتار چکے ؟ ہم نے ارض پاکستان کو لا الٰہ الا اللہ کا جیتا جاگتا نقشہ بنانے میں کہاں تک پیش رفت کی ؟ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی پہ کہاں تک اخلاقیات و تعلیمات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ چڑھا ؟

دستوری یا قانونی بحث پیشِ نظر نہیں، ہمارے معاشرے کے عملی خدّوخال پہ نگاہ ہے، ذرا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں۔ کہاں تک اس میں اسلامی معاشرے کی شان ہے۔ اخبارات کے کالم گواہ ہیں کہ قتل، حادثاتی ہو یا ارادی، روز کا معمول بن چکا ہے۔ ڈاکہ زنی کوئی چونکا دینے والی خبر نہیں رہی۔ فحاشی اور بدکاری کی لعض لرزہ خیز مثالیں حتیٰ کہ مقدس رشتوں کی پامالی اگر شاذ و نادر کے ضمن میں بھی آئیں تو تقوٰی اور خدا ترسی کے رجحان کے تشویشناک فقدان کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ پچھلے دنوں وفاقی شرعی عدالت نے ایک دس سالہ معذور بچی کی آبرو ریزی کی کوشش کے الزام میں سزا یافتہ ایک ملزم کی اپیل مسترد کی[۳] گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں میں نامعلوم افراد نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک چار سالہ معصوم لڑکے کو نامعلوم وجوہ کی بنا پر مسجد میں لے جا کر ذبح کر دیا۔ [۴] قرآن میں ارشاد ہوا اللہ مسرفون کو دوست نہیں رکھتا[۵] رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے، نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ راہ اعتدال اختیار کرتے ہیں[۶] ایک سرکاری ادارے کے حالیہ سروے کے مطابق لاہور کے شہری پان سگرٹ پر روزانہ ۹ لاکھ روپے صرف کرتے ہیں۔ پشاور میں ہر ہفتے تین لاکھ کی نسوار استعمال کی جاتی ہے[۷]۔ شادی بیاہ جہیز، بری کی مسرفانہ نمائشوں سے کون واقف نہیں۔ تعلیمی اداروں اور سرکاری دفاتر میں نظم و ضبط کی روز بروز دگرگوں حالت، تجارت میں چھوٹے اور بڑے پیمانے پر دیانت کے اصولوں کے بجائے جلد از جلد زر اندوزی کا رجحان جس کی ظالم چکی میں غریب اور میانہ طبقہ بری طرح پس رہا ہے، اخوت

---

[۳]۔ روزنامہ جنگ مورخہ ۲۲/۱۲/۱۹۸۱ء [۴] روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۸/۱۲/۱۹۸۱ء [۵] ۶:۱۴۱و ۷:۳۱ القرآن [۶] ۲۵ : ۶۷ القرآن [۷] روزنامہ نوائے وقت ۱۴/۷/۱۹۸۱ء

ومحبت کی روایات خواب وخیال، جھوٹ اور منافقت کی گرم بازاری، رشوت ستانی، حلال و حرام سے بے نیازی ـــ آخر ہم غور کیوں نہیں کرتے ؟ ہمارے دلوں، دماغوں پر قفل کیوں پڑگئے ہیں ؟[8] اخلاق باختگی کے ذریعہ سے اجتماعی خودکشی کا یہ عمل کیوں جاری ہے ؟ کب تک جاری رہے گا ؟ اس تباہ کُن سیلاب کے سامنے بند باندھنے کے لیئے کوئی منظم تحریک کیوں نہیں اٹھتی ؟

شاید میں نے تصویر کے تاریک رُخ پر زیادہ زور دیا ہو مگر مجھے اس میں سرِمُو شبُہ نہیں کہ ہمارے قومی وانفرادی اخلاق کی گرتی دیوار کو سہارا دینے کے لئے ہمیں اخلاق محمدی کی دعوت کو اسی عزم کے ساتھ عام کرنا ہوگا، اسی استقلال، اسی صبرو استقامت کے ساتھ چلنا ہوگا جس کی روشن مثال ہمیں صرف اسی انسان کاملؐ کے اسوہ کاملہ میں مل سکتی ہے۔ بلا شُبہ اس راہ میں بھاری مشکلات ہیں۔ ان کا حل تجدید عہد کے ساتھ وہ عزم وثبات چاہتا ہے جس کا نمونہ ہمیں نبی کریمؐ کی حیاتِ طیبہ کے ہر دور میں ملتا ہے۔ مکہ معظمہ میں اعلان نبوت فرماتے ہی آپ کو کن مسائل سے پالا نہیں پڑا، ہجرت کے بعد کیا کیا نازک مقام آئے۔ محمد مصطفےؐ کی سیرتِ طاہرہ عزم واستقلال کی ایک طویل داستان ہے۔ یہاں صرف چند اشارات ممکن ہیں جو یقیناً انسانی عزم و استقامت اور ہمت واستقلال کی تاریخ میں سنگ میل اور منارۂ انوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عبدالرحمٰن عزام اپنی مختصر مگر نہایت خوبصورت اور ایمان افروز کتاب "بطل الابطال" میں لکھتے ہیں:[9]

وَالنَّاسُ جَمِيعاً طُلَّابُ الْحَقِّ اَمْ يَجِبُ اَنْ يَكُوْنُوْا كَذٰلِكَ وَقَدْ ضَرَبَ لَهُمْ مُحَمَّدٌ نِ الْمَثَلَ الْاَعْلٰى ..... وَهُوَ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى لِلثَّبَاتِ عَلَى الْحَقِّ وَالدَّعْوَةِ اِلٰى اَنْ يَكُوْنَ النَّاسُ كَافَّةً لِلّٰهِ عَبِيْداً وَ فِيْمَا بَيْنَهُمْ اِخْوَاناً۔

ترجمہ: "سب انسان حق کے متلاشی ہیں یا کم ازکم، انہیں ایسا ہونا چاہیئے۔ ان سب کے لئے محمدؐ نے سب سے اعلیٰ سب سے ارفع مثال قائم فرمائی ... ہاں وہ مثل اعلیٰ ہیں، حق پر ثابت قدمی میں اور سب انسانوں کے نام اس دعوت میں کہ وہ اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جائیں"۔

---

[8] ۴۷ : ۲۴ (القرآن) [9] عبدالرحمٰن عزام، بطل الابطال، القاہرہ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء، ص ۱۸

۶۱۰ء میں عرب کے شہر مکہ میں اس دعوت کا آغاز بڑا جوکھم کا کام تھا۔ بقول کارلائل محمدؐ کا ورود تاریکیوں سے نور کا ظہور تھا۔ مگر جیسا کہ سر ولیم میوئر (SIR W. MUIR) نے اعتراف کیا ہے:

"اصلاح کی دعوت کبھی اتنی دشوار اور منزلِ مراد سے اتنی بعید نہ تھی جتنی محمدؐ کے ظہور کے وقت، بایں ہمہ اصلاح کا عمل کبھی ایسی خوبی سے تکمیل پذیر نہ ہوا تھا جیسا آپؐ کی وفات کے وقت ہو چکا تھا۔"

شاید اسی لیے ریورنڈ باسورتھ سمتھ (REV. BOSWORTH SMITH) نے شرح صدر کے ساتھ کہا: "محمدؐ بلا اختلاف مصلحین عالم میں سب سے عظیم تھے۔"

عزم و ثبات

آئیے دعوتِ حق میں عزم و ثبات کی اس لازوال داستان کے چند ابواب پر نظر ڈالتے ہیں۔

آپؐ کی ولادت قریش کے اس معزز خانوادہ میں ہوئی جس کا منصب بیت اللہ کی ولایت اور اصنام کی رعایت کی بنا پر عربوں کے پروہت کا سا تھا۔ تعظیم و تقدیس کی اس میراث کو خیر باد کہہ کر سرے سے اس نظام کے انہدام کا عزم جو اس میراث کا بنیادی ستون تھا، بڑے دل گردے کا کام تھا، کتنا بڑا امتحان تھا! موروثی شوکت و سطوت پر ضرب کاری لگانے کے لیے کیسے عظیم عزم کی ضرورت تھی! مگر محمد مکیؐ کے قدم ذرا بھی لڑکھڑائے؟ دعوت حق کی راہ میں یہ گراں قدر میراث کچھ بھی آڑے آئی؟ محمدؐ کے پائے ثبات نے کہیں بھی لغزش کھائی؟ یہ سنت ابراہیمؑ کا انقلابی احیاء تھا۔

تبلیغ حق کا دائرہ وسعت پذیر ہوا تو مخالفت کا طوفان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دنیوی پشت پناہی کا لحاظ کریں تو ابوطالب آپؐ کا سب سے بڑا سہارا تھے۔ رؤساءِ قریش ابوطالب کے پاس دو ٹوک بات کہنے کے لیے آئے۔ عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل سبھی تھے۔ ابوطالب اس نازک صورتِ حال کا احساس کر کے آنحضرتؐ سے مخاطب ہوئے: "جانِ عم! مجھ پر اتنا بار نہ ڈال جو میں اٹھا نہ سکوں۔" یہ آسرا بھی ٹوٹتے نظر آیا۔ پر کیا مجال جو قدم لڑکھڑائے ہوں۔ ناقابلِ شکست عزم کے ساتھ محمدؐ کے یہ الفاظ زبان سے نکلے اور جریدۂ عالم پر نقشِ دوام بن کر ثبت ہو گئے:

وَاللّٰہِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِی یَمِیْنِیْ وَالْقَمَرَ فِی یَسَارِیْ عَلٰی اَنْ اَتْرُکَ ھٰذَا الْاَمْرَ

لہ۔ عبدالرحمٰن عزام۔ البطل الابطال صہ۳

حَتّٰی یُظْہِرَہُ اللّٰہُ اَوْ اَھْلِکَ فِیْہِ مَا تَرَکْتُہٗ [11]

ترجمہ: "بخدا اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند
لاکر رکھ دیں کہ میں اس مہم کو چھوڑ دوں تو ہرگز نہیں چھوڑوں گا تا آنکہ
خدا اسے غالب کر دے یا میں خود اس راہ میں نثار ہو جاؤں۔"

حق کے ساتھ عشق کی کوئی حسین تر مثال نظر آئے گی ؟

دھمکیاں کارگر ہوتی دکھائی نہ دیں تو دامِ تحریص پھیلایا گیا قریش کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ آنحضرتؐ کے پاس آیا۔ ریاست، دولت، زواج ہر جال پھیلاتا گیا۔ عتبہ خاموش ہوا تو آپؐ نے فرمایا۔ ابوالولید کہہ چکے ؟ کہا ہاں! فرمایا میری بھی سنو! پھر سورہ حٰم السجدہ کی آیات تلاوت فرمائیں، عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، سردارانِ قریش سے کہا: میری مانو تو اس شخص کو تنہا چھوڑ دو۔ میں نے جو کلام اس سے سنا اس کی عجب شان ہوگی۔ اگر عرب غالب آگئے تو تمہارا مطلب پورا ہوا اور اگر وہ غالب آیا تو اس کا ملک تمہارا ملک ہوگا۔ قریش پکار اٹھے۔ بس عتبہ پر بھی جادو چل گیا [12] کامل عیاری کے ساتھ قریش نے یہ لالچ بھی دیا کہ ایک سال تم لات و عزیٰ کی عبادت کرو، ایک سال ہم تمہارے خدا کی عبادت کریں گے۔ سورہ الکافرون کی دو ٹوک آیات اس کا جواب تھیں [13]

اب جسمانی ایذا کا حربہ آزمایا جاتا ہے۔ جیسے صداقت شعار مانتے تھے، اپنی امانتوں کا نگران بناتے تھے، اس کے لیے نت نئے ستم ایجاد کیے جاتے ہیں، آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں، آنکھوں میں دھول ڈالی جاتی ہے، پتھر مارے جاتے ہیں، عقبہ بن ابی معیط آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر یوں بل دیے جاتا ہے کہ آپؐ کا دم گھٹنے کے قریب ہے ابوبکر صدیقؓ موقعہ پر پہنچتے ہیں اور اس ناہنجار ستمگار سے آپؐ کی گلو خلاصی کراتے ہیں۔ خدا کا نبی حرم میں سربسجود ہے مشرکین کی ایک ٹولی طنز و تمسخر کا شور برپا کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک شقی اٹھتا ہے اور مذبوحہ اونٹ کا اوجھ غلاظت سمیت آپ کے اوپر ڈال دیتا ہے۔

آپؐ کے ساتھی بھی قریش کے مظالم سے محفوظ نہیں۔ ان میں سے وہ جو بے سہارا ہیں، مستضعفین ہیں ظالموں کا خصوصی تختۂ مشق۔ حضرت بلالؓ ہیں اور امیہ بن خلف کا جور و جفا

[11] شبلی: سیرت النبی ص ۲۲۰-۲۲۱ [12] ابن ہشام I: ۲۹۳ ابن سید الناس، عیون الاثر I: ۱۰۵ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ (تحقیق: مصطفیٰ عبدالواحد) الجزو الاول القاہرہ، مصطفیٰ بابی الحلبی ۱۳۸۴/۱۹۶۴ ص ۵۰۳-۵۰۵، شبلی سیرۃ النبی I ص ۲۲۲ [13] ابن سید الناس عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر I ص ۱۰۶۔

عرب کی دوپہر آفتاب نصف النہار پر بلالؓ کی ننگی پشت، کبھی آہنی زرہوں میں ملفوف ننگا جسم انگارے سی جھلستی ریت سینے کے اوپر بوجہل تپتے پتھر مگر سینے کے اندر حرارتِ ایمان۔ زبان پر احد احد۔ ابن کثیر کی روایت ہے کہ اس حال میں قریش ان مظلوموں سے جو چاہتے کہلواتے مگر بلالؓ کی زبان سے ہر حال میں احد احد ہی نکلتا رہا۔[۱۲]

بالآخر ابوبکر صدیقؓ نے انھیں ان کے ظالم آقا سے خرید کر آزاد کیا اُن کے ہاتھوں اس سلسلے کا یہ ساتواں کارِ خیر تھا۔

اس سے پہلے انہوں نے عامر بن فہیرہؓ (شہید بیرِ معونہ)، امِ عبیسؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ اور اُس کی بیٹی اور حضرت عمرؓ (جو اُس وقت ایمان نہیں لائے تھے) کی کنیز لبینہؓ کو اسی طرح اُن کے آقاؤں کے ستم سے نجات دلائی تھی[۱۳]۔ عبداللہ بن جدعان کے آزاد کردہ غلام صہیب بن سنانؓ، صفوان بن امیّہ کے غلام ابوفکیہہؓ، خباب بن الارتؓ جیسے بے آسرا لوگ، ظالموں کے ظلم کا بدترین تختۂ مشق تھے۔ خبابؓ کو دہکتے کوئلوں پر لٹایا گیا اور سینے پر ایک بدبخت پاؤں رکھ کر کھڑا ہوا کہ کروٹ نہ لے سکیں۔ مدتوں بعد یہ واقعہ خبابؓ نے حضرت عمرؓ کو سنایا تو پیٹھ کھول کر دکھائی جو برص کے داغ کی طرح بالکل سفید تھی[۱۴]۔ مگر آلِ یاسرؓ۔ اسلام کے اوّلین شہیدوں کے اس خاندان نے جو ستم سہے اُن کے سننے کو بھی حوصلہ چاہیے۔ جناب یاسرؓ۔ ان کی اہلیہ سمیّہؓ، اُن کے بیٹے عمارؓ بنو مخزوم کی غلامی میں ظلم کے یکساں شکار۔ حضورؐ کا گزر ہوا فرمایا: "صبراً یا آلِ یاسر۔ موعدکم الجنۃ"[۱۵] چشمِ فلک یہ بھی دیکھتی ہے کہ عمارؓ کے بائیں پاؤں میں رسّی سے ایک اونٹ بندھا ہے، دائیں پاؤں میں دوسری رسّی جو دوسرے اونٹ کے گلے سے بندھی ہے، عمارؓ کی پھٹی پھٹی آنکھیں ذہن میں ایک کربناک موت کا نقشہ مگر دل دریائے ایمان۔ دونوں اونٹ مخالف سمتوں میں ہانکے جاتے ہیں۔ ایک جسدِ طاہر دو لخت ہو جاتا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ سمیّہؓ کے قلب سے ابوجہل کا نیزہ پار ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے خالق و مالک کے دربار میں جا پہنچتی ہیں[۱۶]۔ مساکین تو مساکین عثمانؓ، ابوذرؓ، زبیر بن عوامؓ، سعید بن زیدؓ جیسے ذی حیثیت شرفا بھی اپنے مشرک اکابر کے ظلم سے محفوظ نہ تھے۔

وہ جو رحمۃ للعالمین بھی ہے، امت کے لیے مجسم رحمت و ایثار بھی۔ اس کے دل پر کیا نہ گزرتی ہوگی۔ آخر اپنے بے سہارا ساتھیوں کو حبشہ روانہ فرماتا ہے[۱۷] ہاں اُس صاحبِ عزیمت کی جلالتِ شان یہ ہے کہ جو دست و بازو ہیں انہیں دارالامان بھیج دیتا ہے اور خود اذیت کی

[۱۲]۔ ابن کثیر: السیرت النبویہ I: ۴۹۴ [۱۳] ابن ہشام: السیرۃ I، ۳۱۸ [۱۴] شبلی: سیرت النبی I ۲۲۹ (بحوالہ ابن سعد) [۱۵] ابن کثیر: سیرۃ I: ۴۹۵ [۱۶] ۵ عام النبوۃ

حقیقتوں اور موت کے امکانات کے سامنے سینہ سپر رہتا ہے۔

نبوت کے ساتویں سال کے آغاز کے ساتھ بنو ہاشم (باستثنائے ابولہب) شعبِ ابی طالب میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں[19]۔ قریش نے بنی ہاشم کے مقاطعہ کا عہد نامہ درِ کعبہ پر آویزاں کر دیا ہے۔ کامل تین سال شدتِ مصائب میں گزرتے ہیں، مگر درسِ لا اِلٰہ اِلّا اللہ دینے والا خطرات کے دریا سے گزر کر بیت اللہ میں حاضر ہوتا ہے اور بآوازِ بلند خدا کا پیغام بندوں کے نام تلاوت فرماتا ہے۔

اعلانِ نبوت کو دسواں سال ہے۔ ابوطالب رخصت ہوئے، پھر سیدہ خدیجہؓ نے بھی داعی اجل کی پکار پر عین منجدھار میں اس رفیق کی رفاقت توڑ دی جس کو کلی اڑھا اڑھا کر بارِ نبوت اٹھانے کی تشفیاں دی تھیں۔ عمِ نصیر بھی گیا، رفیقِ وزیر بھی رخصت ہوا۔ مصائب کی آندھیاں طوفان بن گئیں، پر پیغمبر ہے کہ اپنی دھن میں تن من دھن اسی طرح دعوتِ حق کے راستے میں لٹانے کو تیار۔ ام القریٰ کے دلوں کی کھیتی ہری ہوتی نہیں لگتی تو قبائل کا رُخ کرتا ہے۔ ستائش و صلہ سے تو خیر واسطہ ہی کیا، طعن و تشنیع، طنز و تمسخر کے تیروں کی بوچھاڑ خندہ پیشانی سے قبول کرنا، گالی کے بدلے دعائیں دینا، پتھر کھا کر لہو لہان ہو کر مارنے والوں کے لیے رحمتیں مانگتا چلا جاتا ہے۔ چاروں اور اندھیرا ہے پر اس واقفِ اسرارِ حقیقت کو ایک لحظہ کے عشرِ عشیر کے لیے بھی خفیف سا تردد، شبہ یا شک نہیں ہوتا۔ اسے یقین ہے کہ یہ بستی اور اس کے باسی ایک دن انوارِ حق سے ضرور منور ہوں گے۔ عام الحزن میں بھی محمدؐ کی آنکھیں فتح مبین پر لگی ہیں۔ نبی کریمؐ کے صدق و خلوص، اولوالعزمی اور ثبات و استقامت کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہوگی کہ مکہ کے تیرہ سالہ تبلیغی دور کا حاصل مشکل سے دو سو نفوسِ قدسیہ تھے، مگر سخت ترین آزمائش و مصیبت میں بھی آپؐ کا دل اپنے مشن کے بارے میں ہلکی سی مایوسی سے بھی آشنا نہ ہوا۔ اور ہاں آپؐ کے عزم و استقامت کا پرتو بھی تھا کہ ان نفوسِ قدسیہ میں سے بعض کی زبان پر کلمہ لا الٰہ ایک بار جاری ہوا کسی ایک نے بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والے مظالم سے گزر کر بھی کبھی پلٹنے کا نہ سوچا۔ حتیٰ کہ آپؐ کے ان اہل بیت نے جو بالاعلان اسلام بھی نہیں لائے سخت ترین مصائب کے اندر بھی کبھی آپؐ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہ اشارہ تک نہ کیا کہ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔

طائف

یوں تو آپؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی ابتلاء و امتحان کی ایک مسلسل داستان ہے، مگر سفرِ طائف

---

[19] ابن ہشام: السیرۃ ۱: ۳۵۰-۳۵۱، ۳۷۴-۳۷۷۔ شبلی: سیرۃ النبی I ۲۴۹

تو ایسے شدید جسمانی اور ذہنی و نفسیاتی صدمات پر منتج ہوا کہ چٹان سا عزم بھی ان کے سامنے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ ابو طالب اور خدیجہؓ کی شفقت و محبت سے محرومی کا داغ ابھی تازہ ہے۔ ابولہب کی زیر سیادت بنو ہاشم کا قبائلی تحفظ بھی اب ختم ہو چکا۔ قریش کی ایذا رسانیاں اور چیرہ دستیاں زوروں پر۔ دس سال کی پُر آشوب کشت کاری کے بعد مکّہ کی زمین اب خدا کے نبی کے لئے بنجر ہو چکی جس سے کوئی نیا گل بوٹا پھوٹتا دکھائی نہیں دیتا، سردارانِ ثقیف کے ایمان لانے کی امید کا چراغ آپؐ کو تن تنہا طائف میں لاتا ہے، مگر وہاں کے تینوں رؤساء، عمرو بن عمیر کے نخوت پسند بیٹے تمسخر و استہزاء کے ساتھ پیش آتے اور اپنے خدم و حشم کو آپؐ کی ایذا رسانی پر مامور کرتے ہیں۔ غلاموں، نادانوں کا یہ انبوہ چیختا چنگھاڑتا بدکلامی کرتا آپؐ کے تعاقب میں ہے۔ راستے کے دونوں طرف بھی اشرار قطار اندر قطار موجود رسول خداؐ کے ہر اٹھتے قدم کا استقبال پتھروں سے کرتے ہیں۔ لہو لہان پاؤں کے ساتھ آپؐ شہر سے باہر ایک باغ میں پناہ لیتے ہیں، مگر اس حال میں بھی خیر البشرؐ کی زبان سے دشمنوں کے لیے بددعا نکلتی، نہ اپنے مالک و مولا پر ایمان و یقین میں سرمو کوئی تزلزل واقع ہوا۔ نبیؐ کے ہاتھ اٹھتے ہیں اور یہ فریاد زبان پر جاری ہوتی ہے:

اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَاَنْتَ رَبِّيْ اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا اُبَالِيْ

ترجمہ: "بار الٰہا میں تجھ سے ہی اپنی طاقت کے ضعف کا دکھڑا کہتا ہوں، تیرے پاس ہی شکایت کرتا ہوں کہ لوگوں کے لیے میں کوئی چیز نہیں! ارحم الراحمین تو کمزوروں کا وارث، تو میرا بھی مالک و مولا ہے، تو مجھے کس کے حوالے کرے گا؟ ہاں اگر تو مجھ پر ناخوش نہیں تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں۔"

خدائے قدوس و کریم نے اپنے بندے کی پکار کو سنا اور فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (سورۃ الاحقاف ۴۶: ۳۵)

کئی سال بعد عائشہ صدیقہؓ نے آپؐ سے پوچھا کہ آپؐ پر کوئی دن معرکۂ اُحد سے سخت تر بھی آیا؟ آپؐ نے طائف کے واقعہ کا ذکر فرمایا۔ ۸ھ میں محمد مدنیؐ کا مکّہ میں فاتحانہ داخلہ اپنی مثال نہیں رکھتا مگر ۱۱ سال قبل طائف سے بے نیل و مرام واپسی پر بے یار و مددگار مطعم بن عدی کے جوار میں محمد مکّیؐ کا گھر پہنچنا بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس سے بڑھ کر آپؐ کی صداقت اور اپنے رب پر ناقابل شکست اعتماد کی دلیل کوئی نہیں کہ سفر طائف کے بعد بھی محمدؐ کا تبلیغی سفر جاری رہا۔

دشمنوں نے ایذارسانی کا ہر حربہ آزمایا، ابلاغ عامہ کے ماہرین کی طرح کذب وافترا اور تمسخر و استہزا کے ہنگامے میں آپؐ کے پیام کو اڑا دینے، دبا دینے کی کوشش بھی کی۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ○ (۴۱: ۲۶)

بے سہارا، مگر وفا کیش ساتھیوں پر ظلم توڑ کر بھی رحمتِ عالمؐ کے لیے شدید ذہنی و روحانی کرب کا سامان کیا۔ مگر آپؐ کے عزم و استقلال کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیے۔ ابوبکر صدیقؓ وہ مردِ جری جو مدینہ کے چاروں طرف منڈلاتے ہوئے خطرات کے باوجود اسامہ بن زید کے لشکر کو آقا کے حکم کی تعمیل میں شام روانہ کرنے سے نہ ہچکچایا، غارِ ثور کے دہانے پر کھڑی موت کے پاؤں دیکھ کر تشویش میں ڈوب گیا، مگر اس گھڑی محمدؐ کی آواز رفیقِ دمساز اور معلّمِ دلنواز تھی: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ! اُحد کے معرکہ نے مدینہ کے گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی تھی، مگر عزم و ہمت کا یہ پہاڑ اگلے روز ہی اپنے زخمی ساتھیوں کے ساتھ دشمنوں کے تعاقب میں تھا۔ معرکۂ حنین میں ہزاروں جاں نثار بنو ہوازن کے تیروں کی بارش میں سراپا انتشار تھے۔ ایسے میں صرف أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ ! کی آواز پر ہی ٹوٹی ہمتیں بندھ رہی تھیں۔

خاتمہ کلام :

میں نے اپنی گزارشات میں کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اس قصۂ پارینہ کی بازخوانی سے مدعا یہ ہے کہ محمد عربیؐ کی غلامی و حلقہ بگوشی پر فخر کرنے والوں میں جہاں بیسیوں سیاسی، ادبی اور پیشہ ورانہ تنظیمیں موجود ہیں وہاں ایک ایسی تحریک بھی اٹھنی چاہیئے جس کے علمبردار اور داعیان اپنے ہادی و مولا کے عزم کی چنگاری سے وہ شمع روشن کریں جو ہمارے معاشرے کے ہر شعبے میں اسوۂ محمدیؐ کا احیاء کرے اور ملتِ اسلامیہ کے اصل تشخص کو اس طرح زندہ کرے کہ لا الٰہ الا اللہ ہمارا شعار ہو۔ اسلام کی بنیادی عبادات کی پابندی ہماری پہچان ہو اور اخلاقِ محمدیؐ کی عاشقانہ تقلید ہمارا طرۂ امتیاز ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام بنیادی اسلامی عبادات کا مقصدِ اوّلین ہی یہی ہے کہ بندہ اپنی ہستی اور ہر شے کو اپنے خالق و مالک کے سامنے تسلیم کر دے۔ اسی بنیاد پر مکارمِ اخلاق کی محکم عمارت اٹھتی ہے، حقیقتِ صلوٰۃ کیا ہے إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (نماز کھلی بدکاری اور دہر) برائی سے روکتی ہے) حقیقتِ صوم کیا ہے ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ ہر شیطانی حربہ کے خلاف یہ مومن کی ڈھال ہے۔ حج کیا ہے ؟ اپنے رب کی طرف مکمل ہجرت۔ طواف کیا ہے ؟ انسان کے قدیم روایتی دعائیہ انداز میں ربِّ کعبہ پر سب کچھ نچھاور کر دینے کا اظہار و اقرار۔

ہم اللہ تعالیٰ کی اس رحمت و نعمت کا ضرور شکر کریں کہ اس نے ہمیں مسلمان پیدا فرمایا، مگر دل و دماغ کی گہرائیوں سے پوری سنجیدگی اور انتہائے خلوص کے ساتھ یہ اعتراف (CONFESSION) بھی کریں کہ ہمارا اسلام رسمی اور اس سے ہماری نسبت محض موروثی ہے، ہمیں ابھی مشکلات کا اللہ کی دہلیز پر قدم رکھنا ہے۔ ایمانی و روحانی معنی میں مشرف بہ اسلام ہونا ہے۔

انفرادی و ملی سطح پر اس عجز و انکسار اور اس عزم و استقلال کے ساتھ مساجد و مدارس، دفاتر و محاکم، اساتذہ و طلاب، سرمایہ و مزدور، تجارت و حرفت، مرد و زن، بچے، بوڑھے ہر سمت سے بنیادی عبادات کی پابندی اور آداب اخلاق پر لبیک کی دعوت بلند ہونی چاہیے۔ بنیادی عبادات اور پاکیزہ اخلاق سے ہی ملتِ اسلامیہ کا سچا تشخص ابھرتا ہے۔ اسی اسلحہ کے ساتھ ہی ہم نے چار دانگِ عالم میں انسانوں کے دل و دماغ تسخیر کیے تھے۔ اور اس کے بغیر کسی اور قوت کے بل پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ اس تحریک کے اجراء کی ذمہ داری ایک سے دوسرے کے شانوں پر ڈالنے سے ہم اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکیں گے۔ ملتِ اسلامیہ کا ہر فرد اس کا مکلف ہے اور افراد سے مل کر ہی قوم بنتی ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اس سلسلے میں نوجوانوں اور طلبہ و طالبات پر خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ قوم کے اندر یہی طبقہ حریتِ فکر اور قوتِ عمل کا سب سے بڑا مظہر ہوتا ہے اور اکثر بڑوں کی مصالح پسندی اور سودے بازی سے آزاد۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اخلاقِ محمدی کا علم سنبھالنے کے لئے سیاسی گروہ بندیوں کو خیر باد کہہ دیں۔ خود اخلاقِ محمدی کی تصویر بنیں اور معاشرے کے ہر چھوٹے بڑے ادنا و اعلا طبقہ میں موجود مادہ پرستی، زرگری اور اخلاق فروشی، بددیانتی و فرض ناشناسی کے خلاف جہاد کریں۔ تشدد، کبر و نخوت اور نیکی کے غرور کے ساتھ نہیں، بلکہ محمدیؐ رحمت و محبت اور شانِ فقر و انکسار کے ساتھ۔ اسوۂ محمدؐ کی تقلید ہی ہماری زندگی ہے۔

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

اخلاقی تعلیماتِ رسول اکرمؐ

جناب محترم پروفیسر اکرام الرحمٰن

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تاریخِ انسانی کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ آپ نے صحرائے عرب کی کلیتہً غیر مہذب اور غیر منظم قوم کو پرچم توحید کے سائے میں تہذیب و تمدن کا ایسا سبق دیا کہ وہ لوگ تبلیغ و تلقین کے سلسلے میں جہاں کہیں بھی گئے وہاں کی اجتماعی زندگی کے لیے ابرِ رحمت ثابت ہوئے۔ یہی نہیں کہ اُن کو نورِ ابدی کا صحیح راستہ دکھایا بلکہ اپنے بلند اخلاق اور اوصافِ حمیدہ سے لوگوں کے دل مسخر کر لیے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان رسولِ کریمؐ کی بعثت سے سو سال کے اندر ہی چین سے لے کر ہسپانیہ تک چھا گئے اور جہاں بھی پہنچے اُن کے ذاتی کردار، جذبۂ خلوص و ایثار سے متاثر ہو کر ملحدین حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ مملکتِ انڈونیشیا کے وسیع اور گھنے جنگلات، ملائشیا کے خوب صورت بحری ساحل، پاکستان کے زرخیز میدان، دریائے دجلہ و فرات کی سرسبز وادیاں، عرب کے نخلستان، دریائے نیل کا آبِ رواں، البرز کی برفانی چوٹیاں اب بھی عظمتِ اسلام کی گواہی دیتی ہیں۔

مسلمانوں کی عظمت، شان و شوکت، اسلامی ممالک کی موجودہ وسعت، ہمارے ان برگزیدہ اسلاف اور دین کے عظیم مبلّغین و مجاہدین کے مساعی کی مرہُونِ منّت ہے جنھوں نے حضور نبی کریمؐ کی اخلاقی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر نئے عزم اور ولولے کے ساتھ دین کی خدمت کے لیے اپنے وطن کو خیرباد کہا اور وطنِ غیر میں جا کر اسلام کی اشاعت میں اپنی عمریں نثار کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج دنیا میں تقریباً تمام ممالک میں اللہ کے نام لیوا موجود ہیں اور ایک اندازے کے مطابق اُن کی مجموعی آبادی ۹۰ کروڑ سے کم نہیں ہے۔ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں اخلاقی اقدار کو ہمیشہ بڑا دخل رہا ہے۔ قوموں نے اس کی بدولت ترقی کی اعلیٰ منزلوں کو پا لیا ہے اور جس قوم نے اپنے اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیا وہ تنزّلی کی جانب بڑھتی رہیں اور کچھ عرصے کے بعد معدوم ہو گئیں۔ صدیاں گزرنے کے بعد اگر ہم اپنے معاشرے پر طائرانہ نظر ڈالیں تو کیا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اسلامی ہے؟ کیا ہمارا معاشرہ ترقی کی طرف مائل ہے یا انحطاط پذیر؟ کیا ہم اپنے نبی کریمؐ کی اخلاقی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں یا فراموش کرتے جا رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے خود کے پیدا کیے

ہوتے مسائل میں اتنے اُلجھ گئے ہیں جہاں سے واپسی کا راستہ نہیں؟ ان تمام حالات کا تجزیہ کریں تو یہ صاف اور عیاں ہے کہ ہم نے وہ حاصل نہیں کیا جو ہمیں حاصل کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ ہم نے اپنے نبی کریمؐ کے اس آفاقی پیغام کو یکسر بُھلا دیا ہے جو ہمارے دین کا ستون ہے۔ یعنی حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات۔

اسلام نے دین کے عقائد نہایت سائینٹیفک، مدلل اور موثر طریقے سے پیش کرنے کے ساتھ اخلاق کا بھی ایک ایسا واضح تصور لوگوں کے سامنے رکھ دیا جس سے قرآن کے سُننے اور پڑھنے والے ہر شخص کو صاف صاف معلوم ہو گیا کہ اسلام کس قسم کے اخلاق پسند کرتا ہے۔ اور کس قسم کے ناپسند کرتا ہے۔ انسانیت کا کون سا نمونہ اُس کے نزدیک بُرا ہے جسے وہ بدلنا اور ختم کر دینا چاہتا ہے اور کون سا نمونہ اچھا ہے جسے وہ تیار کرنا، پروان چڑھانا اور فروغ دینا چاہتا ہے۔ بُرائی اُس کی نگاہ میں کیا ہے۔ اس کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ کیا شکلیں وہ انسانی زندگی میں اختیار کرتی ہیں اور کیا چیزیں اُسے نشوونما میں مُمد و معاون ہیں۔ اس کے برعکس بھلائی اُس کی نظر میں کیا ہے۔ کیا چیز اس کا سرچشمہ ہے اور کس طرح اس کے ظہور کی راہیں کھلتی ہیں اور کن شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اسلام کا مقصد بُرائی کے اسباب کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا اور بھلائی کی راہوں کو ہموار کرنا، انھیں زیادہ سے زیادہ کشادہ کرنا اور افراد سے لے کر معاشرہ تک ہر شعبۂ حیات میں برائیوں کی جگہ بھلائیوں کو قائم کر دینا ہے۔ یہ بیان اسلامی دعوت میں اتنا مفصل، اتنا صریح، اتنا دل نشین اور عقلِ عام کے لیے اس قدر قابلِ فہم تھا کہ جاہلیت کے معاشرے میں صدیوں سے جو لوگ اخلاقی پستیوں میں مبتلا تھے اُن کے لیے بھی یہ سمجھنا کچھ دشوار نہ تھا کہ واقعی انسانیت کا وہ نمونہ بدترین ہے جسے اسلام بُرا کہہ رہا ہے۔ اور وہی نمونہ بہترین ہے جس کے سانچے میں وہ افراد اور معاشرے کو ڈھالنا چاہتا ہے۔

اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے۔ "اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے ہموار کیا اور پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا، اور نامراد ہو گیا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔"

سورۂ والتین میں خدائے عزّ و جلّ فرماتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝

"کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اُلٹا پھیر کر ہم نے اسے سب نیچوں سے نیچ کر دیا، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے"

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فکر و فہم اور علم و عقل کی بلند پایہ قابلیتیں بخشی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشیں۔ مگر جب وہ ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے جسم و ذہن کو بُرائی کی طرف مائل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو ڈھیل دیتا ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو معاشرے کے اندر بہ کثرت مشاہدے میں آتی ہے کہ حرص، طمع، خود غرضی، نشے بازی، کمینہ پن، غیظ و غضب اور ایسی دوسری بُری خصلتوں میں سے جس خصلت میں بھی آدمی مستغرق ہوتا ہے اخلاقی حیثیت سے مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ قرآن نے واضح طور پر نفسِ انسانی کی تین الگ الگ قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک نفسِ امارہ، جو انسان کو بُرائی کی طرف اُکساتا ہے۔ دوسرا جو انسان کو بُرائی کے خیال، خواہش، ارادے اور فیصلے تک ہر مرحلے پر ٹوکتا ہے۔ اور اُس کا ارتکاب کر گزرنے کے بعد ملامت کرتا ہے۔ تیسرا وہ جو بُرائی کی راہ چھوڑ کر بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے اور دنیا میں سرخرو ہوتا ہے۔ اس قسم کے نفس کو قرآن نے خدا کا پسندیدہ نفس قرار دیا ہے۔

قرآن نے تاریخی واقعات کے پیرائے میں اخلاقی تعلیمات کو بیان کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اچھے اوصاف، اخلاق و اعمال کیا ہیں جن سے اسلام افراد اور معاشرے کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کی مدد کا حکم دیتا ہے اور بُرائی بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے اور وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق حاصل کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب نے عملاً یہ دکھا دیا کہ وہ بھلائیاں صرف زبان سے کہنے کی نہیں ہیں بلکہ اسلام نے جس زندگی میں بھی راہ پائی ہے وہ ان بھلائیوں سے آراستہ ہو گئی۔

صالح معاشرہ

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کا مقصود صرف صالح افراد تیار کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انھیں جوڑ کر ایک صالح معاشرہ بنانا بھی ہے، کیوں کہ نوعِ انسانی کی فلاح اس میں منحصر ہے۔ ایمان، حسنِ عدل، حق و صداقت، صبر و استقامت یہ چار صفات ہیں جن پر نوعِ انسانی کی فلاح کا دارومدار ہے۔ پہلا ایمان یعنی اس بات پر پورا یقین کہ صرف اللہ وحدہ لاشریک ہی خالق، مالک، رازق، حاجت روا، معبود اور حاکمِ مطلق ہے جس کی بندگی و اطاعت کرنی چاہیے اور اللہ کے رسولؐ کی لائی ہوئی ہدایت ہی برحق ہے جس کی پیروی ہمارے اوپر فرض ہے۔ موجودہ زندگی عارضی ہے اس کے بعد ایک دوسری مستقل اور پائیدار زندگی بھی آنے والی ہے جس میں ہم کو اپنے ان اعمال کا حساب دینا ہو گا جو ہم نے دنیا میں کیے ہیں۔ یہ ایمان فلاح پانے والے اور خسارے سے بچنے کے لیے شرطِ اوّل ہے، کیوں کہ اس کے علاوہ

دوسری ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو سیرت داخلاق اور کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہو جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہو۔

حسنِ ایمان کے ساتھ نیک اعمال خسارے سے بچنے کی دوسری لازمی شرط ہے۔ تیسری چیز حق گوئی معاشرے کو اخلاقی زوال اور انحطاط سے بچانے کی ضامن ہوتی ہے۔ آخر میں صبر ہے، یہ لفظ ضبط، تحمل، برداشت، ثابت قدمی، ارادے کی مضبوطی، ہمت اور جرأت کے ساتھ کسی باطل طاقت کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں اس لفظ کو اتنے وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی بن جاتی ہے۔

اخلاقی تعلیم وہ نسخۂ کیمیا تھا جس کا کوئی توڑ مشرکینِ قریش اور کفارِ عرب کے پاس نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف خواہ کیسی ہی الزام تراشیاں وہ کرتے تھے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی معقول آدمی یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ ایسی اعلا درجے کی اخلاقی تعلیم کوئی خود غرض یا مجنون یا ساحر یا کاہن دے سکتا ہے۔ دنیا میں بہت سے انبیاء کرام داعیان اور مصلحین تشریف لاتے۔ تقریباً سب نے اخلاقیات کا درس دیا، لیکن یہ دیکھنا ہے کہ انھوں نے اخلاقی واعظوں کا خود کیا عملی نمونہ پیش کیا، لیکن اس کے برعکس مکّہ کا معلّم "اُمّی" پکار کر کہتا تھا۔

"جو نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو"

نمونۂ عمل

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا۔ انسانوں کے مجمع عام میں جو کچھ کہتا تھا گھر کے خلوت کدے میں اُسی طرح نظر آتا تھا۔ اخلاق و عمل کا وہ نکتہ جو دوسروں کو سکھاتا تھا وہ خود اُس کا عملی پیکر بن جاتا ہے۔

چند صحابہ نے آکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے درخواست کی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بیان کیجیے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ پھر آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق ہمہ تن قرآن ہے"۔ قرآن الفاظ ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اُس کی عملی تفسیر۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے فرمایا: "بے شک تمھارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے"۔

امہات المومنین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کیے۔ فرماتی ہیں:

"کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو بُرا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ بُرائی کے بدلے بُرائی نہیں

کرتے تھے بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے۔" آپؐ نے کبھی کسی سے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ آپؐ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ آپ نے کسی کی کوئی درخواست رد نہیں کی۔

حضرت علیؓ جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے آغازِ نبوت سے آخر عمر تک ۲۳ برس آپ کی خدمتِ اقدس میں موجود رہے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام حسنؓ نے اُن سے حضورؐ کے اخلاق و عادات کے متعلق سوال کیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا آپؐ خندہ جبیں، نرم خو، مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج نہ تھے۔ بات بات پر شور نہیں کرتے تھے۔ کوئی بُرا حکم مُنہ سے نہیں نکالتے تھے۔ عیب جو اور تنگ دل نہ تھے۔ ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چُپ سُنا کرتے۔ دوسروں کے مُنہ سے اپنی تعریف سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ نہایت فیّاض نہایت راست گو، نہایت نرم طبع، نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی دفعتاً آپؐ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔

حضرت ہند بن ابی ہالہ جو گویا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش کے پروردہ تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہارِ شکر فرماتے تھے۔ کسی چیز کو بُرا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے اور اُس کو بُرا بھلا نہ کہتے۔ کوئی اگر کسی امرِ حق کی مخالفت کرتا تو آپؐ کو غصہ آجاتا اور حق کی پُوری حمایت کرتے، لیکن اپنے ذاتی معاملے پر کبھی آپ کو غصہ نہیں آتا تھا اور نہ کسی سے انتقام لیا کرتے تھے۔ آپؐ کے تمام اخلاق و اعمال پختہ و مستحکم تھے۔ کبھی تمام عمر اُن میں ایک ذرّہ فرق نہیں پیدا ہوا۔ عدل و انصاف سے کام لیتے تھے۔ اکثر یہ معمول تھا کہ گھر میں نقدی چیز موجود ہوتی تو جب تک کُل خیرات نہ کر دی جاتی گھر میں آرام نہ فرماتے۔ آپؐ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے نمایاں تھا اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپؐ کو بے انتہا محبت تھی۔ آپؐ میں قناعت اور مہمان نوازی حد درجہ تک تھی۔ دوست و احباب سے تحفے قبول فرما لیتے تھے بلکہ آپؐ نے اُس کو محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے۔ کبھی کسی کا احسان گوارہ نہ فرماتے۔ عدمِ تشدّد آپؐ کا وظیرۂ خاص تھا۔ قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے۔ مدّاحی اور تعریف کو بھی ناپسند فرماتے تھے۔ ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسندِ خاطر تھی، تواضع اور خاکساری کی راہ سے اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے۔ آپ کی نظر میں امیر و غریب، صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے۔ گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے۔ گھر میں خود جھاڑو دیتے، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھتے اور اُن کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا۔ شرم و حیا کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دوسروں کے کام کر دینے میں خوشی محسوس کرتے۔ ابتدا سے

انتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم و استقلال کا مظہر ہے۔ آپؐ شجاعت کے پیکر تھے۔ سیکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے، لیکن پامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی۔ راست گفتاری، ایفائے عہد، زہد و قناعت، عفو و حلم جیسی صفاتِ حسنہ کے آپ پیکر تھے۔

غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ دشمنوں کے حق میں بھی دُعائے خیر کرتے تھے۔ بچوں اور غلاموں پر نہایت شفقت فرماتے تھے اور حیوانات پر بھی رحم فرماتے تھے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئی تھی۔ آپؐ نہایت رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ بیماروں کی عیادت میں دوست و دشمن، مومن و کافر کسی کی تفریق نہ تھی۔ بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ظرافت کی باتیں بھی فرماتے تھے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کے طریقوں پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے۔ حقوق و فرائض، فضائلِ اخلاق اور آداب کے سلسلے میں آں حضرتؐ کی جامع تعلیمات موجود ہیں۔ جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا یہاں ممکن نہیں ہے، لیکن یہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس تھی کہ ان تمام اخلاقی تعلیمات پر جو انھوں نے دیں، خود عمل کر کے دکھایا۔ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل اور اس کے تہذیب و تمدن کے اصول کتنے اعلا اور اس کے اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے اعلا و ارفع ہیں۔ اور یہ سب کچھ نبی ''اُمّی'' علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے ادا ہوا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ اور قوموں کے معلّم پہنچنے سے قاصر رہے، معلّم ''اُمّی'' صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔ اور اُس قوم کو جو تہذیب و تمدن سے نا آشنا، اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ اور سلیقہ و شعور سے قطعی نا آشنا تھی اُسے نہ صرف اخلاق و تمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم و تربیت سے مستقبل میں ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دُنیا اُن کے اخلاقی جلووں کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ پیش گوئی پوری ہوئی جو ابراہیمی نسل کے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے لیے کی گئی تھی۔ یعنی ایسا نبیؐ جو اُن اُمّیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک و صاف کر کے نکھارے۔ یہ نکھارنے والا آیا اور

نکھار کر دُنیا کو پُر بہار بنا گیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم"۔

ہمیں فخر ہے کہ ہم اس پیکرِ اخلاق پیغمبرِ آخر الزماں سرورِ کونین آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہیں جس کی اخلاقی تعلیمات کا چشمہ فیض ہر خاص وعام، ہر دور اور ہر خطے کے لیے ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات پر نہ صرف خود عمل کریں بلکہ تحریکِ آدابِ اخلاق کو پاکستان کے چپے چپے میں پھیلائیں تاکہ ہمارا معاشرہ حقیقی معنوں میں اسلامی معاشرہ بن جائے جو مسلمانوں میں ایثار، اخوت، یگانگت اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے کا ضامن ہو اور یہ امر پاکستان کی سالمیت وبقا اور عظمت کے لیے ضروری ہے۔

محکومی اور آزادی

جناب محترم جسٹس (ریٹائرڈ) قدیرالدین احمد

امت محمدی کے لئے سیرتِ اقدس کا ایک حیرت انگیز رخ

ابتدائیہ

مندرجہ بالا عنوان کو منتخب کرنے کا محرک ایک تو یہ احساس ہوا کہ محکومی سے اور عقیدت سے جو دو قسم کی تابعداریاں پیدا ہوتی ہیں ان کے فرق کو بیان کیا جائے، تاکہ گہری عقیدت اور محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو خدمات انجام دی جاتی ہیں ان میں اور کسی حاکم کے حکم کو بجا لانے میں جو زحمت اٹھانی پڑتی ہے اس میں جو تضاد ہے اس طرف اشارہ کیا جا سکے۔ دوسرا محرک آج کل کا یہ عام تاثر ہے کہ جتنا زیادہ نفاذِ اسلام کا چرچا ہوگا۔ اتنی ہی کثرت سے پابندیاں بڑھیں گی اور احکام جاری ہوا کریں گے یہاں تک کہ معاشرہ ان میں جکڑ کر رہ جائے گا اور جو تھوڑی بہت خود اعتمادی باقی ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ نیز روایات کے مقابلے میں عقل اور سمجھ کا استعمال باعثِ قہر بن جائے گا۔

اس کے برعکس ہمارا دعوا یہ ہے کہ اگر ایسا ہوا تو وہ اسلام کا صحیح نقشہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اسلام انسان کو ہر طرح کی غلامی سے چھڑانے کے لیے آیا ہے۔ اس نے ہماری طرح طرح کی قیود کی زنجیروں کو توڑا ہے۔ وحدانیت کا سبق سکھا کر سینکڑوں بتوں، دسیوں اجرامِ فلکی اور بیسیوں جانوروں کی عبادت سے آزادی دلائی ہے۔ قوانین فطرت کے وجود کو اچھی طرح بتا کر توہمات کی جڑیں کاٹی ہیں۔ غیب کے علم کو فقط اللہ کا علم بتا کر نجومیوں اور پیشین گوئی کرنے والوں سے نجات بخشی ہے۔ قسم قسم کے بے معنی اور نقصان دہ رسم و رواج کی پابندی کو غیر ضروری ظاہر کر کے ان سے پیچھا چھڑایا ہے۔ باپ دادا کے ان طور طریق سے جو انہوں نے بلا علم اور دلیل اختیار کیے تھے، ہم کو محفوظ کر دیا ہے۔ ظالم حکام کی بے حد بداعتدالیوں کے آگے سر جھکانے کو ایمان کی کمزوری قرار دیا ہے۔ ایسے ایسے خود سر علما اور فضلا کی حکومت سے انسان کی گردن چھڑائی ہے۔ جیسے قدیم وقت کے یہودیوں کے دینی پیشوا ہوا کرتے تھے۔ ایسی تعلیم کی یہ برکت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی امت کی تعمیر کر دی جس میں خود اعتمادی کا بدرجۂ اتم

موجود تھی اور جو علم اور عقل کی قدر و قیمت کو دنیا کی ساری قوموں سے زیادہ جانتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آنحضرتؐ کا زمانہ ایسی تاریخ پیش کرتے ہیں جو جسمانی آزادی سے لے کر ذہنی آزادی تک کی ایک مثالی تاریخ ہے۔ ان مختصر سی سطور میں اس تاریخ کے اسی رُخ کا ایک سرسری سا عکس پیش کرنے کی خواہش ہے۔ واقعات تو نئے نہیں ہو سکتے لیکن تاریخ کے بہت سے رُخ ہو سکتے ہیں۔

غلاموں کی شہنشاہی

مثلاً ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ قرآن اور سنتِ رسول اللہؐ نے غلامی کی زندگی کو آزادی سے زیادہ شیریں بنا دیا تھا۔ دیا نتدار غیر مسلموں کے لیے یہ دیکھنا آسان تھا کہ جب اسلام آیا تو اس نے کس طرح غلاموں کو آقاؤں کے ہم پلّہ کر دیا بلکہ سارے کم درجہ کے افتخارات کو مٹا کر نیک اور پاک زندگی کو دینی اور دنیاوی مراتب کی بنیاد بنا دیا۔ غلاموں کے ساتھ بدسلوکی کو خدائے لایزال کی ناخوشی کا باعث بنا دیا۔ ہوتے ہوتے غلام اور ان کے خاندان دنیائے اسلام میں بڑے بڑے سلاطین اور شہنشاہ بنے جس کو دیکھ کر تاریخ عالم اپنی آنکھیں ملتی رہ گئی۔

شعب ابی طالب

یہ تو ایک ایسا رُخ تھا جس کو دُور سے بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ مگر چند اور بھی رُخ ہیں جن کو حلقہ بگوشانِ اسلام اور فدایانِ محمد عربیؐ نے اپنے دلوں کی گہرائیوں میں محسوس کیا اور اپنی مرضی سے اختیار کی ہوئی جاں نثاریوں کو اپنی زندگیوں کے لیے فخر کا سرمایہ سمجھا۔ تاریخ اسلام کے وہ تین سال جن میں سارے مسلمان ایک وادی میں قید ہو کر رہ گئے تھے اکثر مورخین کی آنکھوں سے اس طرح اوجھل ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ تین لمحے تھے۔ مگر شعب ابی طالب جس میں خدائے واحد کے نام لینے والوں کو طویل مدت کی قید ہوئی تھی۔ اس کو ایک کھلا ہوا سا ہٹلر کے بنائے ہوئے کیمپوں کی قسم کا ایک کیمپ سمجھنا چاہیے۔ اس میں کل مسلمان جو ایک مٹھی بھر انسان تھے قید تھے وہ قید ہٹلر کی قید سے زیادہ سخت اس وجہ سے تھی کہ وہاں بجائے کسی کی کھلانے پلانے کی ذمہ داری کے دشمنوں کا مقصد بھوکا پیاسا مارنا تھا۔ بچے بھوک سے بلکتے تھے اور ماؤں کے دودھ خشک ہو گئے تھے۔ وہ قیدی پتے کھاتے تھے اور جوتوں کے چمڑے کو پانی میں ابال کر نگلنے پر بھی مجبور ہو گئے تھے۔ رہائی کی واحد شرط یہ تھی کہ اپنے محبوب رہبر محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاں نثاری کو ترک کر کے انہیں دشمنوں کے حوالے کر دیا جائے۔

اس شرط کو پورا کرنے کی ان قیدیوں کو آزادی تھی۔ وہ محکوم بس اپنی ہی عقیدت اور محبت کے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اس مصیبت کو جسے انھوں نے چھتیس مہینے یا ایک ہزار دن جھیلا ایک آن میں ٹال دیتے۔ بات بس اتنی تھی کہ اپنی ہی مرضی کی عقیدت مندانہ محکومی کے دائرے سے دو قدم باہر نکل جاتے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ محکومی جسموں کی نہیں بلکہ دلوں کی تھی۔ دل محکوم تھے، گو جسم آزاد تھے یہ مثال ساری امت کے بیک وقت مشترکہ احساس محکومی اور آزادی کی ہے۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ کر کثیر ہو گئی تو پھر ایسی مثال کا ظہور نہیں ہو سکتا تھا۔

زید بن حارثہؓ

لیکن اس وقت اس سے پہلے اور اس کے بعد صدہا مثالیں شخصی محکومی اور آزادی کی ایسی ملتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کیا غلامی کی مجبوریاں عشق و محبت کی مجبوری کے آگے ایک کھیل ہوتی ہیں۔ کھیل اس طرح کہ جب انسان مجبور ہو تو اسے ہر ایک مصیبت کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے اور وہ کسی دن آزاد ہو جانے کی امید بھی کر سکتا ہے۔ مگر جب اسے اختیار ہو کہ اپنی مرضی سے آزاد ہو جائے لیکن وہ پھر بھی غلامی ہی کو ترجیح دے تو اس آزاد محکومی سے رہائی نہیں مل سکتی۔ حضرت زید بن حارثہؓ کا قصہ سنیے کہ ان کے ماں باپ جس قافلے میں تھے وہ لٹ گیا۔ اس وقت بچے تھے، ان کو لوٹنے والوں نے لے جا کر فروخت کر دیا۔ خریدار سے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے خریدا پھر اپنی تجارت کے ایجنٹ محمد بن عبداللہؐ کو بطور تحفہ دے دیا۔ اس غلام کے والد فراق میں سرگرداں پھرتے رہے اور رو رو کر ان کا دل آب ہوتا رہا۔ آخر کار ایک مدت کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا غلامی میں ہے۔ چنانچہ وہ اس کے آقا کے پاس پہنچے اور محبت پدری کا واسطہ دیکر بیٹے کی رفاقت طلب کی۔ اس زمانے میں کوئی اپنا غلام کب کسی کو مفت میں دیتا تھا۔ غلام کا باپ ہونا کوئی نئی بات نہ تھی۔ ان حالات میں یہ درخواست بے معنی تھی۔ مگر رسولِ خداؐ نے ایک باپ کی خواہش کو قبول فرمایا۔ البتہ شرط یہ لگائی کہ زید کے ساتھ زبردستی نہیں ہو گی بلکہ جو ان کی خواہش ہو گی وہی کیا جائے گا۔ باپ کو امید ہوئی ہو گی کہ بیٹے کی غلامی کا وقت ختم ہوا اور اب وہ باپ کی شفقت سے فیضیاب ہو گا۔ انہیں شاید معلوم نہیں تھا کہ ان کے بیٹے کی محکومی اس کی آزادی سے زیادہ لطیف اور پُر بہار ہے۔ وہ حضور رسالت مآبؐ کی قربت کو کب ترک کرنے والا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے آقا کا فراق اس کے لیے قابل برداشت نہیں ہے اور زبانِ حال سے جتا دیا کہ:

صد جان فدایت کہ دہم دامنت از دست
دشوار بدست آمد و آساں نہ فروشم

باپ جب خالی ہاتھ لوٹے ہوں گے تو رسول اللہؐ کی غلامی سے شفقتِ پدری کا مقابلہ کرکے دل میں یا تو نادم اور یا بہت ہی خوش ہوئے ہوں گے۔

چار جاں نثار

یہ واقعہ تو ایک فرد کے آزادی کو قبول کرنے سے انکار کا تھا۔ انھوں نے اپنے باپ کے آغوش کی آزادی کو رسول خداؐ کی غلامی پہ قربان کر دیا۔ اب ایک دو واقعات اِک ایسی جاں نثاری کے ملاحظہ کیجیئے کہ جن کی غایت سوائے نبیؐ اسلام کی ذات اور ان کے دین پر قربان ہو جانے کے اور کچھ نہ تھی۔ وہ محکومی ایمان کی اور عشق رسولؐ کی تھی جس میں کسی قسم کی دنیاوی پابندی کا نام تک نہ تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ لائیے جب جنگ اُحد میں گھمسان کا رن تھا۔ افواہ پھیل گئی تھی کہ محبوب خداؐ شہید ہوگیے۔ نتیجہ میں ہر طرف سراسیمگی چھا گئی تھی اور بے ترتیبی بپا ہو گئی تھی۔ جو جہاں تھا وہیں ششدر رہ گیا تھا، مگر تھوڑی دیر میں کسی نے آنحضرتؐ کو پہچان کر آواز دی کہ وہ حیات ہیں۔ اس خبر سے جہاں مسلمانوں کے دل بڑھے وہاں قریش نے بھی ان کو دیکھ کر انھی پہ ہلّہ بول دیا اور ہر طرف سے ایک ہی مرکز پہ وار ہونے لگے۔ یہ دھاوا اسقدر شدید تھا کہ شمع نبوتؐ کے گُل ہو جانے کا خطرہ نظر آرہا تھا۔ اس وقت آنحضرتؐ نے مناسب سمجھا کہ مسلمانوں کو عین اُس مقام سے مطلع کریں جہاں آپ کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی طرف جانا ہی جان دینے کے برابر تھا۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے للکار کر فرمایا:

"کون مجھ پہ جان دیتا ہے!"

یہ سُن کر زیاد بن سکنؓ پانچ انصار لے کر جاں نثاری کے لیے بڑھے اُن میں سے ایک ایک نے دادِ شجاعت دیکر جان فدا کر دی۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں:

> "حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرتؐ نے (اسی کیفیت میں) حکم دیا کہ ان کا لاشہ (میرے) قریب لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے (اس وقت ان میں) کچھ کچھ جان باقی تھی۔ (انہوں نے حضورؐ کے) قدموں پہ (اپنا) منہ رکھدیا اور اسی حالت میں جان دی۔"

بچہ نازرفتہ باشد زجہاں نیاز مندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

پروانۂ شمع

جنگ ختم ہو گئی آنحضرت مجروح ہوئے مگر حیات تھے لیکن مدینہ میں ان کے وصال کی خبریں پھیل گئی تھیں اس لیے مدینہ والے بیتاب تھے کہ آنحضرتؐ کی خیریت معلوم ہو جائے۔ انصار میں ایک خاتون تھیں جن کا نام عفیفہ تھا۔ ان کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں شہید ہو گئے تھے وہ بھی حضورؐ کی خیریت معلوم کرنے شہر سے باہر آئی تھیں۔ لوگ باری باری ان کے ایک ایک رشتہ دار کی موت کا حال سناتے تھے مگر وہ ہر خبر کے بعد پوچھتی تھیں کہ رسول اللہؐ کیسے ہیں لوگ کہتے کہ وہ بخیر ہیں۔ یہ سُن کر شکر ادا کرتیں۔ لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھتی جاتیں۔ بالآخر اپنی آنکھوں سے چہرۂ مبارک دیکھا تو بے اختیار پکار اٹھیں:

"تو ہے تو سب مصیبتیں ہیچ ہیں"

یہ حال سننے والے بتائیں کہ یہ محکومی تھی یا آزادی؟ میں کہوں گا کہ ہاں یہ آزادی تھی، جسم کی، جان کی، وسعتِ دنیا میں اپنے ارادوں کی۔ مگر محکومی تھی دل کی، شعور کی، ایمان کی، ضمیر کی اور عشقِ پاک کی۔ جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ:

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

مدبرانِ عالم کے محبوب

ایک خاتون پر ہی کیا منحصر ہے۔ جو بھی مسلمان تھا وہ آنحضرتؐ کے نور کا پروانہ تھا۔ ہر مرد اور عورت کا دل چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تعظیم کرے۔ اور احکام بجا لائے۔ بڑے بڑے رتبے والے بلکہ مدبرانِ عالم میں شمار ہونے والے بزرگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا جب ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ اپنا زیادہ سے زیادہ مال و متاع ان کے قدموں پر نثار کرنے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں بس انہی کے دلوں کو یہ راز معلوم تھا کہ وہ اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر بھانپنے والے ایسے رازوں سے کب بے خبر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مال حاضر کرنے میں جو ان صاحبان میں محبت کی کشمکش ہوئی وہ اسقدر مشہور ہے کہ اقبال نے اس کو نہایت سلیقہ اور پُراثر انداز میں نظم کیا ہے۔

عملِ صالح سے دل لگاؤ اور بادۂ محبت وعقیدت کی سرشاری کا جو نقشہ شاعر نے سادہ الفاظ میں کھینچا ہے وہ کلامِ عارفانہ کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ نظم شروع ہی اس طرح کرتے ہیں کہ :

اک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا　　دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اٹھے　　اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور　　بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار

جب وہ مال پیش کر چکے تو مقدار کو دیکھ کر حضور سرورِ عالمؐ نے پوچھا کہ اپنے اہل وعیال کے لیے بھی کچھ رکھا ہے :

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار
اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا　　جس سے بنائے عشق ومحبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت　　ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار

جب سرورِ کائناتؐ نے ان سے دریافت کیا کہ گھر میں بھی کچھ چھوڑا ہے تو جواب دیا کہ :

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

یہ ہے وہ محکومی جس کی لطافت صحراؤں کی آزاد ہواؤں سے زیادہ لطیف اور خوشبو کی پھیلنے والی لپٹوں سے زیادہ معطر کرنے والی ہے۔ اس دردمندانہ محکومی کے آگے بے مقصد آزادی کا غرور کیا چیز ہے۔ اس پھیکی آزادی سے کوئی پوچھے کہ :

بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری
تب وتابِ ماشناسی دلِ بے قرار داری

امت مسلمہ کے دل کی امنگ

حکم برداری کے طور پر اور محبت کی تسکین کے واسطے جان نثار کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ سب سے بڑا حاکم وہ ہے جو آرزوؤں پر حکومت کرے اور دلوں کا مالک بن جائے جو عزت اور تعظیم اور دلداری اس کی ہوتی ہے وہ بڑے سے بڑے حاکم یا ظالم شہنشاہ کی بھی نہیں ہو سکتی۔ رسولِ خداؐ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے اصحاب کے ساتھ بلا لحاظِ مرتبہ نباہ کرتے تھے۔ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ آپؐ کے ساتھی تعظیم کے لیے کھڑے ہوا کریں۔ ہمیشہ نیچی آواز اور نرم لہجے میں خطاب فرماتے تھے۔

بے ادبی کو خندہ پیشانی سے معاف کر دیا کرتے تھے۔ مگر جتنے مسلمان تھے وہ اُن کے حکم کے پروانے تھے۔ جن لوگوں نے سلاطین اور شہنشاہوں کے دربار دیکھے تھے وہ وہاں خوف کی اور یہاں محبت کی حکمرانی کے فرق کو جانچ لیتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ معاہدۂ حدیبیہ سے پہلے جب مسلمان کمزور تھے اور صلح کی پیشکش کی گئی تھی تو قریش کا سفیر عروہ بن مسعود ثقفی حالات دیکھنے کے لیے آیا اور رسول اللہؐ سے گفتگو کرنے کے بعد واپس جا کر رپورٹ دی۔ اس میں مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا اور اُن کے قائد کے متعلق بھی رائے زنی کی اس نے جو کیفیت بیان کی وہ مولانا شبلی کی زبانی سنیے وہ فرماتے ہیں:

"عروہ نے رسول اللہؐ کے ساتھ صحابہؓ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے اُس کے دل پر عجیب اثر کیا۔ قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، مگر یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی۔ محمدؐ بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوئی شخص اُن کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو جو پانی گرتا ہے اُس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور وہ اپنے مونہہ کا لعاب تھوکتے ہیں تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لے کر چہروں اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ عروہ جس کا کام عظیم الشان درباروں میں سفارت کرنا تھا، اُن درباروں میں یہ منظر کیونکر دیکھتا! وہاں تو کرّوفر تھے۔ ہتھیاروں سے لدے ہوئے اور چاق چوبند سپاہی تھے جو آناً فاناً میں ہر بے ادب کو سزا دینے کے لیے مستعد رہتے تھے۔ اُس کے مقابلے میں یہاں کا دربار سادہ اور یہاں کے درباری ادب بلکہ تہذیب و تعظیم کے دائرے سے آگے بڑھ کر عقیدت مندی کی قدم بوسی کو اپنی عزت اور اپنے لیے راحت سمجھتے تھے۔ یہ وہ محکومی تھی جس کا قصیدہ اگر خود آزادی لکھے تو بعید نہیں۔

رائے پر اعتراض کی اجازت

اس محکومی، عقیدت مندی اور وارفتگی کی ایک خاص صفت اور بھی تھی جس کو اس بے مثل قائد کی تعلیم و تربیت کی بلند خیالی اور اعلیٰ ہمتی کا معجزہ کہنا چاہیے۔ وہ صفت یہ تھی کہ یہ وارفتگانِ محبت اور عقیدت، اپنی جان، اپنا مال، اپنا دل اور اپنا ایمان تو اپنے قائد اور اس قائد کے مالک کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے۔ مگر نہ اس رسولؐ نے اور نہ اس کے اللہ نے ان کی عقلوں کو خرید لیا تھا۔ خدائے قدوس نے بار بار عقل استعمال کرنے اور علم حاصل کرنے کی تاکید اُسی رسولؐ کے ذریعہ سے اپنے کلام پاک میں کی ہے۔ سوچنے، سمجھنے، اپنے کان اور اپنی آنکھوں کو استعمال کرنے کی اس قدر سخت تاکید کی ہے کہ اس سے زیادہ شدت ممکن نہیں ہے۔ سورۂ اعراف (نمبر ۷) آیت نمبر ۱۷۹ میں ارشاد

ہے کہ :

اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں۔
اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں۔
اُن کے پاس کان ہیں مگر وہ اُن سے سنتے نہیں۔
وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے۔
یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھو گئے ہیں۔

میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی اور دینی یا دنیوی قائد نے ہوش و حواس اور عقل کو استعمال کرنے کی ایسی حتمی تاکید کی ہو۔ اس تعلیم و تلقین کا اثر یہ تھا کہ پیغمبر خدا نے جہاں احکامِ خدا کی اطاعت سکھائی وہاں مسلمانوں میں یہ جرأت بھی پیدا کی کہ جب محمدؐ بطور ایک بندۂ خدا کے کسی دنیاوی معاملے میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں تو مسلمان بھی بطور بندگانِ خدا کے اس سے اختلاف کر سکیں۔ ایسے متعدد مواقع پر صحابہؓ نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے قبول بھی فرمایا ہے۔ اس بیان کی وضاحت طویل ہو سکتی ہے مگر اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جسے آپ صاحبان ضرور پہلے سے جانتے ہوں گے۔ مگر واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے اس کا اعادہ بے جا نہ ہوگا۔

ہوا یہ کہ جنگ خندق جاری تھی اور مسلمان ایک ماہ سے محاصرے میں تھے۔ کھانے پینے کے سامان اور ہر قسم کی ضروریات پر دشمنوں نے کڑی پابندی لگا دی تھی۔ سب پر کئی کئی وقت کے فاقے گزر رہے تھے۔ اچھے اچھے مسلمان دشمنوں کی فوج کے دَل بادل کو دیکھ کر پریشان نظر آ رہے تھے۔ ایسی حالت میں غنیم کی طرف سے یہ شرط پیش کی گئی کہ مدینہ کی سالانہ پیداوار حملہ آوروں کو دینا منظور ہو تو محاصرہ اٹھا لیا جائے گا۔ رسول اللہؐ حالات کو دیکھ کر تشویش محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ آپ نیم آمادہ تھے کہ ایک تہائی پیداوار دینے کی شرط پر صلح کر لی جائے۔ لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے سعد بن عبادہؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ کو جو روسائے انصار تھے بلا کر مشورہ فرمایا۔ تو انھوں نے دریافت کیا کہ یہ تجویز اللہ کے حکم سے ہے یا آپؐ کی ذاتی رائے ہے۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ یہ ان کی اپنی رائے ہے۔ یہ سُن کر ان مشیروں نے اُسے نامنظور کر دیا۔ آنحضرتؐ نے انہی کی رائے پر عمل فرمایا اور خدائے عزوجل نے مسلمانوں کو فتح سے سرفراز فرمایا۔

مقصدِ اعلا کے لیے حلومت

آنحضرتؐ کے مشیروں کا یہ سوال قابلِ غور ہے کہ ایک تہائی پیداوار دے کر صلح کرنے کی تجویز خدا کے حکم سے کی گئی یا حضور اقدسؐ کی ذاتی رائے ہے۔ اس سوال میں بڑی گہرائی تھی۔ اور جواب سُن کر اس رائے کو اختیار نہ کرنے کا واقعہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ سب سے پہلے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو محبت، عقیدت اور وارفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ ہر امتی اپنے رہبر اور محسن اعظم کی جان تو جان ان کی ہر آن اور ایک آواز پر فدا ہو جانے کے لیے تیار رہتا اور دوسری طرف اُن کے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ آنحضرت کی کوئی ذاتی تجویز جو خالص دنیاوی معاملات سے متعلق ہو تو اس کو قبول کرنا لازمی امر نہیں۔ یہ جرأت بغیر آنحضرتؐ کی مرضی کے پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ ذرا تصور فرمایئے کہ وہ کیا تعلیم و تربیت ہو گی جس نے آنحضرتؐ کی ذات اور رسالت کے نازک فرق کا اس قدر صاف نقشہ ان صاحبان کے ذہن میں محفوظ کر دیا تھا۔ یہ بھی خیال میں رکھیے کہ اُس معلّمِ اعلا کی شخصیت کس قدر بلند ہو گی جو اپنی رائے کے بعد دوسری رائے کو اختیار کرنے کی جسارت پیدا کرتا تھا۔ لیکن اُس کی عظمت اُن کے دلوں میں ذرہ برابر نہیں گھٹتی تھی۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی اور دینی یا دنیوی قائد نے ہوش و حواس اور عقل کو استعمال کرنے کی ایسی عملی تاکید کی ہو۔ میرے دل سے پوچھیے تو یہ تعلیم ایک مردہ قوم میں ہمت اور خود داری کی جان ڈالنے کے برابر تھی۔

تھوڑا سا غور کرنے پر معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرتؐ کی عظمت اُن کے دلوں میں کیسے گھٹتی جب کہ ساری امت کو یقین کامل تھا کہ آنحضرتؐ کا مقصد ان کے ذہنوں کو غیر اللہ کی پابندیوں سے آزاد کرنا، اُن میں خود اعتمادی کی تعمیر کرنا تھا۔ اس غرض کے لیے حضورؐ ان کے ارادوں کو قوی کر کے ان میں حق کی خاطر جرأتِ اختلاف کو پیدا کرنا اور اپنی تعظیم و تکریم کو حدود کے اندر سمیٹ دینا چاہتے تھے ان کی عزت اور عظمت، عقیدت اور حکم برداری کی جو کیفیت تھی اس کو حدود کے اندر رکھنا بڑا دشوار مرحلہ تھا۔ اگر آنحضرتؐ اس خصوص میں ذرا بھی ڈھیل دیتے تو ان کے بعد کے معتقد اور جاں نثار ان کو انسانیت کے درجے سے اٹھا کر درجۂ خداوندی میں پہنچا دیتے یہ سب ان ہی کی عبرت انگیز دُور بینی کا نتیجہ ہے کہ اپنی ذاتی اطاعت کو گھٹا کر عمل کی آزادی کے موقع دیئے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی امت آج کی ساری اور قوموں کی نسبت شرک سے دُور ہے۔

ایک سجدہ

حضور رسالت مآبؐ کے نزدیک ہر وہ چیز جو شانِ خداوندی میں کہیں دُور سے بھی شرکت کا وہم پیدا کر دے قطعی ناروا تھی۔ اس بارے میں مولانا حالیؔ کی مسدّس کا مندرجہ ذیل ایک بند ہمیشہ

دہرانے کے قابل رہے گا۔ میں جب اس کو پڑھتا ہوں تو میرے دل میں آنحضرتؐ کی عظمت کے احساس کی ایک نئی رو پیدا ہوتی ہے۔ یہ بند شاعرانہ تخیل کا شاہکار نہیں ہے بلکہ اس کا ہر ایک مصرعہ رسالت مآبؐ کے ایک قول کا رواں ترجمہ ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ آنحضرتؐ کا ارشاد کیا تھا۔ ارشاد تھا کہ:

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم　　نہ کرنا مری قبر پہ سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم　　کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے حق نے دی ہے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

وحدانیت کی یہ تعلیم بس ایک ہستی کی بندگی کی اجازت دیتی ہے اور وہ ہستی خدائے لایزال ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کے آگے سر جھکانا یا کسی اور سے خیر و شر کا واسطہ قائم کرنا خلاف حکم الٰہی ہے۔ جو دل اس ایک حضوری میں جھک گیا وہ کسی اور سے نہ لالچ رکھ سکتا ہے اور نہ مرعوب ہوتا ہے۔ یہ ایک غلامی ایسی ہے کہ جو اس میں داخل ہو کر حلقہ بگوش ہو گیا وہ دنیا کے سارے سربلندوں کے سامنے سرفراز ہو گیا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ایک ہی حضور میں سجدہ کرے اور دنیا بھر سے بندگی کا رشتہ توڑ دے۔ لیکن یہ ثابت قدمی آسان نہیں کیونکہ بہت سے اہل اقتدار اور بہت سے محکوموں پر یہ شاق گزرتی ہے۔ کسی اور سے تو میں کچھ کہنے کے قابل نہیں، اپنے ہی دل سے کہتا ہوں کہ:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ذہن کی لامحدودیت

نعمت کے دینے والوں، طاقت کے شکنجے میں کسنے والوں اور کرّ و فر سے لرزا دینے والوں کی پیدا کی ہوئی لالچ اور ان کے پھیلائے ہوئے خوف سے دل کو یہ سجدہ جو تحفظ دیتا ہے وہ تو انسان آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ مگر وحدانیت میں اعتقاد سے ذہن کو جو وسعت حاصل ہوتی ہے اور اس سے کائنات کا جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ انسان کی شخصیت کو بدل دیتا ہے۔ اس کے ذہن میں اُس کا رشتہ مہ و انجم سے استوار ہو جاتا ہے۔ اس کو ایک ایسی قوتِ ناظمہ کا احساس ہو جاتا ہے جو اس کے روحانی وجود کو اس کرۂ ارض سے باہر لے جاتا ہے۔ وہ اپنی ساخت اور کائنات کی ساخت میں یگانگت کا تصور کرنے لگتا ہے اور فطرت سے ہم آہنگی کا سامان دیکھتا ہے۔ اس وحدت کے خیالات، احساسات اور تصورات ارضی حوادث کو یک لخت سکیڑ کر حقیر کر دیتے ہیں اور انسان کے آگے اختیار اور انتخاب

کی درازا اور وسیع راہیں کھل جاتی ہیں۔ ارتقائے حیات کا وہ منظر سامنے آتا ہے کہ جب زندگی مادہ سے بلند ہو کر روحانی مدارج میں داخل ہوتی ہے۔ یہ منظر بتاتا ہے کہ انسان بلند ہو کر حقیقتِ کلی کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کے ذہن اور آرزوؤں میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جس مرتبے کا انسان ہوتا ہے اسی درجے کی تبدیلی کا اُس کو تجربہ ہوتا ہے۔ رسولِ خداؐ کی معراج کسی اور کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ مگر اقبال نے جدید خیالات اور رجحانات کے مطابق اس کی جو شرح کی ہے وہ ہر مسلمان کو نہایت ارفع اور پُر تمکین آزادی کی بشارت دیتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰےؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس شعر کے روحانی اور طبیعیاتی مضمرات کے مدنظر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس کو یک گونہ اس آیت کریمہ کی شرح متصور کر لیا جائے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط (سورہ لقمان ۳۱: ۲۰)

ترجمہ: کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔

اس خوشخبری کے بعد کیا شک ہے کہ دینِ اسلام کی محکومی وہ شے ہے جس کی ہمرکاب زمین اور آسمان کی حکومت ہے۔ اسلامی زندگی احکام اور پابندیوں کا پلندہ نہیں ہے۔ وہ محکومی اور مجبوری اور دنیاوی طاقتوں کی غلامی نہیں ہے۔ عیسائیت کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ دینی پیشواؤں کی حکومت بھی ایک قسم کی دنیاوی سلطنت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو اللہ نے اس سے بھی آزادی دی ہے۔ سچی اسلامی زندگی وہ ہے جس میں مسلمانوں کو تسخیر کائنات کے وسائل پر قدرت حاصل کرنے کے مواقع میسر ہوں۔ فکر اور عمل کی یہ ہمت اور یہ آزادی انسانیت کے لیے اسلام کا خاص تحفہ ہے۔

لَا تَقْنَطُوْا اور كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ میں خدا کی خصوصی رحمت امت محمدی کے لیے ہے۔ جس زندگی میں یہ نہیں وہ بجھے ہوئے دلوں کی محفل اور خاموش چراغوں کی رات ہے۔ ایسی دنیا اسلام کی دنیا نہیں ہوسکتی۔ اسلامی کائنات وہ ہے جس میں:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اخلاقِ نبوی کی روشنی میں

اسلام کا سیاسی مزاج

جناب محترم ایس۔ ایم۔ ظفر

عنوان کی ترتیب عمداً ہے : یعنی اخلاقِ نبیؐ کا مزاج اسلام کا۔ اسی ترتیب سے آج یہاں سیاست کے موضوع پر گفتگو ہوگی۔ سیاست سے مراد ایک ماڈرن مملکت کی بھرپور سیاست ہے جس میں قائد کی صلاحیت، عوام کی تربیت، جماعت کی تشکیل۔ شوریٰ کا نظام اور جمہوریت وغیرہ شامل ہے۔

ابن خلدون نے سیاست کی تعریف یوں کی تھی۔ سیاست وہ قانونی حکمتِ عملی ہے جس کی قوت سے اجتماعی کردار اور مصالح عامہ کا تحفظ کیا جاتا ہے اور حکومت کا نظم چلایا جاتا ہے۔ دیکھنے میں جس طرح یہ بہت بڑا موضوع ہے اسی طرح یہ اتنی ہی بڑی اہمیت بھی رکھتا ہے اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر قدرے تفصیل ہی سے گفتگو ہونی چاہیے۔

میرے نزدیک رسول مقبولؐ کا اسوۂ حسنہ قبل از نبوت بھی سیاسی معاملات میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اس لیے میں نے اس وقت ہی سے جب آپؐ نے رسالت و نبوت کے منصب پر فائز ہونے کا اظہار کیا تھا، ایسے واقعات اور حالات کا انتخاب کیا ہے جن سے کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور سامنے آتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا سیاسی مزاج کیا ہے۔

یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ واقعات کی ترتیب اور ان کا انتخاب ممکن ہے تاریخ وار نہ ہو لیکن ایک ماڈرن مملکت کا سیاسی ڈھانچہ نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے ایسے واقعات ضرور ترتیب پا گئے ہیں جن کا مملکت کے مختلف شعبوں سے تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے یہ احساس بھی پیدا ہو کہ واقعات میں تسلسل نہیں لیکن جب آپ واقعات کے نتائج کو یکجا کر کے دیکھیں گے تو ہمارے سامنے ایک مربوط اور مکمل شکل نظامِ حکومت اور سیاسی مزاج کی یقیناً آجائے گی۔

یہ کوشش ایک طرح سے تحقیق کی حیثیت رکھتی ہے اور اس تحقیق کے نتیجے میں جو اہم بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ قرآن حکیم کے اصولوں کو سمجھنے کے لیے جتنی ضرورت اخلاق نبوی (سنتِ رسولؐ) کی روشنی میں سیاست کو پیش آتی ہے زندگی کے دوسرے شعبوں میں شاید ہی کسی اور شعبے کو پیش آئے

نزولِ وحی

موضوع زیر بحث کے سلسلے میں سب سے پہلے وہ موقع اور وہ بات آتی ہے جو سیدہ خدیجہؓ نے اس وقت کہی جب رسول مقبولؐ پہلی نزول وحی کے بعد اضطراب کی حالت میں گھر پہنچے تھے۔ سیدہ خدیجہؓ نے اس وقت جو باتیں آپ سے کیں ان کی حیثیت اور اہمیت یوں دفعت پا جاتی ہے کہ خود رسول مقبولؐ اس وقت پریشان تھے اور یہ فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ اس واقعے کی اصلیت کیا ہے؟ آپؐ نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا تھا اور اس موقع پر حضرت خدیجہؓ نے اس سلسلے میں جو کچھ عرض کیا۔ میں اسے اپنی گفتگو کا موضوع بناتے ہوئے اس میں سے صرف انہی باتوں کو منتخب کرکے پیش کر رہا ہوں جن کا تعلق سیاست کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سیدہ خدیجہؓ نے اس موقع پر یہ عرض کیا تھا کہ آپؐ غریبوں مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ پھر عرض کیا ہمیشہ سے سچی بات کہنا آپؐ کا شیوہ ہے۔ پھر عرض کیا آپؐ حق و صداقت کی راہ میں مصائب و آلام کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک نتیجہ اخذ کرنے کے انداز میں سیدہ خدیجہؓ نے اس طرح عرض کیا لہٰذا جو کچھ آپؐ نے دیکھا اور سنا ہے وہ آپؐ کے حق میں مفید ہی ثابت ہوگا۔

سیاست و قیادت

اگر غور کیا جائے تو اس گفتگو میں اسلامی سیاست کے قائدین کے اوصاف اور ان کے خصائص بیان کیے گئے اور ایک طرح سے اس سے اسلامی ریاست کا منشور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ قائدین کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ غریبوں اور محتاجوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اجتماعی زندگی میں جب انہیں اثر و اقتدار ملے تو ایسا نظام لائیں جس سے جلد ہی غربت و افلاس کا خاتمہ ہو سکے۔ سوشل ویلفیئر ریاست کی بنیاد یہاں سے ہی مل جاتی ہے۔

دوسری صفت جو ایک قائد میں تلاش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ صادق اور امین ہو، یعنی جو بات کہے سچ کہے۔ سچ کہنا، سچ بولنا اس کا شیوہ ہو بلکہ اس کی عادت میں داخل ہو جیسا کہ ہماری جدوجہد آزادی اور تحریک پاکستان کی تاریخ میں قائداعظم محمد علی جناح کا نام ایک روشن مثال ہے۔ لوگ کہتے ہیں قائداعظم نہ صرف سچے تھے بلکہ عادتاً سچے تھے جیسے انگریزی میں INTELLECTUALLY HONEST کہتے ہیں۔ یعنی قیادت ایسی ہونی چاہیے کہ اس پر عوام کا یقین و اعتماد ہو۔ اور یہ کہ

ابتدا ہی سے اس کا کریڈٹ درست ہو۔ CREDIBILITY کی شرط ایک اچھی اور صحیح قیادت کے لیے بے حد ضروری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حقوق کے تحفظ اور اس کے حصول کے لیے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی بنیادی ضرورت کا ذکر ہے اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ حق کی بات کرنے والے بے باک مخلص اور ایثار پرور ہونے چاہئیں۔ یعنی لانگ مارچ اور مسلسل کوشش کے بعد ہی معاشرے کے درست ہونے کی ضمانت دی گئی ہے۔

اعلانِ نبوت

میرے نزدیک دوسرا اہم واقعہ نبوت کا اعلان ہے جب آپؐ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر اہل مکہ کو پکارا اور ان سے پوچھا کہ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر پڑاؤ ڈالے پڑا ہے اور موقع پا کر چاہتا ہے کہ تم پر حملہ کرے تو کیا تم میری بات مان لو گے۔ اہل مکہ نے یک زبان ہو کر کہا: آپؐ امین ہیں ہم نے آج تک آپؐ کی زبان سے کوئی بات غلط نہیں سنی اس لیے آپ جو کچھ کہیں گے ہم اس کو سچ مانیں گے۔

اگرچہ اس سے پہلے بھی آپؐ حضرت خدیجہؓ کی زبان سے یہی بات سن چکے تھے تاہم وہ اپنے گھرانے کی بات تھی۔ قیادت کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس پر اعتماد کا اعلان عوام بھی کرتے۔ کیونکہ قیادت کا مقصد عوام کی رہنمائی کرنا ہے۔ اگر ابتدا ہی میں قیادت پر عوام کا اعتبار قائم نہ ہو تو پھر قیادت بے کار ثابت ہوتی ہے۔

صفاتِ قیادت

ہمارے ملک کی سیاست میں بدقسمتی سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے کہ قیادت نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی ہیں ایسے قائد تو ضرور ملتے رہے جو سیاسی تدبر اور فہم و فراست کی دولت سے مالا مال تھے، مگر انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کچھ ایسے انداز سے کیا کہ اس پر عوام اعتماد نہ کر سکے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اچھے کام بھی انجام نہ پا سکے جن کی عوام کو قائد سے توقع تھی۔

جب اسلام جیسی قوت اور تحریک کو بھی عوام تک پہنچانے کے لیے یہ لازم ہوا کہ اس کے قائد کی ذات ہر شک و شبہے سے بالاتر ہو تو اسلامی سیاست کے بنیادی اصولوں میں یہ پہلا اصول از خود طے پا جاتا ہے کہ اس کا قائد قول و فعل کے تضاد سے بالکل پاک ہو۔

اسلامی سیاست اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کے لیڈر یونہی نعروں پر عوام کو خوش کرکے اپنا مطلب نکالیں بلکہ جو کچھ کہیں وہ کرکے دکھائیں۔ اس طرح اسلام نے قیادت کے لیے عمل کی سخت کڑی شرط عائد کر دی ہے۔

اسلام اس قول کو تسلیم نہیں کرتا کہ محبت اور جنگ میں ہر شے جائز ہے۔ بلکہ مقصد کے حصول کے لیے اسلام نے یہ لازم کر دیا ہے کہ سیاسی میدان میں بھی حق و صداقت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیں، اور صداقت کی تائید اور تصدیق سارے عوام سے حاصل کی جائے اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ حق و صداقت اور سچائی کا اثر اذہان پر خود بخود مرتب ہوتا ہے اور عوام سچے قائد کو پہچان سکتے ہیں۔ مختصراً اس واقعے سے یہ دو بڑی باتیں اخذ ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ قیادت پاک صاف اور بے باک ہو اس میں کوئی تضاد نہ ہو دوسرے یہ کہ قیادت کے لیے عوام کی تائید براہ راست حاصل کی جائے جیسا کہ پورے مکے والوں کو دعوت دی گئی کہ تم بتاؤ۔ کسی مختصر سی محفل یا اپنی طرف سے بلائے گئے لوگوں سے تائید حاصل نہیں کی گئی تھی۔

قائد اور عوام

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ قیادت کے لیے قائد اور عوام کے درمیان کوئی واسطہ ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے خود قائد کا عوام تک پہنچنا بے حد ضروری ہے اور ایک سچا قائد جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں اہل مکہ جیسے جاہل اور گنوار عوام سے بھی اپنی قیادت منوا سکتا ہے۔ ہی سے یہ اصول بھی واضح ہوا کہ قائد کے لیے عوام سے رابطہ پیدا کرنا بے حد ضروری ہے۔

مکی زندگی سے سبق

نبوّت کے بعد کی مکی زندگی ہے جس میں آپ نے بڑے صبر و تحمل اور استقامت سے تبلیغ کی حضرت خدیجہؓ کی اس بات کا کہ آپؐ نڈر اور مخلص ہیں قطعی ثبوت مل جاتا ہے۔ لہٰذا میں مکی زندگی پر تفصیل سے کچھ نہیں کہوں گا صرف دو باتوں کا ذکر کروں گا۔

اوّل یہ کہ جب سردارانِ قریش نے یہ فیصلہ کیا کہ آپؐ کو مکے کی سرداری پیش کر دی جائے تو اس وقت آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ میں بادشاہت قائم کرنے کے لیے نہیں آیا۔ اگر آپؐ اس وقت سردارانِ قریش کی بات مان لیتے تو وہ یقیناً آپؐ کو سردار بنا لیتے۔ لیکن مقصد چونکہ ایک فلاحی مملکت کے قیام کا تھا اس لیے آپؐ سردارانِ قریش کے مرہونِ منت نہ ہوئے اور یہ بات سیاستدانوں کے

لیے واضح کر گئے کہ اقتدار کا مقصد صرف اقتدار کا حصول نہیں بلکہ اس سے عوام کو فائدہ پہنچانا اور کیے گیے وعدوں کو پورا کرنا مقصود ہے۔

اس قسم کی ایک سرداری انگریزوں نے محمد علی جناح کو بھی یہ کہہ کر پیش کی تھی کہ وہ دونوں مملکتوں (بھارت۔ پاکستان) کے گورنر جنرل بن جائیں۔ چونکہ ایسی سرداری سے نظریۂ پاکستان کو نقصان پہنچتا تھا اس لیے قائداعظم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ دراصل مخصوص مفادات کا حامل طبقہ اپنے مقصد کو پانے کے لیے عام طور پر یہی طریقہ ایجاد کرتا ہے کہ وہ انقلابی لیڈر کو سرداری کی پیش کش کرکے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے ایک چال چلتا ہے۔ اس سے بچنا اور صحیح اور نادرست قیادت کے درمیان فرق محسوس کرنا ایک سچے اور مخلص قائد کا فرض منصبی ہے۔ دوسرا واقعہ یہ کہ جب آپؐ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ خود بھی مکے سے ہجرت کرنی ہے تو آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ارشاد فرمایا کہ وہ شام کو تیار ہو کر آجائیں۔ ہمیں بھی مکے سے ہجرت کرنی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ تو اسی ساعت کے منتظر تھے انہوں نے تو پہلے ہی سے دل ہی دل میں تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔ چنانچہ جونہی شام ہوئی وہ سواری کے لیے دو اونٹنیاں لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ دو اونٹنیاں ہیں ان میں سے ایک آپؐ اپنے لیے منتخب فرما لیں۔ آپؐ نے ایک اونٹنی کو اپنے لیے چن لیا۔ خوشی سے حضرت ابوبکرؓ کا چہرہ دمک اٹھا اور عرض کیا لیجیے اب آپؐ اس اونٹنی پر سوار ہو جائیں مگر آپؐ نے سوار ہونے سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے دریافت فرمایا کہ اس کی قیمت کیا ہے پھر جب اصرار کرکے آپ نے قیمت پوچھی اور حضرت ابوبکرؓ کو مجبوراً مول کرنی پڑی تب آپ سوار ہوئے۔ اب ذرا ہمارے زمانے کی سیاست سے اس کا موازنہ کریں ہمارے رہنما اپنے دوستوں سے اکثر یہی کہتے ہیں کہ پہلے ہمیں اقتدار حاصل کر لینے دو اور ہماری ضرورت کے لیے اپنی کاریں اور دیگر وسائل ہماری تحویل میں دیدو (ایک صاحب نے تو اس مطالبے پر پورا بینک ہی لے لیا تھا) پھر جب ہم اقتدار حاصل کریں گے کئی گنا زیادہ نفع کے ساتھ تمہارا تمام حساب چکا دیں گے۔ کہیں بذریعہ روٹ پرمٹ اور کہیں لائسنسوں کی بھرمار سے تمہارے دلوں کے تمام شوق پورے کر دیں گے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک مرتبہ منیٰ میں بلادِ عرب کے نمائندوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اسلام کی طرف آنے کی دعوت دی۔ ایک قبائلی عرب بحیرہ بن فراس نے سمجھا کہ آپؐ اپنی شہنشاہیت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس نے پوچھا :

"اگر ہم تمہاری رعایا بن جائیں اور آپؐ اپنے دشمنوں پر غلبہ پا جائیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپؐ ہمیں حکومت کا جانشین مقرر کر دیں؟" آپؐ نے جواب دیا :

"حکومت کا معاملہ مختلف ہے وہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

غرض کہ کسی قسم کی غلط امید بھی نہ دلائی۔

اور اس مثال اور اس سے پہلے کی مثال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلامی مملکت شخصی اور شہنشاہیت نہیں ہے بلکہ یہ عوامی اور REPUBLIC ہے۔

واقعہ ہجرت سے رہنمائی

ہجرت کا واقعہ کئی طرح کی اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل مکی زندگی سے خفیہ انجمنوں کو کس طرح ملایا جائے اور آغاز میں کامیابی کتنی مشکل ہوتی ہے وغیرہ قسم کی سیاسی تربیت کے لیے بے حد مواد ملتا ہے۔ لیکن ان تفاصیل سے گزرتے ہوئے ہم ہجرت کی اس اہمیت کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ کا آغاز ہی ہجرت سے کیا گیا۔ یہ آغاز آپؐ کی پیدائش کے دن سے کیا جاسکتا تھا۔ یا اعلانِ نبوت کے دن کی اہمیت کے پیشِ نظر اس دن سے کیا جاسکتا تھا۔ لیکن سنہ ہجری یعنی آپؐ کی ہجرت سے کیوں اسلامی سال کا آغاز ہوا؟

میرے تجزیہ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان پہلی بار ایک آزاد قوم کی حیثیت میں اپنی زندگی کا آغاز اسی وقت سے شروع کرتے ہیں اور اسلام کی پہلی مملکت یعنی ریاست مدینہ کی بنیاد پڑتی ہے اس سے اہم سیاسی اصول مرتب ہوتا ہے اور اسلامی سیاسی مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے۔

جیسا کہ علامہ ابولنصر فارابی نے کہا اور شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید نے تائید کی۔ یہ اسلامی مزاج کا تقاضا ہے کہ مسلمان آزاد ہو۔ غلامی مسلمان کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ اسلام کا یہی مزاج پاکستان کے وجود کا باعث بنا۔ اسلام کے اس مزاج نے مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کو آزادی کی خواہش سے مضطرب رکھا۔ اور مغربی مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ COLONIALISM کی لعنت سے جلد چھٹکارے کی ایک وجہ مسلمانوں کی آزادی کی خواہش تھی۔

غرض اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ ایک آزاد مملکت بھی ہو۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ماڈرن مملکت کی کما حقہ ضروریات اسلام مہیا کرتا ہے۔

اب ذرا اس معاہدے کے الفاظ پر غور کریں جو آپؐ نے مدینہ کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان کیا۔ اس میں ایک شق یہ ہے کہ معاہدہ میں شامل ہونے والے تمام فریق "ایک ملتِ واحدہ قرار دیئے جاتے ہیں"۔

آج کسی بھی بڑے سے بڑے جمہوری ملک کا آئین اٹھا کر دیکھ لیں یا بڑے مغربی سیاسی مفکر کا مملکت کے متعلق تصور لے لیجیے۔ ملتِ واحدہ کے تصور سے آگے نہ جمہوری مملکت نہ سیکولر حکومتیں

کوئی تصور دے سکیں ہیں۔

ایک بار ایک مملکت میں شمولیت ہوگئی تو پھر ایک ملّت کا حصہ بن گئے۔ شاید ایسی ہی بات تھی جو قائداعظم نے دستور ساز اسمبلی میں کہا تھا کہ "اب پاکستان بن گیا ہے اور مسلمان اور غیر مسلم برابر کے شہری بن گئے ہیں۔" اسلام کا سیاسی مزاج۔ ایک اسلامی ریاست میں ملّتِ واحدہ کے تصور کو اُجاگر کرتا ہے۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ تو سب جانتے ہیں۔ مسلمان اس معاہدہ کو اپنی کمزوری سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے باقی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے آپؐ سے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ رسول نہیں؟ کیا آپؐ نبی برحق نہیں؟"

آپؐ نے فرمایا "بیشک میں نبی ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا، کیا ہم مسلمان نہیں؟

ارشاد فرمایا، کیوں نہیں۔

حضرت عمرؓ نے کہا،، کیا وہ لوگ مُشرک نہیں؟

فرمایا، مشرک ہیں۔

حضرت عمرؓ نے عرض کی، پھر ہم دین کے معاملے میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔

آپؐ نے فرمایا "میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ مجھے ہرگز خوار نہ کرے گا۔

آپؐ نے حضرت عمرؓ کے سوالات کے جوابات خوش دلی اور صاف گوئی سے دیے۔ لیکن پھر بھی مسلمان افسردہ تھے۔ اور قربانی کے لیے جو جانور لائے ہوئے تھے وہ قربان نہیں کر رہے تھے۔ آپؐ نے بی بی عائشہؓ سے ذکر کیا اور پھر ان کی رائے کے مطابق مسلمانوں سے کوئی گلہ کیے بغیر پہلے خود اپنے جانوروں کی قربانی دی۔ آپؐ کو دیکھ کر باقی مسلمانوں نے بھی قربانی دینی شروع کر دی اور فضا سے کھچاؤ اور مایوسی دُور ہو گئی۔

اس ذکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے سیاسی مزاج میں تنقید برداشت کرنے کی گنجائش ہے۔ عوام اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اور قائد پر فرض ہے کہ وہ ان کی تسلی کرے۔ البتہ عوام نے ایک بار کسی کو اپنا لیڈر چن لیا ہے تو ان پر بھی فرض ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اطاعت میں کمی نہ کریں۔

یہی مزاج تھا جو کہ اخلاق نبیؐ سے اسلام کی سرشت میں شامل ہو گیا، کہ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے ان کے کرتے کا حساب مانگ لیا تھا۔

احتساب، آزادیٔ رائے

اسلام کی سیاست کا CORNER STONE احتساب ہے اور اس کے لیے آپؐ کی تمام زندگی ایک نمونہ ہے۔ صلح حدیبیہ کا یہ واقعہ ہی چونکہ بڑا ہی SENSITIVE واقعہ تھا اور اس دن جذبات بڑے مختلف تھے اس لیے اس دن آپؐ نے جو اخلاق کا نمونہ پیش کیا اور ماننے والوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا جو موقع دیا وہ ایسی مثال ہے کہ اس سے اظہار رائے کی آزادی کا پورا چارٹر مرتب ہو سکتا ہے۔ آزادیٔ اظہار اور احتساب کا چولی دامن کا ساتھ اسلام کے مزاج میں شامل ہے۔ جو اسلامی ریاست آزادیٔ اظہار کو روکتی ہے اور احتساب کا مکمل انتظام نہیں کرتی وہ ابھی اسلام کے سیاسی خاکہ کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔

فتح مکہ

واقعات تو بہت سے ہیں اور ایک ایک واقعہ نئے زاویے سے سیاسی مزاج کی تدوین کرتا ہے۔ لیکن آج تو خدو خال ہی پیش کیے جا سکتے ہیں اس لیے میں اب فتح مکہ کی بات کرتا ہوں۔ اس روز آنحضرتؐ نے کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر تین اہم اعلان کیے تھے۔ پہلا اعلان تو حرمتِ مکہ کے متعلق تھا، دوسرا عام معافی ہے اور تیسرا اعلان سیاست کا سنگِ میل ہے۔ آپؐ نے اعلان کیا:

"آج جاہلیت کے خاندانی اور نسلی غرور کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ تمام انسان آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے بنا تھا۔"

یہ اعلانِ مساوات آج کے دساتیر میں RIGHT OF EQUALITY کے نام سے مشہور ہے۔ اس اعلان نے ظاہر کر دیا کہ اسلامی حکومت عمومیت کی اساس پر قائم ہو سکتی ہے۔ اور حسب نسب کے جھگڑے، اور حسب نسب کے شجروں سے پاک ہے۔ جو یہ کہے کہ وہ اچھے اور ایک بہت معزز خاندان کا رکن ہے اس لیے افضل ہے وہ اسلام کے مزاج کے خلاف بات کرتا ہے۔ خاندانی شجروں کو علاوہ تاریخی فتنہ کے اور اسلام میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس قسم کا بیان کہ اہل رائے لوگوں کو حسب نسب اور خاندانی تعلق کو مدنظر رکھ کر چنا گیا ہے یا چنا جائے گا نوکر شاہی کی ترجمانی کرتا ہے اور اسلامی مزاج کے مطابق نہیں ہے۔

خاتمۂ کلام

اب آخر میں ایک عجیب مثال پیش کرنی ہے اور یہ آخری بات ہے۔ اخلاق نبیؐ کی کہکشاں ہے۔ آپؐ اپنے ساتھی تیار کرتے ہیں، انھیں رشد و ہدایت دیتے ہیں، ان کی تربیت کرتے ہیں، لیکن اپنے بعد کسی کو نامزد نہیں کرتے اور معاملہ عوام پر چھوڑ دیتے ہیں۔

میں نے اپنی کتاب "عوام، پارلیمنٹ، اسلام" میں اسے "سکوت حکیمانہ" کا نام دیا ہے۔ اگر آپؐ حکم دے جاتے تو تعمیل کرنا فرض ہو جاتا، آپؐ نے یہ بات جمہور پر چھوڑ دی، نامزدگی سے اجتناب کیا۔

اپنی قوت اور اختیارات کا استعمال نہ کرنا اور جمہور کے اختیارات کو ترجیح دینا، ایسی مثال ہے کہ اسے جمہوریت کا میگنا کارٹا کہنا ہی صحیح اور افضل ہے۔

اخلاق نبیؐ کی روشنی میں آپ نے دیکھا کہ کیسا اسلامی سیاسی مزاج ابھرتا ہے۔ اوّل تو سیاسی شعور اس مزاج کا ایک حصہ دکھائی دیتا ہے۔ مسلمان کے خون میں سیاست ہے۔ پھر یہ عمومی اور جمہوری ہے۔ مساوات کی تعلیم دیتی ہے اور قائد سے تقاضا کرتی ہے کہ اس کے قول و فعل میں فرق نہ ہو۔ اور نظام حکومت کا مقصد عوام کی بھلائی چاہتا ہے دنیا کا کوئی دستور اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔

اسلام کا نظام عدل

جناب محترم جسٹس (ریٹائرڈ) محمد افضل چیمہ

اِنّ اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان وایتاءِ ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون o

"بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور اہلِ قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں، اور کھلی بُرائی اور مطلق بُرائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو اس لیے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو۔"

مغرب کے محدود تصورِ مذہب کے برعکس جو محض چند رسوم و عبادات سے عبارت ہے اسلام ایک جامع ضابطۂ حیات اور مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے لیے قرآنِ مجید میں "دین" کی اصطلاح استعمال فرمائی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ o

"بلاشبہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے"

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ o

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا۔"

اور حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ پر جو آخری آیتِ کریمہ نازل ہوئی "الیوم اکملت لکم دینکم"، اس میں بھی تکمیلِ دین کا ذکر فرمایا گیا۔ چناں چہ دینِ اسلام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں ہدایت اور رہ نمائی کے وہ ابدی اور اساسی اصول مہیا کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی صورت میں وحیِ الٰہی کے ذریعے خاتم المرسلین و رحمۃ للعالمین صاحبِ خلقِ عظیم کی وساطت سے ہم تک پہنچائے۔ پھر حضور اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک مقدس لمحے سے ان اصولوں کی عملی تعبیر و تفسیر کا بہترین نمونہ میسر آتا ہے جو سیرت و سنتِ نبوی

یعنی حضورؐ کے افعال و اقوال کی صورت میں کتبِ حدیث میں پوری صحت کے ساتھ محفوظ ہے۔ حضورؐ قرآن مجسّم تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک استفسار کے جواب میں ارشاد فرمایا:

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ

"آپ قرآنِ مجسّم تھے۔"

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ و الیوم الاخر و ذکر اللہ کثیرا ○

"تم لوگوں کے لیے یعنی ایسے شخص کے لیے جو اللہ سے اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکرِ الٰہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔"

اسلام میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے فرائض کی انجام دہی اور واجبات کی ادائیگی کے لیے انسان کے تربیتی پروگرام میں اخلاقی اقدار و محاسن مثلاً محبت، رحم، ہمدردی، ایثار، دیانت امانت، ایفائے عہد، عدل و احسان وغیرہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس نظامِ تربیت میں یومِ حساب، مسئولیت اور جزا و سزا کے عقیدے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جو راسخ الایمان لوگوں کے لیے سب سے بڑا محتسب اور منکرات و خباثت سے پرہیز اور حسنات و معروفات کی طرف میلان و رُجحان کا ضامن ہے۔ انفرادی ذمے داری کے علاوہ کوئی شخص بھی اجتماعی مسئولیت سے مستثنیٰ نہیں ہے خواہ اس کا دائرہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

الا کلکم راعٍ و کُلُّکُم مسئول عن رعیتہٖ

قرآنِ کریم میں عدل و احسان کا ذکر متعدد آیاتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے اور اس کی تلقین فرمائی گئی ہے:

یایھا الذین اٰمنو کونو اقوامین بالقسط شھداء للہ ولو علیٰ انفسکم او الوالدین و الاقربین ○

"اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم رہنے، اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو، اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتے داروں کے مقابلے میں ہو۔" ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

یایھا الذین اٰمنو کونو اقوامین للہ شھدا بالقسط

ولا یجرمنکم شناٰن قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ ۞

"اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کے لیے پوری پابندی کرنے والے انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔" نیز ارشاد ہے:

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ۞

"اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو۔"

ہمارے ہاں عدل کی اصطلاح تین مختلف معروف معنوں میں مستعمل ہے۔

توازن واعتدال

ایک مفہوم سے مراد توازن اور اعتدال، افراط و تفریط سے احتراز اور امرِ متوسط لی جاتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ۞

"اور ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے جو اعتدال پر ہے تاکہ تم لوگوں میں مقابلہ میں گواہ ہو۔"

یا کہا گیا ہے: "خیر الامور اوسطھا"

مساوات

دوسرے مفہوم کے مطابق عدل مساوات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

انصاف

محدود معنوں میں عدل انصاف سے بھی عبارت ہے جس میں نظامِ قانون و عدالت کی مختلف صورتیں شامل ہیں۔ اگر عدل کو توازن و اعتدال کے وسیع تر مفہوم کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اسلام میں اس کی مندرجہ ذیل صورتیں پائی جاتی ہیں۔

(الف) فرد یا معاشرے میں جسم اور روح کی نشو و نما اور بالیدگی کو یکساں طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جبلی اور فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی حقیقت پسندی سے اسلام نے جسمانی اور مادی ضروریات کو بہ یک وقت پورا کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار دیا ہے۔ چناں چہ

رزقِ حلال کا کمانا، کھانا پینا، شادی کرنا، بال بچوں کی پرورش، دنیوی زندگی کے ایسے وظائف ہیں جو روحانی ارتقا اور نجاتِ اخروی میں کسی طرح حائل یا مزاحم نہیں بلکہ بہ منزلہ عبادات ہیں۔ عیسائیت یا بدھ مذہب کی طرح اسلام میں ترکِ دنیا یا رہبانیت کسی طرح جائز نہیں ہے آں حضرت صلعم کا ارشاد ہے: "لا رھبانیۃ فی الاسلام" حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو ترکِ دنیا اور ازدواج سے کنارہ کشی سے سختی سے منع فرمایا، اور اس طرزِ عمل کو خلافِ سنت قرار دیا۔

حدیث میں آیا ہے۔

ان نفراً من اصحاب النبی سألوا ازواج النبی عن عملہ فی السر فقال بعضھم لا اتزوج النساء وقال بعضھم لا اکل اللحم وقال بعضھم لا انام علیٰ فراشٍ فحمد اللّٰہ واثنیٰ علیہ فقال مابال اقوام قالوا کذا وکذا لکنی اصلی وانام واصوم وافطر واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔

(مسلم عن انس کتاب النکاح)

"چند صحابہؓ نے نبیؐ کی بیویوں سے آپ کے پوشیدہ معمولات کے بارے میں پوچھا، جب انھیں بتایا گیا تو اُن میں سے ایک نے کہا: میں شادی نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا، میں گوشت نہ کھاؤں گا، تیسرا بولا، میں فرش پر نہیں سوؤں گا، آں جناب صلعم کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ میں (رات میں) نفل پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں، میں کبھی (نفلی) روزے رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا، میں بیویاں رکھتا ہوں، پس جو میرے طریقے سے مُنہ موڑے گا وہ مجھ سے نہیں۔"

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قل من حرم زینۃ اللّٰہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق ○

"آپ فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے کپڑوں کو جن کو اُس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے۔"

البتہ دنیوی زندگی کے ان تمام وظائف کے لیے معقول اور معتدل حدود اور طریقہ ہائے کار مقرر کر دیے گئے ہیں جن سے تجاوز کرنا ممنوع ہے۔

(ب) اسلام انسانی زندگی میں دین و دنیا کی تقسیم و تفریق کا قائل نہیں ہے حتیٰ کہ دین اور سیاست کی علاحدگی کا مغربی تصور بھی سراسر غیر اسلامی ہے۔ زندگی ایک جامع اور ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ فرض عبادات اور ذکر و فکر کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر دنیاوی زندگی کے تمام فرائض کی ادائیگی اور لذات سے لطف اندوزی بہترین عبادت قرار دی گئی ہے۔

(ج) اس نوع عدل کی ایک صورت فرد اور معاشرے کے مابین باہمی ربط و ضبط میں اعتدال و توازن کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اسلامی معاشرے میں جہاں ایک طرف فرد کی آزادانہ نشوونما اور ارتقا کے تمام معقول مواقع میسّر آتے ہیں، وہاں امّتِ مُسلمہ کے رُکن کی حیثیت سے اُس کے ذمّے کچھ اجتماعی فرائض بھی ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی نظام میں فرد کی حیثیت محض ایک بے جان اور بے بس پُرزے کی رہ جاتی ہے جو اجتماعیت کی آہنی گرفت میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں دولت مند اور طاقت ور افراد کو معاشرے پر زبردست سیاسی غلبہ اور تسلط حاصل ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اس کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط کی ہیں جن کے مُضر اثرات و نتائج روزمرّہ سامنے آرہے ہیں۔ مگر اسلام میں عائلی زندگی کے فرائض، صدقات و زکوٰۃ کی تاکید، جہاد میں شرکت وغیرہ کے علاوہ پانچ وقت نماز باجماعت، صلوٰۃ جمعہ اور عیدین کے اجتماعات اور حج کے موقع پر مسلمانانِ عالم کا اجتماع، اسلام کی اجتماعیت اور مرکزیت کی چند مثالیں ہیں۔ جن سے فرد اور معاشرے کے مابین غیر استحصالی معیشت، توازن اور تعمیری اعتدال کی وضاحت ہوتی ہے۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

(د) اسلام میں عدلِ اجتماعی کا اصول محض عقیدے کے طور پر ہی تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ پیغمبرِ اسلام نے اس کا عملی نفاذ فرما کر دنیا کے سامنے اجتماعی مساوات کی بہترین مثالیں پیش کیں۔ چناں چہ جب میثاقِ مدینہ کی رو سے پہلی اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی گئی تو یہودیوں سے عدل و مساوات کی بنیاد پر معاہدہ کیا گیا۔ "لا اکراہ فی الدین" کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُنھیں مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی عطا کی گئی۔ احوالِ شخصیہ میں انھیں اپنے مسائل اور معاملات اپنے مذہب کے مطابق طے کرنے کی اجازت دی گئی، ان کی جان و مال،

عزّت و آبرو کے تحفظ کی ضمانت دی گئی اور " ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا "، کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہی نہیں کیا گیا بلکہ اسے اسلامی مملکت میں رعایا کے تمام مسلم اور غیر مسلم شہریوں پر یکساں طور پر نافذ کیا گیا۔ اگرچہ یہ ارشادِ نبوی حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب فرمایا گیا تاہم بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت اور اس کا عملی نفاذ حیاتِ طیبہ ؐ کے ہر لحظے اور ہر لمحے سے عیاں ہے۔

مساوات

دوسرے مفہوم کی رو سے عدل مساوات کے مترادف ہے۔

(ا) اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید و الوہیت بہ جائے خود عدل و مساواتِ اجتماعی کی سب سے بڑی ضمانت ہے، " لا الہ الا اللہ "، اور " ایاک نعبد و ایاک نستعین کا مفہوم کچھ یہ ہے کہ مستحقِ عبادت و سزاوارِ بندگی وہی ایک ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اس اعلان و اقرار سے تمام دنیاوی خداؤں، فرماں رواؤں، مذہبی اور رُوحانی پیشواؤں کی بندگی یکسر ختم ہو جاتی ہے۔ جسمانی اور روحانی غلامی کے تمام بندھن یک لخت ٹوٹ جاتے ہیں۔ " اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ "، اور " اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ "، پر ایمان لاتے ہوئے ساری کائنات پر اللہ کی حاکمیت تسلیم کرنے سے مطلق العنانیت، شخصی حکومت، موروثی ملوکیت، پاپائیت اور بادشاہت کے خدائی حق DIVINE RIGHT OF KINGSHIP کے تمام نظریات یک قلم باطل ہو جاتے ہیں۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وُہی باقی بُتانِ آذری!

(ب) " وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ "، کے اصول کے ذریعے اور خود نبیِ اکرم ؐ کو " وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ "، سے مشاورت کا حکم دے کر اسلام نے جمہوریت کی مضبوط بنیاد استوار کر دی۔ عالم گیر اخوت اور بنی نوع انسان کے مساوات کا تصوّر اسلام نے آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے دنیا کے سامنے مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں پیش کیا۔

یاایھا الناس انا خلقنکم من ذکر وانثی وجعلنکم شعوبًا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم ۝

" اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم

سب میں بڑا شریف وُہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

(ج) چودہ سو سال بعد آج اقوامِ متحدہ کے منشور میں بنی نوع انسان کے ایک کنبہ ہونے کا تصور محض اقرار باللسان کی حد تک پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق بالقلب کا کوئی عملی ثبوت کہیں نظر نہیں آتا بلکہ روز مرّہ اس کی صریح خلاف ورزی کے مظاہر اور شواہد سامنے آرہے ہیں اور اس کی پامالی اسرائیل، جنوبی افریقہ، ہندُستان اور روس وغیرہ کے ہاتھوں مسلسل ہو رہی ہے۔ یہ عادلانہ اصولِ مساوات دامن اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس سے ہر قسم کے نسلی، لسانی اور جغرافیائی امتیازات باطل ہوجاتے ہیں۔ قرآن کریم نے عزّت وفضیلت کا واحد معیار تقویٰ اور خداخوفی کو قرار دیا ہے اور اس طرح نسلی تفوّق کی بنیادیں یکسر منہدم کردی ہیں۔

بحمداللہ اب تو معقول سائنسی دلائل کی بنا پر بھی یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ شکل وصورت، قدوقامت، لون ولسان کے شدید اختلافات کے باوجود نسلِ انسانی ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہے جس سے "ڈارون" کے نظریۂ ارتقا کا ابطال ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں جو انسانی حقوق کا جامع اور مکمل ترین چارٹر یا منشور ہے ارشاد فرمایا:

"لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِاَبْیَضَ عَلٰی اَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی
کُلُّکُمْ لِاٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ"۔

عدلِ اجتماعی

اسلام میں اجتماعی عدل کی ایک صورت یہ بھی ہے جو عدلِ عمرانی یا Social Justice کی اصطلاح سے معروف ہے۔

(۱) اسلام نے مرد اور عورت کے مابین حقوق وفرائض کی ایک نہایت فطری اور عادلانہ تقسیم کردی ہے۔ تاریخِ انسانی میں سب سے پہلے اسلام نے ہی معاشرے میں عورت کو ایک قابلِ احترام مقام عطا کیا ہے۔ کسبِ مال، حقِ ملکیت، حقِ نکاح میں اسے پوری آزادی حاصل ہے۔ اگر بچے کی رضاعت کا فرض عورت پر عائد کیا گیا ہے تو بیوی بچے دونوں کی کفالت مرد پر واجب ہے۔ اگرچہ ہندُستان میں ستی کا قانون صدیوں سے منسوخ ہوچکا ہے تاہم ہندو معاشرے میں آج بھی بیوہ کی زندگی سخت اجیرن ہے اور وہ بے چاری زندہ درگور کے مترادف ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے وانکحوا الایامیٰ منکم کا حکم دے کر نکاحِ بیوگان کو ایک مستحسن امر قرار دیا ہے۔ عائلی زندگی میں مرد اور عورت کے درمیان حدود وکار بھی متعین کردی

گئی ہیں۔ یہ تقسیم بھی عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ غرض یہ کہ اسلام فرد، خاندان، جماعت اور قوم میں ایک عادلانہ ربط اور نظم پیدا کرتا ہے۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں عائلی زندگی کا وجود سرے سے ختم ہو چکا ہے جس سے کئی مفاسد نے جنم لیا ہے۔ مگر اسلام اس کو ایک تقدس عطا فرماتا ہے۔ افرادِ کنبہ میں میاں بیوی کے علاوہ والدین اور اولاد دونوں شامل ہیں۔ والدین کے حقوق کی پاس داری، ان کی خدمت و اطاعت پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ گفت گو میں بھی ان سے سخت کلامی کی ممانعت کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

فلا تقل لهما أفٍ ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما ○

"کبھی ہاں سے ہوں بھی مت کرنا، اور نہ اُن کو جھڑکنا اور اُن سے خوب ادب سے بات کرنا۔"

واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا ○

"اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دُعا کرتے رہنا کہ میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے: جیسا انھوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پرورش کیا ہے۔"

مغرب میں عورت کو مساواتِ مطلقہ کی بنیاد پر اس قدر ذلیل و خوار کیا گیا ہے کہ فطری تقاضوں کی اس خلاف ورزی سے معاشرہ طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہو گیا ہے۔ بالخصوص بچوں میں ہر طرح کے جرائم کا اضافہ ہو رہا ہے۔ روز افزوں شرحِ طلاق سے عائلی زندگی برباد ہو رہی ہے۔

(ب) اسلام کے معاشی نظام میں حقِ ملکیت کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا ہے بلکہ اُسے پورا قانونی تحفظ عطا کیا گیا ہے۔ فقہی اصول ہے" ليس للامام ان ياخذ من احدٍ شيئًا الا بحقٍ ثابتٍ معروفٍ"، مگر یہ تحفظ غیر محدود یا غیر مشروط نہیں ہے۔ اللہ کریم کے عطا کردہ جان و مال پر انسان کا تصرف کُلّی اور قطعی ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت امین اور ٹرسٹی کی سی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة ○

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اُن کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات

کے عوض خرید لیا ہے کہ اُن کو جنت ملے گی۔"

اگر جان و مال کا تحفظ لازم ہے تو کبھی کبھی اس کا نثار اور قربان کر دینا بھی واجب ہو جاتا ہے: ؎

"ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی"

اسلام نے اصحابِ ثروت کے مال و دولت میں غربا و مساکین کا حصہ مقرر فرمایا ہے۔ صدقات و زکوٰۃ کی ادائیگی ہرگز کسی پر احسان نہیں ہے بلکہ غربا کو اُن کا حق لوٹا دیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

وفی اموالھم حق للسائل والمحروم

"اور ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی کا حق ہے۔"

معاشرے میں زر پرستی اور استحصال کو روکنے اور جذبۂ خدمتِ خلق، ہمدردی اور ایثار کے جذبات کو پروان چڑھانے کے لیے اسلام نے سُود کی شدید مذمت اور قطعی ممانعت کر دی ہے۔ اور بلا سُود لین دین، مشارکت اور مضاربت پر مبنی بنکاری، اسلامی معاشیات کا اہم اصول ہے۔ اسراف و تبذیر اور نمود و نمائش کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

(ج) رعایا کے ہر فرد کی بنیادی ضرورت مہیا کرنا اسلامی حکومت کا اوّلین فرض ہے۔ جس کی ادائیگی کے لیے مال و دولت پر محاصل عائد کیے جا سکتے ہیں۔ صدقات کے متعلق ارشادِ نبوی ؐ ہے، "تؤخذ من اغنیائھم وترد الی فقرائھم" حتیٰ کہ دولت کے چند ہاتھوں میں ناجائز ارتکاز کو روکنے کے لیے نیز اُمراء اور غرباء کے مابین فاصلہ کم کرنے کے لیے مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر اگر حکومت نجی ملکیت پر تحدید عائد کرنا ناگزیر تصور کرتی ہو تو "ابنِ حزم"، اور بعض دیگر فقہائے کرام کی نگاہ میں ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے۔

اب عدل کے محدود مفہوم کے متعلق جو انصاف کا مترادف ہے کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

عدل انصاف کے معنی میں

اس ضمن میں اسلامی نظامِ عدل و انصاف کے بعض اہم اصولوں کا ذکر بے محل نہیں ہوگا۔

(۱) اگرچہ تمام مہذب ممالک کے دساتیر میں قانون کی حکمرانی اور بالادستی کا خاص طور

پر ذکر کیا گیا ہے تاہم ہر دستور میں سربراہِ مملکت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی قاتل، ڈاکو، خائن یا چور کے عدالتی حکمِ سزا یابی کو موقوف کر دے، اس کی سزا معاف کر دے یا اس میں تخفیف کر دے۔ یہ دراصل دورِ ملوکیت کے "حقِ سلطانی" کی ایک متغیر صورت اور اس کے باقیات السیئات میں سے ہے۔ شریعت کی رو سے سربراہِ مملکت یا کسی اور با اختیار شخصیت کو ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ قتل کے جرم میں جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، مقتول کے ورثاء کو یہ حق ہے کہ وہ کسی مرحلے پر بھی مجرم سے مصالحت کا معاملہ کر لیں یا اسے معاف کر دیں۔

(ب) اسی نوعیت کی ایک دوسری شق جو دنیا کے ہر دستور میں پائی جاتی ہے وہ سربراہِ مملکت کا قانونی عمل داری سے استثناء ہے۔ یہ بھی دورِ ملوکیت کی باقیات السیئات میں سے ہے جس کی بنیاد اس قول پر ہے کہ:

"King can do no wrong"

"بادشاہ معصوم ہے اور اس سے کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا"۔ شریعت میں بادشاہ یا سربراہِ مملکت یا کسی با اختیار شخص کو اس قسم کی کوئی استثنائی رعایت حاصل نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسے متعدد واقعات پائے جاتے ہیں جہاں سربراہ مملکت کو مدعی یا مدعیٰ علیہ یا ملزم کی حیثیت سے عدالت میں ایک عام آدمی کے ساتھ کھڑا ہونا پڑا۔ اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا: ؎

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست
خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

(ج) عدلیہ کی حریت اور انتظامیہ سے اس کی علاحدگی کا اصول بھی اسلام نے ہی پہلے پہل دنیا کو عطا کیا۔ اگرچہ عدلیہ کے ارکان کا انتخاب اور تقرری صدرِ مملکت کے حکم سے ہوتی ہے تاہم قضا کے معاملے میں وہ اُن کے فیصلوں میں کسی طرح بھی دخل انداز ہونے کا مجاز نہیں ہے اور ارکانِ عدلیہ اپنے فیصلے احکامِ شریعت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی اور مسئولیت کے نقطۂ نظر سے صادر کرنے کے مکلف ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں عدل و احسان کا ذکر متعدد مرتبہ ایک ساتھ آیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۝

"اور یہ کہ جب لوگوں کا تصفیہ کیا کرو تو عدل سے تصفیہ کیا کرو۔"

(۱) عدالت میں سچی گواہی دینے کی تاکید فرمائی گئی ہے خواہ اعزہ و اقربا کے خلاف ہی کیوں

نہ ہو۔

یٰایُّھا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَاءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ○

"اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو۔ اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔"

اور کتمانِ شہادت سے منع فرمایا گیا ہے، ارشادِ باری ہے:

وَلَا تَکْتُمُوْا الشَّھَادَۃَ وَمَنْ یَّکْتُمْھَا فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ ○

"اور شہادت کا اِخفا مت کرو، اور جو شخص اس کا اخفا کرے اُس کا قلب گنہگار ہوگا۔"

(ب) عدل و انصاف کے معاملے میں اسلام اس قدر حساس ہے کہ تاکیداً یہ حکم دیا گیا ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی کسی حالت میں، کسی قسم کی ناانصافی روا نہیں رکھنی چاہیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ○

"اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم عدل نہ کرو!"

(ج) اسلام میں قصاص نہ صرف جائز ہے بلکہ فرمایا گیا ہے کہ تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ

لیکن اس کے ساتھ ہی احسان اور عفو و درگزر کی بھی تلقین فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

یٰایُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ ○

"اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین کے بارے میں آزاد آدمی آزاد آدمی کے عوض میں، اور غلام، غلام کے عوض میں، اور عورت، عورت کے عوض میں۔ ہاں جس کو اس کے فریق کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے۔ تو معقول طور پر خوں بہا کا مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ اُس کے پاس پہنچا دینا۔"

(د) معاشرے میں امن و سکون باہمی محبت، صلح اور آشتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے بعض معمولی باتیں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ عام سلوک اور برتاؤ میں بھی احسان کی تلقین فرمائی گئی ہے حتیٰ کہ سلام کا جواب دینے کے متعلق بھی جو بہ ظاہر معمولی سی بات ہے۔ ارشاد ہے:

واذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردوها ٥

"اور جب تم کو کوئی سلام کرے تو تم اُس سے اچھے الفاظ میں سلام کرو یا ویسے ہی الفاظ کہہ دو۔"

"برائی کے بدلے میں انتقام کے بجائے درگزر"

روزمرہ کے معاملات میں حسنِ سلوک اور احسان کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِی هِیَ اَحْسَنُ ٥

"اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی آپ نیک برتاؤ سے بدی کو ٹال دیا کیجیے۔"

فتح مکہ کے موقع پر "لا تثریب علیکم الیوم" فرما کر جس طرح حضور ﷺ نے دشمنانِ اسلام کی جان بخشی کا اعلانِ عام فرمایا اُس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ مستشرقین نے خاص طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ تاریخِ عالم میں کوئی فاتح اس انداز سے مفتوحہ شہر میں داخل نہیں ہوا۔

(۱) اسلام انفرادی ارتکابِ جرم کے معاملے میں بھی اجتماعی ذمّے داری کے اصول کو اپناتا ہے۔ ثبوتِ جرم کی صورت میں جب مجرم پر دیت واجب ہوجاتی ہے تو اس کی ادائیگی فقط اس کی ذات پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ اُس کی "عاقلہ" کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے۔ "عاقلہ" سے مراد وہ افراد کنبہ یا برادری یا ارکانِ گروہ یا تنظیم ہیں جن سے مجرم کا تعلق اس نوعیت کا ہو کہ اسے ارتکابِ جرم کے سلسلے میں ان کی ہمدردی یا اخلاقی مدد حاصل ہوسکتی ہو۔

(ب) اسی طرح عدم پتہ واردات قتل کے سلسلے میں "قسامہ" کا طریقِ کار بھی مشترکہ ذمّے داری کے حکیمانہ اصول پر مبنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاندان یا معاشرے کا ہر فرد اصلاحِ معاشرہ اور انسدادِ جرم میں اپنی ذاتی ذمّے داری کو پوری طرح محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(ج) معروف قول ہے کہ امتناع انسداد سے بہتر ہے اور پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ فتنہ کے سدباب کے لیے اسلام نے مسلمانوں پر بہ حیثیتِ مجموعی مصالحانہ مداخلت اور مساعی واجب

قرار دی ہیں۔ انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم ہ

اسلام نے دورانِ جنگ بھی مخالفین سے عدل و انصاف اور احسان و مروت کے ساتھ پیش آنے کی تاکید کی ہے۔ ارشاد ہے:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین ہ

"اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے نہ نکلو۔ واقعی اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے"۔

حتیٰ کہ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اگر دشمنانِ اسلام خلوص سے صلح جوئی پر آمادہ ہوں تو تم بھی صلح کے لیے اتنا ہی جھکاؤ پیدا کرو۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ہ

"اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس طرف جھک جائیے۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھیے۔

اسلام کے نظامِ اخلاقیات میں اجتماعی عدل کے حصول کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر حال میں عہد کی پابندی کی جائے۔ چناں چہ حضورؐ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ شدید ضرورت اور تکلیف کے وقت بھی اپنے عہد کی پابندی اور ایفائے عہد کا پورا ثبوت دیا۔

(الف) آنحضورؐ ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تو بہت سے صحابہ مکہ ہی میں رہ گئے ان میں حضرت حذیفہؓ ابن الیمان اور ابو حسلؓ مکہ سے آ رہے تھے کہ کفار نے انھیں پکڑ لیا اور بالآخر اس شرط پر چھوڑا کہ وہ دونوں جنگ میں آپؐ کا ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ لوگ مقامِ بدر میں آپؐ کی خدمت میں پہنچے اور خود حضورؐ کو اس جنگ میں مصروف دیکھ کر اس سعادت میں حصہ لینے کی آرزو کی تو آنحضرتؐ نے حالات کی نزاکت کے باوجود فرمایا تم دونوں واپس جاؤ تم معاہدہ کر چکے ہو اس کی پابندی ضروری ہے۔ ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے۔ ہمیں صرف خدا کی مدد درکار ہے۔

(ب) صلح حدیبیہ میں حضرت ابوجندلؓ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں، تمام مسلمان اس دردانگیز منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا: اے ابوجندل، صبر کرو ہم بدعہدی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے عنقریب کوئی رستہ نکالیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

آجر و اجیر

اخلاقیاتِ نبویؐ کی روشنی میں روابط

جناب محترم ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی

آج دنیا عالمی سطح پر جن اہم مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ آجر و اجیر کے روابط کو سازگار اور خوشگوار کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف حکومتیں اپنی اپنی سطح پر اور عالمی ادارۂ محنت بین الاقوامی سطح پر، درپیش مسائل کو حل کرنے کے لیے جو تگ و دو کر رہے ہیں اس سے بھی اس مسئلے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عصرِ حاضر کے تمام تر قومی اور بین الاقوامی مساعی مسئلے کو بطریق احسن حل کرنے سے قاصر رہی ہیں۔

دوسری طرف تاریخ اس امر پر شاہد عادل ہے کہ اس مسئلے کو آج سے چودہ سو برس پہلے جس انداز سے رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے حل فرمایا اس کی نظیر ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اور اخلاقیاتِ نبوی میں پیش کردہ زرّیں اور رہنما اصول نے اسے جس مقام پہ لا کھڑا کیا ہے قیامت تک آنے والی نسل انسانی میں آجر و اجیر کے باہمی روابط کی خوشگواری کا اس سے بڑھ کر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں ذہنوں میں فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہم یہ دعوا شاید اس عقیدت کی بنا پر کر رہے ہیں جو ہمیں رسول عربیؐ سے ہے اور ذہنوں میں یہ سوال اس لئے ابھرتا ہے کہ ہم نے اپنے ادراک و شعور کی آنکھ ایک ایسے ماحول میں کھولی جبکہ تہذیب مغرب کی چکا چوند نے ہمارے اذہان و قلوب کو مرعوب کر رکھا تھا۔ اور ہمیں ہر بھلائی مغرب کے پیش کردہ افکار و تصورات میں نظر آتی تھی۔ اور اسلام، بانیٔ اسلامؐ اور اسلامی اصول و تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے معذرت آمیز (APOLOGETIC) رویہ اختیار کرنا ہماری عادت میں داخل ہو چکا تھا۔ الحمد للہ کہ چودھویں صدی ہجری نے جہاں مسلمانوں کے عروج و زوال کی بہت سی داستانیں پیچھے چھوڑی ہیں وہاں عالم اسلام میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔ اور مسلمانوں میں ملّی شعور اور ملی تشخص کو بھی یک گونہ ابھارا ہے۔ اور اب ملتِ اسلامیہ ایک بار پھر قرآن حکیم کے حکمت و بصیرت سے معمور خزانوں اور اخلاقیات نبویؐ کے زرّیں اصول کی طرف ملتفت ہو رہی ہے۔ عالم اسلام کی اس بیداری کے ساتھ ایک خوشگوار پہلو یہ بھی

ہے کہ عصرِ حاضر میں مستشرقین جن کی آنکھوں میں اسلام کا گلِ شاداب کانٹے کی طرح چبھتا ہے اور وہ اسلام، ہادیٔ اسلامؐ اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں زہر اگلنے میں مصروف رہے ہیں اور اب بھی ہیں، کہیں کہیں اُن سے بھی حرفِ اعتراف بے ساختہ سرزد ہو جاتا ہے چنانچہ ہارٹ (HART) نے حال ہی میں پوری تاریخ عالم میں سے جن سو مشاہیر کا انتخاب کیا ہے ان میں رسولِ عربیؐ کو سرِ فہرست رکھا ہے اور اس کی توجیہہ یہ پیش کی ہے:

MY CHOICE OF MUHAMMAD TO LEAD THE LIST OF THE WORLD'S MOST INFLUENTIAL PERSONS MAY SURPRISE SOME READERS AND MAY BE QUESTIONED, BUT HE WAS THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMELY SUCCESSFUL ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS.

(THE 100, NEWYORK 1978, PP 33)

اس اقتباس سے رسالت مآبؐ کی شان و عظمت کا بیان مقصود نہیں۔ بھلا جسے اس وسیع و بیکراں کائنات کے خالق و مالک نے رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین کافۃ للناس، للعالمین نذیرا، سراجاً منیرا اور انک لعلیٰ خلق عظیم کے پُرعظمت الفاظ سے نوازا ہو اسے کسی اور ستائش کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ میرا اس حوالے کو پیش کرنے سے اصل مقصود یہ ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات کا تابناک جوہر یہ ہے کہ آپؐ نے مادی اور روحانی دونوں تقاضوں کی بطریقِ احسن تکمیل فرمائی۔

مغرب کی روشنی میں

اخلاقیات نبویؐ کی روشنی میں آجر و اجیر کے خوشگوار روابط کا تقابلی جائزہ لینے کے لیے مناسب ہوگا کہ مغرب کی متمدن دنیا میں آجر و اجیر کے تعلقات پر تاریخ کے آئینے میں ایک نظر ڈال لی جائے۔ علامہ اقبالؒ نے بجا طور پہ مزدور کے اوقات تلخ ہونے اور سرمایہ دار کے ہاتھوں انتہائی سادگی سے مات کھانے کی نشان دہی فرمائی تھی۔ چنانچہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور سے چودہ[14]

سے لے کر سولہ[16] سترہ گھنٹے اور بعض اہم مواقع پر مسلسل بیس[20] گھنٹے یا اس سے بھی زائد عرصے تک کام لیا جاتا، انھیں اُجرت کم دی جاتی، ان کے رہنے کے لیے چھوٹی سی کوٹھری دی جاتی جو غلاظت و عفونت کی وجہ سے جہنم زار ہوتی (دیکھیے حفظ الرحمٰن سیوہاروی: اسلام کا اقتصادی نظام، ملتان، ۱۹۵۱ء ص ۴۲۶)

اب سے قریباً دو صدیاں پہلے ۱۷۷۶ء میں آدم سمتھ نے مزدوروں کے لیے MOTIVATIONAL TECHNIQUES کے طور پر تنخواہوں کے سلسلے میں حوصلہ افزائی (WAGE INCENTIVE) نفع میں حصہ داری، فیکٹری کے چلانے میں ملازمین سے مشاورت طرز کی اصلاحات کو متعارف کرایا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ہی رابرٹ اوون (ROBERTOWEN) نے جس کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے تھا محنت کشوں کی معاشی اور معاشرتی بہبود کے لیے دلچسپی لی۔ اس نے یہ اعلان کیا کہ مزدوروں کو ایک کموڈیٹی (COMMODITY) تصور نہ کیا جائے۔ گویا محنت کشوں کو انسان کے بجائے عام اشیا گرداننے کے تصور کو اٹھارویں صدی کے اواخر میں چیلنج کیا گیا۔

۱۸۳۲ء میں چارلس بیبج (C. BABBAGE) نے پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے آجر و اجیر کے باہمی مفادات کے تحفظ اور اشتراک و تعاون کی آواز بلند کی۔ ۱۸۸۰ء میں مغرب میں ٹریڈ یونین نے رواج پایا۔ لیکن امریکا میں اس کے خلاف خاصی مہم جاری رہی حتیٰ کہ ۱۹۳۵ء میں ویگنر ایکٹ (WAGNER ACT) میں اسے کچھ مثبت حوصلہ افزائی مل سکی۔ ۱۹۴۰ء میں اجیروں کے ساتھ روابط کو اور زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ حال ہی میں یعنی ۱۹۶۲ء میں امریکہ کے صدر کنیڈی نے ایک آرڈر کے ذریعہ سے اجتماعی سودا کاری (COLLECTIVE BARGAINING AGENTS) کے منتخب نمائندے کو امور حکومت میں شریک کیا۔ ۱۹۶۴ء میں (CIVIL RIGHTS ACT) نے اجیروں کی اہمیت کو مزید استحکام بخشا، اور اب مغربی دنیا میں جہاں مزدوروں کو بے جان مشینوں کی سی حیثیت حاصل تھی اب یہ احساس اُبھرنے لگا ہے کہ انسان مشین سے زیادہ اہم ہے۔ یہ تو تھا مغربی دنیا میں آجر و اجیر کے روابط کا مختصر نقشہ جس پر اہل مغرب اور مغربی تہذیب سے مرعوب حضرات نازاں ہیں اور بعض نے تو یہاں تک کہہ ڈالا کہ مزدوروں کی فلاح و بہبود میں پروٹسٹنٹ اخلاقیات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسلام کی روشنی میں

اب ہم اخلاقیاتِ نبوی کی روشنی میں آجر و اجیر کے روابط کا جائزہ لیتے ہیں :

آجر و اجیر کے الفاظ کا مفہوم بے حد وسیع ہے۔ اجیروں میں سرکاری، نیم سرکاری، غیر سرکاری اداروں میں کام کرنے والے جملہ ملازمین، افسروں سے کلرکوں بلکہ نائب قاصدوں تک، تجارتی اداروں میں کام کرنے والے کارکن، ملوں اور فیکٹریوں کے مزدور، چند دنوں بلکہ چند ساعتوں کے لیے اجارے پر کام کرنے والے سبھی لوگ شامل ہیں۔ اگرچہ ہر ایک کا دائرۂ کار مختلف ہوتا ہے، بعض کو قیادت و سیادت، نگرانی اور تنظیم کے فرائض انجام دینا ہوتے ہیں بعض لوگوں میں فنی مہارت و دسترس مطلوب ہوتی ہے، بعض کو دماغی کاوش سے کام لینا ہوتا ہے، بعض سے جسمانی مشقت کا کام لیا جانا مقصود ہوتا ہے۔ اخلاقیاتِ نبوی میں عمومی طور پر وہ اساسی رہنما زریں اصول دیے گئے ہیں جن کی روشنی میں حالات و زمانہ کی رعایت سے، کام کی نوعیت اور اجیر کی صلاحیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام درجات کے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ آجر و اجیر کے روابط کے بے شمار متنوع مسائل کی گہرائیوں میں جانا مقصود نہیں اور نہ یہ مختصر وقت اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ان مسائل کی پانچ بڑی صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ اجیر کی تقرری (سلیکشن کے معیار اور انٹرویو) کے مسائل۔

۲۔ اجیر کے حقوق و مراعات کے مسائل۔

۳۔ آجر کے حقوق کے مسائل۔

۴۔ آجر و اجیر میں تنازعہ پیدا ہونے کی صورت میں مسائل۔

۵۔ آجر و اجیر کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے اساسی اصول۔

سب سے پہلے ہم اجیر کی تقرری کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰؑ اور شیخ مدین کے باہمی معاملے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝

(۲۸ : ۲۶ – ۲۷)

اس ارشاد خداوندی میں مندرجہ ذیل پانچ بڑے رہنما اصولوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے:

ا۔ اجیر جسمانی اعتبار سے قوی ہو (PHYSICAL FITNESS)

۲۔ اس میں دیانت و امانت کا جوہر موجود ہو (ہمارے ہاں کیرکٹر سرٹیفکیٹ کا رواج تو ہے لیکن وہ محض ایک رسم (FORMALITY) ہے اسلام اسے عملی اور حقیقی صورت دینا چاہتا ہے۔

۳۔ آجر اجیر کو کام کی نوعیت اور مدتِ کار کو واضح طور پر بیان کر دے۔

۴۔ آجر اجیر کو اس امر کی یقین دہانی کرا دے کہ کام اس کی ہمت سے بڑھ کر نہیں لیا جائے گا۔ جیسا کہ وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ سے واضح ہے۔

۵۔ آجر اور اجیر دونوں ایک دوسرے سے اخلاص اور حسن عمل کا یقین دلائیں جیسا کہ شیخ مدین نے ستجدنی ان شاء اللہ من الصلحین اور حضرت موسیٰؑ نے واللہ علی ما نقول وکیل کہہ کر یقین دلایا۔ دور حاضر میں مقاصد کے ساتھ وابستگی اور خلوص کے اظہار کے لیے اسے حلف برداری کا نام دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح قرآنِ حکیم نے حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کے باہمی معاملے کو ذکر کیا ہے:

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ○

(۱۲ : ۵۵)

اس سے یہ موٹی سی بات واضح طور پر مستنبط ہوتی ہے کہ کسی شخص کی تقرری کے وقت بالخصوص ناظم، قائد، نگران، وزیر، سفیر، پروفیشنل مینجر کی تقرری کے موقع پر، اس کی فنی مہارت اور خصوصی صلاحیت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے دائرۂ عمل میں تمام تر خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔

سورۂ بقرہ میں طالوت کی بحیثیت سپہ سالار و جرنیل تقرری پر جب لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ وہ لینڈ لارڈ اور بنک بیلنس رکھنے والے خاندان کا فرد نہیں تو تقرر کرنے والے نبیؑ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ،

(۲ : ۲۴۷)

مختصر یہ کہ متمول طبقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر نہیں بلکہ تقرری کے وقت کام کی نوعیت کے مطابق اس کی جسمانی اور فنی و علمی صلاحیتوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

علامہ ماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں اور ابو نصر الفارابی نے کتاب آراء اھل المدینۃ الفاضلہ میں ایک حکمران اور امام کی جن خصوصیات کا مفصل ذکر کیا ہے ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان کا مدار یہی آیاتِ کریمہ ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی بیحد ضروری ہے کہ تقرری کے وقت قرآن حکیم اور ارشاداتِ نبویؐ کی روشنی میں عمومی طور پر امیدوار کی صالحیت، ملک و ملت سے اس کی وفاداری اور مقصد سے وابستگی کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ یعنی قابلیت (ABILITY) کے ساتھ ساتھ شرافت (NOBILITY) بھی ملحوظ رہے۔

اجیر کے حقوق

اب ہم شریعت اسلامیہ میں اجیر کے حقوق و مراعات کے مسائل کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ:

۱۔ اجیر کا پہلا حق یہ ہے کہ اس سے اجرت اور کام کی نوعیت کا واضح تعیّن کر دیا جائے (القرآن ۲۸ : ۲۷)

۲۔ اجیر کا دوسرا حق یہ ہے کہ اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی جائے۔ مقصود یہ ہے کہ اس میں فوری ادائی (PROMPT PAYMENT) کا طریق ملحوظ ہو۔ (مشکاۃ المصابیح طبع دمشق ج ۲ ص ۱۳۱)

۳۔ اجیر کا تیسرا حق یہ ہے کہ خواہ مخواہ حیلوں بہانوں سے کام لیتے ہوئے اس پر مختلف ذمہ داریوں کا تاوان ڈالتے ہوئے اسے اُجرت سے محروم نہ کیا جائے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ:

ان تین اشخاص سے جن پر خداوند قدوس قیامت کے روز عتاب فرمائیں گے ایک شخص وہ بھی ہوگا جو اجیر سے پورا کام لے اور پھر اس کی اجرت ادا نہ کرے۔

(اِسْتَاجَرَ فَاسْتَوْفیٰ مِنْہُ وَلَمْ یُعْطِہٖ اَجْرَہٗ)

(صحیح بخاری، طبع مصر، الجزء الثالث ص ۱۱۸)

۴۔ حضورؐ نے مملوک و ماتحت کو جسمانی ایذا (PHYSICAL TORTURE) سے سختی

سے منع فرمایا۔ صحیح مسلم میں اس سلسلے میں متعدد احادیث مروی ہیں۔

۵۔ حضورؐ نے موجودہ دور کے (SUBSISTENCE WAGES) کے تصور کو بہت پہلے پیش فرمایا اور فرمایا:

"اسے کھانا اور لباس فراہم کیا جائے۔ اور ان سے وہی کام لیا جائے جس کی وہ استطاعت رکھتے ہوں"۔ صحیح مسلم میں حضورؐ کا یہ ارشاد ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ وَلَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا يُطِيقُ۔

امام نووی ؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں کھانے اور لباس سے اس کی جملہ ضروریات مراد لی ہیں۔ وَنَبَّهَ بِالطَّعَامِ وَالْكِسْوَةِ عَلَى سَائِرِ الْمُؤَنِ الَّتِي يَحْتَاجُ إِلَيْهَا۔

۶۔ اگر اجیر سے معمول سے زیادہ کام لیا جائے تو اس کی معمول سے زیادہ اعانت کی جائے۔ مثلاً اوور ٹائم بونس۔ انعام وغیرہ کی صورت میں: اضافی معاوضہ دیا جائے۔ صحیح بخاری میں ہے:

فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَأَعِينُوهُمْ (صحیح بخاری، طبع مصر، جلد ۳ ص ۱۹۵)

علاوہ ازیں اجیر کو نفع میں بھی شریک کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ اجیر کا یہ بھی حق ہے کہ اسے اضافی معاوضے، منصبی ترقی (PROMOTION) سے بہرہ ور کیا جائے۔ اور اسے اس کے کام کی نوعیت کے مطابق طبی، رہائشی اور سواری کی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں۔

۸۔ اجیر سے کام اسے مسلمان بھائی سمجھ کر لیا جائے۔ مزدور سمجھ کر اس سے تحقیر آمیز رویہ اختیار کر کے اس کے وقار اور عزتِ نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔

اخلاقیات نبویؐ میں اس ضمن میں متعدد ارشادات ہیں جن میں سے میں نے صرف چند ایک کا ذکر نمونۃً کیا ہے۔

آجر کے حقوق

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اعتدال و توازن سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے اس لیے یہاں

اخلاقیات نبویؐ میں اجیر کے حقوق کو ملحوظ رکھا گیا ہے، وہاں آجر کے حقوق کو بھی پیش نظر رکھنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ مصلح اعظمؐ نے فرمایا ملا آپؐ کا یہ ارشاد صحیح مسلم میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔)

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا نَصَحَ لِسَيِّدِهِ وَأَحْسَنَ عِبَادَةَ اللهِ فَلَهُ أَجْرُهُ مَرَّتَيْنِ۔

ایک اور ارشاد ہے: لِلْعَبْدِ الْمَمْلُوكِ الْمُصْلِحِ أَجْرَانِ۔

قرآن حکیم اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد عمومی ارشادات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اجیر کو آجر کا کام پوری محنت و کاوش اور خوش اسلوبی سے انجام دینا چاہیے اور اس کے مال کو لاپرواہی سے ضائع کرنے یا تغافل و تساہل برتنے سے گریز کرنا چاہیے۔

یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سوشلسٹ نظام میں شدت اور سختی پر مبنی سخت گیر ڈسپلن پایا جاتا ہے تو سرمایہ دارانہ نظام میں اجیر سے کام لینے کے لیے دام تحریص پھیلایا جاتا ہے۔ گویا دونوں نظاموں میں محرک و عامل خارج سے عائد کیا جاتا ہے جبکہ اسلام نے افراط و تفریط سے ہٹ کر۔ نظم و ضبط کے ساتھ ساتھ نیزے کی نوک سے نہیں بلکہ دلوں پر دستک دیکر اندر کے انسان کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ آجر و اجیر کے تعلقات کے لیے ہادیؐ اسلام نے جو عمومی اور اساسی اصول دیے ہیں مثلاً ایمان وایقان کی شمع روشن کرنے کے ساتھ ساتھ اخوت، مساوات، تعاون، ایثار، صبر، توکل، عفو و درگزر، ایک دوسرے کی مدد و اعانت، قیامت کے روز جواب دہی۔ یہ اصول باہمی خوشگواری و سازگاری پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

مسلم لیبر کورٹ

اب ایک انتہائی نازک مسئلے کا ذکر کرتا ہوں کہ یہود کی پھیلائی ہوئی سازش سے جو آن کے پروٹوکال کے پیچھے سے منظر عام پہ آچکی ہے۔ حریت اور حقوق کے نام پہ اجیر کو ہڑتال اور آجر کو تالا بندی پہ اکسایا گیا ہے۔ یہود کے اکابر کا مقصد یہ تھا کہ ہڑتال ہو یا تالا بندی، غیر یہود اقوام میں اس سے پیداواری صلاحیت یقیناً متاثر ہوگی۔ چنانچہ جہاں گزشتہ دور میں صرف بندۂ مزدور کے اوقات کی تلخیوں کا ذکر تھا۔ اب بعض جگہ مزدوروں نے آجروں کے اوقات تلخ کر رکھے ہیں۔ اور ٹریڈ یونین قسم کی تنظیمیں بعض دفعہ جائز

حق منوانے کے بجائے آجر کے استحصال پر اتر آتی ہیں اور ناجائز مطالبات کی فہرست پیش کر کے یہود کی سازش کی عملی معاونت کرتی ہیں۔ اسلام نے نہ تو آجر کو اجیر کے استحصال کی اجازت دی ہے اور نہ ہی اجیر کو آجر کے استحصال کا حق دیا ہے۔ بلکہ اسلام تو عدل و انصاف پر مبنی رویے کو ابھارتا ہے، باہمی تعاون اور انصاف پر مبنی یہی رویہ آجر و اجیر کے تعلقات کو خوشگوار اور سازگار بنا سکتا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر بیحد ضروری ہے کہ اسلام فلاحی انجمنوں کے قیام کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن کسی کے استحصال کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا آجر و اجیر کے مابین سنگین پیدا شدہ مسائل اور تنازعوں کو حل کرنے کے لیے، ہادی اسلامؐ کی تعلیمات کی روشنی میں بہترین صورت ایک مسلم لیبر کورٹ کا قیام ہے جس میں ایسے منصف و قاضی کا تقرر عمل میں لایا جائے جو نہ صرف عادل ہو بلکہ اجارے کے معاملات میں پوری طرح مہارت رکھتا ہو۔ اور شریعت کے تقاضوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اور یہ کورٹ فریقین کے دلائل کو سن کر اعلا اسلامی عدل کی روایات کے مطابق منصفانہ فیصلہ دے۔

میں اپنا مقالہ اس تجویز پر ختم کرتا ہوں کہ آج جب کہ عالم اسلام میں اسلامی نظام حیات کو نافذ کرنے کی مساعی جمیلہ عمل میں لائی جا رہی ہیں ہمیں ملکی سطح پر اور عالم اسلام کی سطح پر علماء، وکلاء اور ماہرین پر مشتمل ایسے تحقیقی بورڈ قائم کرنے چاہئیں جو عصر حاضر کے پیدا کردہ مختلف مسائل پر غور و فکر کر کے اخلاقیاتِ نبوی کی روشنی میں ان کا حل پیش کریں۔ مجھے کام میں مشکلات اور رکاوٹوں کا پورا پورا احساس ہے۔ لیکن یہ عزم رسولِ عربیؐ کا اسوہ ہمیں دعوت فکر و عمل دے رہا ہے۔ اور بقول علامہ اقبالؒ سہ

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی!
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

عدل اجتماعی اور اسلام

جناب محترم مولانا محمد حنیف ندوی

انسانی معاشرے میں عدل و انصاف کی حکایتِ شیریں کا تصور اتنا ہی پرانا اور قدیم ہے جتنا کہ ستم و جور کی داستانِ خوں چکاں کا۔ جب کچھ زبردستوں نے، قوت و اقتدار کے بل پر زیر دستوں کو اپنی حرص و آز کا شکار بنایا۔ اُن کی آزادی کو چھینا، اُن کے شرفِ انسانیت کو مجروح کیا اور چاہا کہ زندگی کی تمام آسائشوں کو اپنے ہی دامنِ طلب میں سمیٹ لیں تو، اُس کے ردِ عمل کی صورت میں، زیر دستوں نے عدل و انصاف کی دُہائی دی، اور ایسے دستورِ حیات کی ضرورت محسوس کی جس سے استحصال کی زنجیریں کٹ جائیں اور ہر انسان نسبتاً آزاد فضا میں سانس لے سکے:

کمزور اور طاقت ور کی یہ آویزش انسانی تاریخ کے اوراق پر اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ آج بھی فکر و تحقیق سے بہرہ مند حضرات مذاہب و سیر کی کتابوں میں اُس کی جھلکیاں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے اِس جھگڑے میں پہل اُن لوگوں کی طرف سے ہوئی جو دولت و اقتدار کی مسندوں پر قابض رہے اور ہمیشہ اس پوزیشن میں رہے کہ اپنی بالادستی کو دوسروں سے منوا سکیں۔

تقویٰ و برتری کے اِس نشے میں یہ لوگ اِس حقیقت کو بُھول گئے کہ زندگی کی نشاط آفرینیوں میں سب کا حصّہ ہے اور کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں کو گرا اور پچھاڑ کر آگے بڑھے اور تمام وسائلِ حیات پر قابض و مسلّط ہو کر بیٹھ جائے۔

عدل و انصاف کی طرف اُنھی لوگوں نے توجہ دلائی جو زمانے کے ہاتھوں زخم رسیدہ تھے اور جن میں شرفِ انسانی کی بازیابی کا جذبہ زندہ اور بیدار تھا، اور جو اس شعور سے بہرہ ور تھے کہ انسان کائنات ہی کا جزِ لاینفک ہے اور کائنات کا پورا نظام چُوں کہ توازن و عدل کی کارفرمائیوں پر منحصر ہے اس لیے ضروری ہے کہ انسانی معاشرہ بھی قدرت کے اس اصول پر استوار ہو۔

عدل و انصاف کی یہ آواز دھیمے سُروں میں ہر عہد میں بلند ہوتی رہی اور درد مند دِلوں کو متاثر کرتی رہی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسی آواز کی بنا پر مختلف ادوار میں فقہ و تقنین کے دساتیر مدوّن ہوتے رہے جن میں سچائی، دیانت، انسان دوستی اور عدل و انصاف کی برابر تلقین کی گئی۔ اس لیے یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ گزشتہ صدیوں میں جتنے بھی رہبر و راہ نُما آئے سب نے زبردستوں کے فلسفۂ حیات کی تائید کی اور شرائع و قوانین کے ذریعے گھوم پھر کر انھی لوگوں کی ہم نوائی کی جنھوں نے پہلے سے قوت و اقتدار کی فراوانیوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔

یہ مفروضہ شدّتِ احساس کا نتیجہ ہے ورنہ حقیقتِ حال اس سے بالکل مختلف مختلف ہے۔

کیا آپ نے کنفیوشس کی حکیمانہ تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے؟ حمورابی کے قوانین کا جائزہ لیا ہے؟ بدھ کی ہدایات کو دیکھنے کی زحمت فرمائی ہے؟ افلاطون کے مکالمات پر غور کیا ہے؟ اور سب سے آخر میں مادیت و تعصب کی عینک کو اُتار کر کبھی آپ نے انبیا علیہم السلام کے پیغام و دعوت کی رُوح کو جاننے اور اُس میں مذکور اُن تعلیمات کو فکر و نظر کا ہدف بنانے کی کوشش کی ہے جن کا ایک ایک لفظ نہ صرف سچائی دیانت اور رشد و ہدایت پر مبنی ہے بلکہ کُھلے بندوں انسان دوستی اور عدل و انصاف کے جذبوں کا آئینہ دار ہے؟

ان مآخذ سے صاف عیاں ہے کہ ہر عہد میں ظلم و تعدّی، غرور و استکبار اور دوسری معاشرتی برائیوں کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے، اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ قوانین و شرائع کے دھاروں کو ہم دردی و محبت سے معمور خوش آئند وادیوں کی جانب موڑا جائے اور تفرقہ و امتیاز کے اُن فاصلوں کو کم کیا جائے جن کو اختیار و اقتدار یا سرمایہ و دولت کی فراوانیوں نے خواہ مخواہ بڑھا رکھا تھا۔

اس حقیقت سے قطع نظر اس سلسلے میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ماضی میں طرح طرح کے ظلم ہوتے رہے۔ اور زبردستوں نے ہر جانب سے زیر دستوں کا عرصۂ حیات تنگ کیے رکھا۔ لوگوں سے زمینیں چھینی گئیں۔ آسائشیں ہتھیائی گئیں۔ مارا پیٹا گیا۔ غلام بنایا گیا۔ ہر طرح ذلیل و خوار کیا گیا، لیکن اس پر نہ تو کوئی دل پسیجا، نہ کسی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نہ کسی حکیم، دانش ور اور پیغمبر کی زبان سے کوئی حرفِ شکایت ہی نکلا۔

کیا یہ بات ماننے کے لائق ہے کہ ماضی میں دل احساسات سے یک قلم تہی ہو گئے تھے اور دیدۂ بینا نے واقعات کی سنگینی کو دائرۂ ادراک میں لانے سے انکار کر دیا تھا؟ اسے یوں کہنا البتہ قرینِ عقل وصواب ہے کہ ہر دور میں عدل وانصاف کے پیمانے مختلف رہے۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ گناہ کو ثواب سمجھا گیا اور ناانصافیوں پر انصاف کی چھاپ لگا دی گئی۔

اختلاف کی یہ نوعیت یکسر تعبیر اور اطلاق کے دائرے میں شمار ہوتی ہے جس کا زیادہ تر تعلق ہر دور کے معاشرتی حالات اور تاریخ کی مجبوریوں اور کروٹوں سے ہے، چناں چہ تاریخِ انسانی میں اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ آج جو چیزیں پہلی نظر میں ہمیں غیر انسانی، ظالمانہ اور عدل وانصاف کے منافی نظر آتی ہیں اُن کو ماضی کے چوکھٹے میں عین عدل وانصاف جان کر اختیار کیا گیا۔

ارسطو کتنا بڑا حکیم تھا اور عقلی اعتبار سے اُس کا دور کس درجہ روشن اور تاب ناک تھا۔ اس کے باوصف غلام اور عورت کے بارے میں اس کی یہ دو ٹوک رائے تھی کہ یہ کسی ہمدردی کے مستحق نہیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ عورت، گھوڑا اور غلام صرف چابک کی زبان سمجھتے ہیں۔ افلاطون نے "ریپبلک" میں یہ کوشش کی کہ ایسے منصفانہ اور حکیمانہ معاشرے کی تشکیل کی جائے جس میں کوئی اونچ نیچ نہ پائی جاتے، اور جس میں زن، زر اور زمین کی وجہ سے اُبھرنے والے تمام مفاسد کا اس طرح قلع قمع کر دیا جائے کہ ان چیزوں سے سرے سے کوئی دل چسپی ہی باقی نہ رہے۔ اور اس کی صورت یہ تجویز کی کہ ان تمام چیزوں کو قومی ملکیت کے دائرے میں داخل کر دیا جائے۔ عورت زمین اور تمام پیداواری عناصر کے حصول واستفادہ میں سب شریک ہوں اور کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہ رہے۔ تاکہ اُن کی وجہ سے جو ناانصافیاں ہوتی ہیں وہ آپ سے آپ دُور ہو جائیں۔ معاشرتی انصاف کا یہ غالیانہ تصور اُن حالات وظروف کا قدرتی ردِعمل تھا۔ جن میں رشوت، استحصال اور اقربا پروری کا مرض یونانی معاشرے کی رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا اور نیچے سے لے کر اوپر تک ہر شخص ان جرائم کا عادی بن چکا تھا۔ اس پر ارسطو نے جو کڑی تنقید کی، فلسفے کا ہر طالبِ علم اس سے آگاہ ہے۔ گل برٹ (GILBERT) نے عدل وانصاف کے اس حکیمانہ مرقع میں فرد سے جو ناانصافی روا رکھی گئی اُس کی نشان دہی ان الفاظ میں کی کہ جس معاشرے میں کوئی شخص کسی بھی

چیز کا مالک نہیں اُس معاشرے میں گویا کوئی مکمل شخص پایا ہی نہیں جاتا۔

اجتماعی عدل (SOCIAL JUSTICE) کی اصطلاح کا اوّل اوّل استعمال ایک صُوفی فلسفی سائمن (SIMON) نے کیا، اور اس سے اُس کی مراد یہ تھی کہ سرمایہ کے ارتکاز نے انسانیت کو جو دو مستقل طبقوں میں بانٹ رکھا ہے اور اس کے نتیجے میں غریب اور زیادہ غریب اور دولت مند اور زیادہ دولت مند ہوتا جارہا ہے اس کے ازالے کے لیے کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے معاشرے میں اُبھرنے والی ناہمواریاں دُور ہوجائیں اور ہر شخص اپنی محنت اور ذاتی سعی و کوشش کے ثمر سے براہِ راست استفادہ کرسکے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرد زندگی کی ضروری آسائشوں سے محروم نہ رہے اور کوئی گروہ یا فرد اس لائق نہ ہو کہ دوسروں کی محنت و عرق ریزی کا استحصال کرسکے اور محض اپنے جیب و داماں کو بھرنے کی خاطر اُس طبقے کو مفلس اور کنگلا کردے جو اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر وطن و قوم کے معیارِ زندگی کو بلند کرتا ہے اور تہذیب و تمدن کے چہرۂ زیبا کو تابش و ضو عطا کرتا ہے۔ سائمن نے اس غرض کی تکمیل کے لیے یہ سادہ سا اصول وضع کیا کہ اقتصادیات کو اس طرح سے ترتیب دینا چاہیے کہ معاشرے کا ہر فرد اپنے عمل اور مقدرت کے مطابق معاوضہ وصول کرسکے۔ سائمن کے بعد اُس کے شاگرد لی راکس (LERAUX) نے اسے سوشل اِزم کے قالب میں ڈھال دیا جس کا ترجمہ ازراہِ سہل انگاری اشتراکیت کیا جاتا ہے۔ حال آں کہ اس کا صحیح ترجمہ اشتراکیت نہیں اجتماعیت ہے، لیکن یہ ترجمہ چُوں کہ چل نکلا ہے اس لیے ہم آئندہ سطور میں اسی کو استعمال کریں گے۔

اجتماعی عدل کی اصطلاح اگرچہ اٹھارویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے جس کا احساس ہر دور میں رہا اور ہر زمانے میں غربت و محرومی کی شدّتوں کو دور کرنے اور آسائش و کشادگیِ رزق کے امکانات کو بڑھانے کی تدبیریں بہ رُوئے کار لائی گئیں اور اس کے قیام و فروغ پر خصوصیت سے زور دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ادیانِ سماوی میں عدل و انصاف کی قدروں کی تبلیغ کی گئی اور قرآنِ حکیم کے نزدیک تو اس کا رشتہ روحانیت کے اس مقامِ بلند سے جوڑا گیا جسے لفظِ تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اِعدِلُوا هُوَ اَقرَبُ لِلتَّقوٰی

جس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی معاشرہ اُس وقت تک تقرّبِ الٰہی کی سرحدوں کو نہیں چھُو سکتا جب تک وہ اجتماعی رشتوں کو عدل و انصاف کی بنیادوں پر قائم کرنے کی سعی نہیں کرتا۔

یوں تو عدلِ اجتماعی کا دائرہ وسیع تر ہے اور اس میں خاندان، قبیلہ، گروہ، وطن، قوم اور عالمِ انسانیت سمیت زندگی کے تمام شعبے شامل ہیں جو باہمی تعلقات میں مربُوط ہیں، تاہم خصوصیت سے ایک مسئلہ ایسا ہے جس کے حل وکشود کے سلسلے میں آج ہم چند معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ کون سے اصول اور پیمانے ہیں جن کو ملحوظ و مرعی رکھنے سے دولت کی منصفانہ تقسیم کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اختصار کے ساتھ ہم اسلام کے اقتصادی نظام کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کا اقتصادی نظام

اسلام کے اقتصادی نظام کے خدوخال کیا ہیں، یہ کس طرح دولت کے ارتکاز کو روکتا ہے اور کیوں کر زندگی کی نشاط آفرینیوں کو معاشرے کے تمام افراد پر پھیلاتا اور عام کرتا ہے، ان تفصیلات کو بیان کرنے سے پہلے ہم اسلام کے چند بنیادی اصولوں کو واضح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) اسلام چُوں کہ زندگی کو ایک وحدت اور کُل (WHOLE) تصور کرتا ہے اور کسی بھی اشکال کو اُس کے کُل اور اُس کے منطقی لوازم سے علاحدہ کر کے دیکھنے کا عادی نہیں، اس بنا پر وہ اقتصادیات کو محض اقتصادیات قرار دے کر اُس کے حل وکشود کی راہیں متعین نہیں کرتا بلکہ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالتا ہے اور ان تمام رُوحانی وعقائدی لوازم کو ملحوظ و مرعی رکھ کر اُس کے تسلّی بخش حل کی جانب تحقیق و تفحص کے قدم بڑھاتا ہے جن سے اس سلسلے میں کوئی موثر مدد مل سکتی ہے۔

(۲) اس بنا پر اس کے نزدیک زندگی کے تمام گوشوں کو سنوارنے اور سجانے کے لیے از بس ضروری ہے کہ اس ربِّ کائنات پر ایمان لایا جائے جس نے زندگی کے اس دبستان کی تخلیق کی ہے۔ اس رُوحِ کائنات سے محبّت وشیفتگی کے رشتوں کو استوار کیا جائے اور اس عقیدے کو حرزِ جاں بنایا جائے کہ ہمارا ہر ہر عمل اُس کی نگاہِ احتساب کے رُو بہ رُو

ہے۔

(۳) آخرت کے تصور کو نہ صرف ماننا ضروری ہے بلکہ اُس کو اس طرح دل کی گہرائیوں میں اُتارنا چاہیے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں ایک موقف، ایک اندازِ سلوک اور ایک متعین اسلوب کی شکل میں ڈھل جائے۔ اس تصور سے یقین و اذعان کی یہ کیفیت قلب و ذہن کی لوح پر اُبھرنا چاہیے کہ ایک دن حضرتِ حق کا سامنا کرنا اور اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔

(۴) دین کی جڑ اور رُوح کے بارے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا تعلق، تاثر و گداز کے اُن احوال سے ہے جو انسان کے باطن میں دردمندی، احسان اور خدمت ایسے جذبات و احساساتِ لطیفہ کو بیدار کر دیں کہ یہی بیداری دراصل دین ہے اور یہی سچی نیکی ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے:-

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۝

اس کا ترجمہ یہ ہے:

"نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف مُنہ کرلو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر، اور فرشتوں پر، اور اللہ کی کتاب پر، اور پیغمبروں پر ایمان لائیں، اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتے داروں اور یتیموں اور محتاجوں کو اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کو چھڑانے میں خرچ کریں۔"

ہم کسی خارجی دباؤ اور ظاہری پابندیوں سے کہیں زیادہ موثر و فعال اس باطنی کیفیت کو قرار دیتے ہیں جو ایمانیات سے عبارت ہے، کیوں کہ یہی وہ شے ہے جو دلوں کو بدلتی ہے، اور عمل و کردار میں اخلاص کی رُوح پھونکتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو احساسِ فرض کے داعیوں کو اُکساتی اور بڑے بڑے مقاصد اور منصوبوں کو پروان چڑھانے کی ضامن ہے۔ نیز یہی وہ حقیقت ہے جو انسانوں کو مجبور کرتی ہے کہ بغیر کسے

سننے یہ آپ سے آپ اپنے کام اور عمل کی قدر و قیمت کو پہچانیں اور اپنی مفوضہ خدمات کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیں۔ قوانین، ضابطے اور بیرونی نظام کی حکم رانی صرف جسم کی حد تک وسعت پذیر ہے دل کی حد تک نہیں، اور جسم کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ یہ پرلے درجے کا حیلہ جُو ہے۔ دل کی دنیا میں قاعدے اور قانون کی حکم رانی نہیں چلتی، اس اقلیم میں صرف اللہ ہی کی حکم رانی کا سکہ رواں ہے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب تک دلوں میں اللہ کی محبت، انسان دوستی اور اندیشۂ عاقبت کا جذبہ کارفرما نہ ہو ناممکن ہے کہ لوگوں میں دیانت، احساس فرض، اور ایثار و محبت ایسے لطیف جذبات کو فروغ دیا جاسکے، جن کے ذریعے سے کام سے لگن اور محنت سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر نہاں خانۂ دل میں ایمان کی مشعلیں روشن ہیں تو پھر بغیر کسی محرضِ مادّی (INCENTIVE) کے احساسِ فرض کا وہ داعیہ دلوں میں بیدار ہوجاتا ہے جسے کانٹ (KANT) اصل نیکی قرار دیتا ہے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے خوارق ایثار کو دیکھیے کہ انھوں نے اپنے بھائیوں کے لیے محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اور کسی لگے بندھے فلسفۂ معاشیات کو جانے بُوجھے بنا کیا کچھ نہیں کیا۔ انصار نے کس طرح مہاجرین کو اپنے مال و دولت اور کاروبار میں شریک کیا اور کس طرح اُن کے لیے اپنے گھروں کے دروازے یکسر کھول دیے! پھر کیوں کر باہم مِل جُل کر اُنھوں نے مواخات اور بھائی چارے کی خوش گوار فضا پیدا کی۔ اور اُس کے نتیجے میں ماں جائے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے غم گُسار اور ہمدرد بن گئے۔ یہ صورتِ حال کسی نظام سے زیادہ اُس کیفیت کی رہینِ منّت تھی جو ایمانیات اور صرف ایمانیات کی بدولت معرضِ ظہور میں آتی ہے۔ اور دلوں میں تاثر و گداز کے حسین و جمیل شگوفوں کی پرورش کا اہتمام کرتی ہے۔

صحابہؓ کے ایثار و ہمدردی کے اُن خوارق کو دیکھیے اور بتائیے کہ اللہ تعالیٰ کو مانے بغیر اور اُس سے محبّت کیے بنا انسان دوستی کے یہ لطیف جذبات قلب و باطن کی سطح پر کسی صورت میں اُبھر سکتے ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ اسلام لانے سے پہلے یہ چالیس ہزار درہم کے مالک تھے، لیکن ہجرت کے بعد اُن کے پاس پانچ ہزار درہم سے زیادہ اندوختہ نہ تھا۔ اُن کی تمام آمدنی، جو تجارت سے حاصل ہوئی، کم زور اور حاجت مند مسلمانوں پر خرچ ہوتی رہی۔

حضرت عمرؓ ابتدا ہی سے مالدار نہ تھے۔ خیبر میں البتہ تھوڑی سی زمین تھی جس پر اُن کی گزر بسر کا دار و مدار تھا۔ لیکن اس کی آمدنی کو بھی انھوں نے غلاموں اور کم زور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی خاطر وقف کر دیا۔

حضرت عثمانؓ بے شک غنی تھے، مسندِ خلافت پر فائز ہونے سے پہلے اُن کے جُود و سخا کا یہ عالم تھا کہ ایک ہزار اونٹ اور اُن پر لدا ہوا کھانے پینے کا سامان، سب مسلمانوں پر نچھاور کر دیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مسلمان سخت قحط سے دوچار تھے۔ ان حالات میں اگر حضرت عثمانؓ چاہتے تو اُن کو اِس مال کے منھ مانگے دام مل سکتے تھے۔

اسی طرح حضرتِ علیؓ اور اہلِ بیت کے ہاں انسان دوستی اور غربا پروری کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے تغذیہ کے لیے صرف تین روٹیاں پاتے تھے اور بسا اوقات ان تین روٹیوں کو بھی حاجت مندوں اور سائلوں میں بانٹ دیتے تھے۔

فیّاضی، ایثار اور نوعِ انسانی سے گہری محبّت کے یہ عظیم مظاہر اس بنا پر تھے کہ باطن میں موج زن اللہ کی محبت کے جذبے نے اُن کے دلوں میں تاثر و گداز کے اُن سرچشموں کو رواں دواں اور جاری کر دیا تھا جن کے فیوض سے غریب و نادار مسلمانوں کی کشتِ مراد بھی سرسبز و شاداب رہی۔ کہنا یہ ہے کہ کسی معاشی تنظیم سے پہلے یہ ضمانت ضروری ہے کہ معاشرے میں اللہ پر ایمان، اور اندیشۂ عاقبت کے جذبات و عواطف کی پرورش کی جائے، کہ یہی وہ پہلی اینٹ اور اساس ہے جس پر ہماری زندگی کی پُوری عمارت استوار ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اقتصادیات کے دائرۂ بحث میں ایک معاکسیا دوہری مشکل (DILEMMA) یہ رونما ہے کہ اگر حصولِ سرمایہ پر کوئی قدغن عائد نہ کی جائے اور کاربار کو حریّتِ تصرّف (LAISSEZ FAIRE) کے اصول کے مطابق بغیر کسی روک ٹوک کے پھلنے پُھولنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تو اُس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار سرمایہ گھوم پھر کر چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جاتا ہے، جس سے طرح طرح کی اجتماعی بُرائیاں اور مفسدے اُبھرتے ہیں اور معاشرہ امیر و غریب کے دو حریفانہ کیمپوں میں بٹ جانے کی وجہ سے مستقل طبقاتی آویزش اور گروہی اختلافات کا ہدف بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اگر

اس کے برعکس سرمائے کو انفرادی ملکیت کی تنگ نائے سے نکال کر قومی ملکیت کے وسیع تر قبضے میں دے دیا جائے تو اس سے نہ صرف وہ ذاتی محرض (INCENTIVE) ختم ہو جاتا ہے جو افراد کو ملّت کے معاشی مفادات کے پیشِ نظر محنت اور سخت کوشی پر اُبھار سکتا ہے بلکہ اس سے فرد اپنے عمرانی تشخص ہی کو کھو بیٹھتا ہے، کیوں کہ اگر کوئی شخص اپنے معاشرے میں اپنی زمین کا مالک نہیں، اپنے گھر کا مالک نہیں، پیداواری ذرائع سے استفادے کا مجاز نہیں اور اپنے ہی سرمائے کو اپنے مقصد کے ماتحت خرچ نہیں کر سکتا تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں اُس کا سرے سے کوئی رول ہی نہیں، اور وہ محض جان دار اور ذی شعور گوشت پوست کا ایک کل پُرزہ ہے جو اجتماعی مشین میں فِٹ کر دیا گیا ہے! اسے یہ حق نہیں کہ خود اپنے لیے اور اپنے خاندان اور اپنے بال بچوں کے لیے راحت و آسائش کا کوئی بندوبست کر سکے۔

اس ہلاکت یا دوہری مصیبت سے بچ نکلنے کی ایک ہی راہ ہے جسے ہم بیچ کی راہ کہہ سکتے ہیں، اور وہ راہ وہ ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے، یعنی اقتصادیات میں نہ تو سرمایہ دار کو کھلی چھٹی دی جائے کہ وہ صبح و مسا اپنی تجوریاں بھرتا رہے اور دولت کے ڈھیر اور انبار جمع کرتا رہے جب کہ ملک کے عوام افلاس اور جہالت ایسے جاں گسل مصائب سے دوچار ہوں اور نہ ذرائعِ پیداوار کو کلیتاً بیوروکریسی اور ہیئت حاکمہ کو اس طرح سپرد کر دیا جائے کہ وہ حاکمِ مطلق کے رُوپ میں بنی نوعِ انسان کے مقدر سے کھیلنے لگیں جو اس کے نتیجے میں مفلس اور بے دست و پا ہو کر رہ جائیں۔

قرآنِ حکیم کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ مارکس اور انقلابِ فرانس سے صدیوں پہلے، یہ کتابِ ہدیٰ ارتکازِ دولت کے اس خطرے سے یہ کہہ کر نوعِ انسانی کو متنبہ کرتی ہے کہ زنہار کبھی دولت و سرمایہ کو معاشرے کے کسی طبقے میں مرتکز نہ ہونے دینا۔

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"تاکہ مال اُن لوگوں کے ہاتھ میں گردش نہ کرتا رہے جو تم میں دولت مند ہیں"

مال و دولت کو خون کی طرح، جسمِ اجتماعی کی ہر رگ و پے میں جاری و ساری رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن جائز تجارت، دیانت دارانہ کاروبار، اور اسلام کے حدودِ اخلاق کے اندر رہ کر ازدیادِ سرمایہ کی کوششوں کو سراہتا ہے۔

وَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ

"پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل تلاش کرو۔"

یہ تو اصول ہوا، اسلام نے دونوں نقطہ ہائے نظر میں تطبیق دینے، باہم توازن و توافق پیدا کرنے اور افراط و تفریط کے مابین اُس درمیانی راہ کو اختیار کرنے کی تلقین کی جس پر چلنے سے نہ فرد کی نشاط آفرینیوں پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ سرمایہ چند ہاتھوں میں سکڑتا اور سمٹتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں اسلام نے وہ کیا تدابیر اختیار کیں جن کو اپنانے اور معاشرے میں سمونے سے ہم دوگونہ خطرات سے نہ صرف بچ نکلنے میں کامیاب ہوتے ہیں بلکہ ایک صحت مند، ترقی یافتہ اور معتدل معاشرے کی تعمیر بھی کر سکتے ہیں۔ یہ تدابیر یہ ہیں۔

(۱) سُود کی حُرمت کا دوٹوک اعلان۔

(۲) احتکار یا ذخیرہ اندوزی کی ممانعت۔

(۳) باطل اور ناجائز ذرائعِ آمدنی کا سدباب۔

(۴) اصولِ وراثت کی تلقین۔

(۵) ذاتی ملکیت کی حوصلہ افزائی۔

(۶) زکوٰۃ اور تبرّعات کی تنظیم۔

(۷) عمل اور جد وجہد کی تقدیس و احترام۔

(۸) اقتصادیات کی اس نہج پر تنظیم و تشکیل کہ جس سے فلاحی مملکت کے نقوش معاشرے کے کینوس پر نمایاں اور صاف طور سے نظر آنے لگیں۔

یہاں چند نکتوں کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ ذاتی ملکیت کی حوصلہ افزائی سے مقصود یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے فرد کو معاشرے میں اپنا مقام اور تشخص متعین کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اُس کی ملکیت کے دائرے اتنے نہ پھیل جائیں کہ اس سے ملّت کے اجتماعی مفادات خطرے میں پڑ جائیں۔

زکوٰۃ و صدقات کا نظام اُس مکمّل اقتصادی نظام کے مترادف نہیں جس کے نفاذ سے فوراً فلاحی مملکت معرضِ ظہور میں آجائے۔ اس نظام کے خدوخال کو ابھی اور نکھارنا اور واضح کرنا ہے۔ اور محوّلہ بالا اصولوں کی روشنی میں ابھی ترتیب دینا ہے۔

صدقات، تبرعات اور زکوٰۃ کی حیثیت محض اشارہ نما (POINTER) کی ہے۔ جس سے اسلامی نظام کی جہت اور رُخ کا تعین ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ ان کے نفاذ سے ہم بہ تدریج سخاوجود کی اُس منزل تک پہنچ جائیں جہاں کوئی شخص مستحقِ زکوٰۃ نہ رہے، کوئی سائل اور مانگنے والا نہ رہے اور کوئی ایسا نہ ہو جسے اپنے مستقبل کی فکر و تشویش لاحق ہو۔

فلاحی مملکت سے ہماری مُراد ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جس میں ہر شخص کو مناسب ٹھکانا ملے، مناسب غذا ملے، اور جس میں ایسے حالات و ظروف کی کارفرمائی ہو کہ روزگار، صحت اور تعلیم کے دروازے ہر شخص پر کھلے ہوں۔ یہی نہیں، ہر شخص کو ایسی فراغت حاصل ہو کہ وہ اپنے علمی اور رُوحانی افق کو چمکا سکے اور بہ حیثیت انسان کے اپنے تمام مضمراتِ ارتقا کو تا بہ حدِ امکان کمال تک پہنچا سکے۔

عمل کی تقدیس کے ایک معنی یہ ہیں کہ ہر شخص اپنے کو شرعًا اس بات کا مکلف گردانے کہ اُسے کام کرنا اور ملّی دولت میں اضافہ کرنا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے:

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

"اور انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔"

گویا سعی، محنت اور حتی المقدور تگ و دو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی و کامرانی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔

اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے نہ صرف کوئی بھی پیشہ بُرا نہیں بلکہ ایک طرح کی تقدیس و احترام کا مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اکابر اہلِ علم میں بہت سے قابلِ صد احترام حضرات ایسے ہیں جو اپنے حرفے کی طرف منسوب ہوئے۔ امام ابوحنیفہ بزاز کہلائے، احمد بن عمر خصّاف کے لقب سے ملقب ہوئے جس کے معنی جوتا گانٹھنے والے کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح نبی ایک، قفال، جصاص، صفار، الصیدلانی، دقاق، صابونی اور حلوانی ایسے نام اس بات پر دلالت کناں ہیں کہ اسلامی معاشرے میں ان تمام حرفوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

یہ نفسِ مضمون کا سرسری جائزہ تھا۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ ملک کے اہلِ فکر، علمائے کرام اور قانون داں حضرات کہیں سر جوڑ کر بیٹھیں اور اقتصادیاتِ اسلامی کو اس طرح نکھار کر تفصیل سے پیش کریں کہ یہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کے مقابلے میں ایک مستقل بالذات تیسرا اقتصادی نظام ثابت ہو۔ آمین

اسلامی تعلیم و تربیت کی خصوصیات

جناب محترم قاضی مجیب الرحمٰن

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ولبعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ (الجمعہ ۲ - ۴)

ترجمہ: وہی (اللہ تعالیٰ) تو ہے جس نے امی لوگوں میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو آیاتِ الٰہیہ پڑھ کر سناتا ہے، اور انہیں پاک کرتا ہے، اور انھیں کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ درانحالیکہ یہ لوگ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے اور دوسروں کے لیے بھی اُن میں سے آپؐ کو بھیجا جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے اور وہ (اللہ تعالیٰ) بڑا زبردست ہے حکمت والا ہے اور یہ رسالت وفرائض رسالت اکتسابی نہیں بلکہ فضلِ الٰہی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

ان آیاتِ کریمہ سے بعثتِ محمدی کے مقاصد اربعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی فرائضِ منصبی پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کام قاصد و مبلغ کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت اور کلامِ الٰہی کا بلاکم وکاست ٹھیک ٹھیک پہنچانا تھا۔

ب ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا کام مزکّی اور مُصلح کی حیثیت سے لوگوں کے قلوب و اذہان کو عقائدِ باطلہ اور ان کے نفوس و اجسام کو اخلاقِ ذمیمہ سے پاک کرنا تھا۔

ج ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا کام معلّم و مدرّس کی حیثیت سے کتابِ الٰہی کی تفسیر، تشریح، ترجمانی اور عملی تفہیم کا فرض ادا کرنا تھا۔

د ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا کام مرشد و مُتلقّن کی حیثیت سے لوگوں کو حکمت و دانائی کی تلقین کرنا تھا۔ احکام و مسائلِ دین کے قاعدے اور آداب، عوام و خواص سب کو سکھانے تھے اور خواص کی رہنمائی، اسرارِ شریعت، آدابِ طریقت اور رموزِ مملکت میں فرمانی تھی۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیائے بشری میں اخلاقی انحطاط، حیوانی ہوس رانی اور بہیمی تعیش کا ایسا زبردست سیلاب آیا تھا جس نے نوعِ انسانی کے جملہ اعلا اقدار و بلند محاسن کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر اجتماع و معاشرت کی عمارت کو متزلزل کر دیا تھا۔ ایرانی، رومی، برہمنی، کلیسائی اور یہودی اور دیگر مروجہ نظامہائے تعلیم و تربیت اور اصولِ تمدن و معاشرت میں آسمانی ہدایت و روشنی اور انبیاء کی عملی سیرتوں کے نمونے یا تو کلی طور پر مفقود تھے اور یا ان میں کتمان، تحریف اور حق فروشی کی وجہ سے انسانی افکار و خیالات اور حیوانی طرق و تدابیر کا اضافہ کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں روئے زمین پر کسی قوم کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام اور نبیٔ وقت کی عملی سیرت اپنی اصل الہامی شکل و صورت میں موجود نہ تھی۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس ممزوج و مرکب علم پر چند افراد یا خاندانوں اور طبقوں کا قبضۂ کلی اور ناقابلِ شکست اجارہ داری تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نوعِ انسانی کی عظیم اکثریت جہل و نادانی اور ناخواندگی کی شکار ہو، چوپایوں کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔

روم میں عیسائی تسلط کے بعد علم اور اہلِ علم پر جو تباہی گزری وہ تاریخِ انسانی کا انتہائی بدنما حصہ ہے۔ دین کے نام پر علمی بات کو غیر مسیحی قرار دیکر فنا کر دیا گیا۔ مجالسِ تفتیش واحتساب قائم ہوئیں اور جس شخص پر بھی اہلِ علم ہونے کا الزام لگتا وہ جور و استبداد کی چکی میں پس جاتا۔ محکمۂ احتساب نے لاکھوں آدمیوں کو سزائیں دیں جن میں سے ۳۲ ہزار صرف وہ بدنصیب تھے جنہیں زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔

یہودیوں میں احبار و رہبان (علما اور مذہبی پیشواؤں) نے علم پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور عوام کو "اُمی" قرار دیکر تعلیم و تعلم کو ان کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دیدیا گیا تھا۔

ہندوستان میں علم صرف برہمنوں کے لیے مخصوص تھا۔ شودروں کے لیے حکم یہ تھا کہ وہ راستہ چلتے ہوئے لکڑی سے ٹھک ٹھک کی آواز پیدا کرتے ہوئے جائیں تاکہ اگر کوئی برہمن وید کی تعلیم میں مصروف ہو تو وہ خاموش ہو جائے ورنہ اگر کوئی شودر وید کی آواز سن لیتا تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔

ان تاریخی حقائق سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلام سے پہلے علم پر مخصوص طبقوں کی اجارہ داری قائم تھی اور مٹھی بھر لوگ علم کے ذریعے اپنی برتری قائم کر کے اسے عام لوگوں کے استحصال کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔

۱۔ اسلام دینِ علم

تاریخِ عالم میں اسلام کو یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ وہ سراپا علم بن کر آیا اور جہاں پہنچا وہاں سے جہالت کے اندھیرے بھاگ اٹھے اور علم و حکمت کے چشمے روشن ہو گئے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی علم اور اسلام کے ربط کو بہت اچھی طرح واضح کرتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝

ترجمہ: پڑھیے اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا اولین نازل شدہ لفظ اِقْرَاْ (پڑھیے) ہے۔ اور اسی اولین وحی میں تعلیم بالقلم کو رب کریم کی بہت بڑی نعمت قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ بات واضح کر دی گئی کہ اس دینِ مبین میں جہالت اور اوہام کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کی بنیاد قرأت اور تعلیم بالقلم (پڑھنے اور لکھنے) پر ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخ نے انسانوں کے لیے جو علمی ورثہ محفوظ رکھا ہے

وہ انہی دو بنیادی ذرائع تعلیم کا مرہون منت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مُعلّم کتاب و حکمت بنا کر بھیجا۔ آپؐ نے اپنی اولین توجہ اشاعتِ علم پر دی جس کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے عرب کے صحرا میں بکھرے ہوئے، خانہ جنگیوں میں مصروف بدّو علم و حکمت کے پاسبان اور حصولِ علم کے لیے مرجع الخلائق بن گئے۔

غیر مسلم مؤرخین اس بات پر حیران ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو خود امّی تھے، کس طرح ایسی اور اتنی زبردست علمی تحریک کے محرک ثابت ہوئے جس کی بدولت دنیا بھر کا علمی خزانہ ایک صدی سے بھی کم عرصے میں عربی زبان میں منتقل ہو گیا۔ اور پھر صدیوں تک دنیا اسلام کی پھیلائی ہوئی علمی روشنی سے منور رہی۔ درحقیقت یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زندہ معجزہ تھا۔

علم کی اشاعت اور اس پر سے اجارہ داری ختم کرنے کے سلسلے میں اسلام نے دُنیا کو جن زرّیں اصولوں سے روشناس کیا ان میں سے چند درجِ ذیل ہیں:

۱۔ تعلیم و تعلّم کی ترغیب اور جہالت کی مذمّت:

قرآنِ پاک کی متعدد آیات علم اور علما کی فضیلت اور جہالت کی مذمت میں وارد ہیں۔ سورہ زمر میں فرمایا گیا ہے:

قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون

آپ کہہ دیجیے (یا محمدؐ) کیا اہل علم اور جاہل (بھی کبھی) برابر ہو سکتے ہیں۔

سورہ مجادلہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ط

ترجمہ: اللہ تم میں ایمان والوں اور ان لوگوں کے جن کو علم ملا ہے، درجے بلند کرے گا۔

اسی طرح احادیثِ نبویؐ کا ایک بڑا ذخیرہ علم کی ترغیب اور فضائل پر مشتمل ہے یہ ترغیبات لوگوں میں علم کا شوق اور جذبہ پیدا کرنے کا کامیاب ترین ذریعہ ہیں۔

۲۔ علمی اجارہ داری کا خاتمہ

اسلام میں برہمن، پادری یا کسی اور شکل میں علمی اور مذہبی اجارہ داری کا کوئی تصور

نہیں۔ بلکہ ہر شخص کے لیے علم کا راستہ کھلا ہے۔ علم حاصل کر کے وہ خلق خدا کی خدمت کر سکتا ہے۔

قرآن مجید نے مال و دولت کی طرح علمی ذخیرہ اندوزی پر بھی کاری ضرب لگائی۔ اور فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ○

ترجمہ: بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت میں نازل کر چکے ہیں۔ بعد اس کے کہ ہم اسے لوگوں کے لیے کتاب (الٰہی) میں واضح کر چکے ہیں۔ تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے۔ اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔"

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ

ترجمہ: جس شخص سے کسی ایسی بات کے بارے میں پوچھا جائے جسے وہ جانتا ہو، اور پھر وہ نہ بتلائے۔ قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

گویا اسلام نے علم حاصل کرنے والوں پر یہ بھی لازم کر دیا کہ وہ علم کو مخلوقِ خدا کی امانت سمجھتے ہوئے اسے دوسروں کو پہنچائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا کہ:

بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً۔

ترجمہ: میری طرف سے پہنچا دو خواہ وہ ایک آیت ہی ہو۔

اس طرح علم کے معاملے میں رنگ و نسل، عمر اور جنس کی قیود کو بھی ختم کر دیا۔ اور غلام، آزاد، گورے، کالے، مرد و عورت سب کے لئے علم ضروری قرار دیا۔

ا۔ غلاموں کی تعلیم

اسلام نے اوّلین کوشش تو یہ کی کہ کوئی شخص اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کا

غلام نہ رہے۔ بہ ایں ہمہ جو لوگ اس زمانے میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے انہیں بھی زیورِ علم سے محروم نہیں رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ گورنر مکہ سے پوچھا کہ تم نے جنگلات کا افسر کسے مقرر کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا ابن ابزی رضؓ کو جو ایک غلام تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے غلام کو امیر اور افسر مقرر کرنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ وُہ کتاب اللہ کا عالم ہے"۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام اور خادم عکرمہ رضؓ کی ایسی تعلیم و تربیت فرمائی کہ وہ بعد میں "حبر الامۃ" (امت کا عالم) کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

ب ۔ بچوں کی تعلیم

اسلام نے ماں باپ پر اولاد کے جو حقوق عائد کیے ہیں ان میں بہترین تعلیم و تربیت کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ جنگ بدر میں کفار کے قیدیوں میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان سے جرمانہ یا بیگار لینے کے بجائے انھیں دس دس بچوں کو کتابت سکھانے پر مامور کر دیا گیا۔ مساجد میں بچوں کی تعلیم کا انتظام ایک لازمی چیز تھی۔ علامہ ذہبی طبقات القراء میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداء رضؓ کے حلقۂ درس میں سینکڑوں طلبہ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ حاضری لی تو سولہ سو کے قریب تھے۔ آپ رضؓ دس دس طلبہ کی جماعتیں بنا کر ایک ایک استاد کے سپرد کر دیتے اور خود مسجد میں ٹہلتے ہوئے ان کی آوازوں پر کان لگائے رکھتے۔ قرأت و کتابت کے علاوہ بچوں کو شہسواری اور پیراکی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بعد میں اموی اور عباسی خلفا کے عہد میں عصری تقاضوں کے تحت حساب، جغرافیہ اور دیگر علوم بھی نصاب میں شامل کر دیے گیے۔

ج ۔ تعلیم نسواں

چھوٹی بچیوں کے لیے گھریلو مدرسے قائم کیے گیے۔ حضرت عائشہ رضؓ کا گھر انہی مدارس میں سے ایک تھا۔

بڑی عمر کی عورتوں کی تعلیم و تربیت گھر کے مردوں کے ذمہ تھی۔ قرآن کریم نے عورتوں کو اپنے گھر کے مردوں سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے

باری تعالیٰ ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (الاحزاب)

ترجمہ: "اور تم اللہ کی ان آیتوں اور حکمت کی باتوں کو یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں"۔

مردوں کے ذمے اپنے گھر کی عورتوں بلکہ خادماؤں اور کنیزوں تک کی تعلیم و تربیت کا کام لگایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین قسم کے لوگوں کے لیے دوہرے اجر کی خوشخبری دی ہے۔ ان میں سے ایک شخص وہ ہے جو اپنی کنیز کی تعلیم و تربیت کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ "فَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَادِيْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ۔ (صحیح بخاری کتاب العلم)

ترجمہ: (اور ان تین میں سے) ایک شخص وہ ہے جس کے پاس کنیز ہو پھر اسے اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح تعلیم دے اور پھر اسے آزاد کر کے اپنے نکاح میں لے آئے۔ اس کے لیے (بھی) دوہرا اجر ہے۔"

اس کے علاوہ بعض اوقات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی تعلیم کے لیے خاص دن مقرر فرمایا کرتے تھے۔

د۔ تعلیم بالغان

جو لوگ بچپن میں تعلیم و تعلم سے بے بہرہ رہ جائیں ان کو بھی اسلام نے علم سے محروم رہنے نہیں دیا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ۔

ترجمہ: پنگھوڑے (بچپن) سے لے کر لحد (موت) تک علم طلب کرتے رہو۔

ہجرت کے بعد حضورؐ نے مسجد نبوی میں ایک مکتب قائم کر دیا تھا۔ جسے "صفہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ایک چبوترہ سا تھا جہاں اطراف ملک سے مشتاقانِ علم آکر مقیم ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معلم تھے۔ یہ لوگ محنت و مزدوری کر کے روزی کماتے اور پھر زیادہ وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں گزارتے۔

ان میں ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے تھے۔ یہ گویا اسلام کی پہلی اقامتی یونی ورسٹی تھی۔

جو لوگ روزمرہ کی ضروریات یا دُور رہائش کے سبب زیادہ وقت حضورؐ کی خدمت میں نہیں رہ سکتے تھے وہ بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی وقت نکال لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ چونکہ مدینہ منورہ سے باہر ایک گاؤں میں رہتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے ایک انصاری ساتھی سے مل کر باری مقرر کر دی تھی۔ ایک دن ایک ساتھی حاضر ہوتا اور جو کچھ سیکھتا جا کر اپنے ساتھی کے ساتھ گاؤں میں مذاکرہ کر لیتا، دوسرے دن دوسرا ساتھی اسی طرح کرتا۔ (بخاری کتاب العلم)

اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیرونی قبائل کی درخواست پر اساتذہ اور مبلغین روانہ فرمایا کرتے تھے جو کھیتوں، حجروں اور بازاروں میں جا کر لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے تھے۔

۳ ۔ مفت تعلیم

اسلام نے تعلیم و تعلم کی راہ میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹوں کو ختم کرنے پر زور دیا، خاص طور پر مالی مشکلات کو اس راستے میں آڑے آنے نہیں دیا اور تعلیم کو مفت قرار دیا تاکہ علم صرف اصحابِ ثروت میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔

قرآنِ کریم نے یہودیوں کے اس عملِ قبیح کی سخت مذمت کی ہے کہ انھوں نے علم دین کو کسب زر کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ قرآن مجید نے اکثر انبیاء کرام علیہم السّلام کے اس قول کو نقل فرمایا ہے کہ:

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۔

ترجمہ: میں اس (تعلیم و ارشاد) کا کوئی معاوضہ تم سے نہیں مانگتا۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن پر اجرت لینے سے سختی سے منع فرمایا تھا۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے اصحاب صفہ میں سے ایک شخص کو قرآنِ مجید کا کچھ حصہ سکھایا۔ اس نے خوش ہو کر انھیں ایک کمان دیدی۔ جب حضرت عبادہؓ نے اس بارے میں حضورؐ سے پوچھا تو حضورؐ نے فرمایا:

"اگر تو یہ پسند کرتا ہے کہ تیرے گلے میں آگ کی ایک کمان ڈال دی جائے تو تو یہ قبول کر لے۔"

پس انھوں نے کمان واپس کر دی۔

یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ اور بعد کی اسلامی حکومتوں میں تعلیم ہمیشہ مفت رہی اساتذہ کی تنخواہیں اور طلبا کی حوصلہ افزائی اور مالی امداد کے لیے وظائف بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام سرکاری حکام کو یہ حکم دیا تھا کہ جو لوگ قرآن مجید کی تعلیم حاصل کریں ان کے لیے وظائف مقرر کر دیے جائیں [1] اساتذہ کی اعلا تنخواہیں، تحقیقی اور علمی کام کرنے والے علماء کے لیے انعامات اور مدارس کے جملہ اخراجات بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے۔

۴ — لازمی تعلیم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا خَيْرَ فِي مَنْ كَانَ مِنْ أُمَّتِي لَيْسَ بِعَالِمٍ وَلَا مُتَعَلِّمٍ

ترجمہ: "میری امت کے اس شخص سے خیر (کی کوئی توقع) نہیں جو عالم یا طالب علم نہ ہو۔" یعنی یا تو خود سیکھے یا اوروں کو سکھائے۔

یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ ہی کے دور میں ہر شخص کو کسی نہ کسی طرح تعلیمی نظام سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ عام شہروں اور قریبی قبائل میں تعلیم و تعلّم کا چرچا عام تھا۔ البتہ خانہ بدوش بدّو تعلیم سے احتراز کرتے تھے۔ چنانچہ خلافتِ فاروقی میں ایک کمیٹی ابوسفیان نامی ایک شخص کی سربراہی میں اس غرض سے قائم کی گئی کہ وہ مختلف علاقوں کا دورہ کرکے تعلیمی معیار کا جائزہ لے تاکہ لوگ تعلیم سے احتراز کریں تو انھیں سزا دی جائے۔ اسی طرح عام شہریوں کے لیے ضروری تھا کہ ہر شخص کم از کم سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ اور سورۂ نور لازمی طور پر سیکھے اس لیے کہ ان سورتوں میں روزمرہ زندگی کے لیے احکام و فرائض مذکور ہیں۔ اس طرح اسلام نے ہر شہری کی لازمی تعلیم کا بندوبست حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل کر دیا۔

۵ — سعادتِ دارین پر مشتمل جامع تعلیم

اسلام میں دین و دنیا کی تفریق کا کوئی تصور نہیں بلکہ اس دنیا کو آخرت کی کھیتی

---

[1] کنز العمال بحوالہ الفاروق۔ شبلی نعمانی

اور آخرت کو دنیا کا تمتہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان علوم و فنون کی طرف بھی رہنمائی کی ہے جو انسانی ارتقا اور معاشرے کی تحسین و تعمیر کے لیے ضروری ہیں۔

قرآن مجید نے زمین و آسمان اور اس میں موجود مخلوقات جانداروں پہاڑوں، ہواؤں اور بارش کے نظام میں غور و فکر کی دعوت دے کر فکر و نظر اور بحث و تحقیق کے دروازے کھول دیے۔ اور واضح کر دیا کہ ان میں سے کوئی چیز بھی عبادت یا سر جھکانے کے لائق نہیں، بلکہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے استعمال و استفادے کے لئے مسخر کر دی ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ترجمہ: اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہے تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ زمین کی پیداوار کے بارے میں فرمایا:

فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ
وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ مَّتَاعًا لَّكُمْ
وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ (عبس)

ترجمہ: اور ہم نے اگایا اس (زمین) میں اناج اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور میوے اور چارے تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے فائدہ کے لیے۔

جانوروں اور چوپایوں کے بارے میں فرمایا:

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا
تَاْكُلُوْنَ ؕ ۵/۱۶

ترجمہ: اور چوپائے بھی (اسی اللہ نے) بنائے، ان میں تمہارے لیے گرم لباس ہے۔ اور اور بھی فائدے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔

سمندروں میں جہازرانی، مچھلیوں اور معادن کے حصول کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا
مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ
وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ؕ (۱۴/۱۶)

ترجمہ: اور وہی اللہ ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور تم اس میں سے زیور نکالو جسے تم پہنتے ہو اور تو

کشتیاں دیکھتا ہے کہ اس میں پانی چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل سے تلاش کرتے رہو اور تاکہ تم (اس کا) شکر ادا کرتے رہو۔

زمین کے اندر چھپے ہوئے معدنیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ

ترجمہ : اور ہم نے لوہے کو نازل کیا کہ اس کے اندر شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے (اور بھی) فائدے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پاک سے ہدایت و روشنی پا کر اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو انسانی معاشرے کی بہبود کے لیے استعمال کیا، اور ہر شعبۂ حیات میں نہایت آزادی کے ساتھ نت نئے تجربات کیے اور نئے نئے علوم و فنون کی بنیادیں رکھیں جن کی بدولت ایک زبردست اور عظیم الشان تمدن وجود میں آیا۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری قوموں کے پاس موجود علم و حکمت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا :

اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا حَيْثُ وَجَدَهَا

ترجمہ : دانائی کی بات مومن کی گمشدہ چیز ہے وہ اسے جہاں بھی پائے اس کا زیادہ حقدار ہے۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیگر اقوام کی زبانیں سیکھنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کے حکم پر سریانی زبان سیکھی تھی۔

اسی بنا پر مسلمانوں نے سابقہ اقوام کے علمی ذخیروں کو دوبارہ زندہ کیا۔ ان کی غلطیوں کی نشاندھی کی اور ان تہذیبوں کے تمام اچھے اجزا کو نچوڑ کر اپنی عملی زندگی میں ان سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ ان کو ترقی دیکر کمال تک پہنچا دیا۔ مسلمانوں نے یونانیوں سے فلسفہ و طب اور ہندوستان سے ریاضی و ہندسہ کے مبادی حاصل کیے اور پھر ان میں اتنے اضافے کیے کہ ہر علم کی کئی شاخوں میں تقسیم کر دیا اور ہر شاخ میں لاتعداد تصانیف اور انکشافات کیے۔ یہاں تک کہ بغداد اور قرطبہ دنیا کے علمی مراکز کی شکل اختیار کر گئے۔

اسلامی دنیا نے تھوڑے عرصے میں طب، کیمیا، جغرافیہ، فلسفہ، ہیئت، فلکیات اور دیگر

علوم میں عالمی شہرت کے لاتعداد سائنسدان اور محقق پیدا کیے۔ جن میں سے ہر ایک کے کارنامے، ایجادات اور تصانیف آج بھی تاریخ انسانی کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔

بامقصد علم

اسلام کے نزدیک علم معرفتِ خداوندی اور انسانی اخلاق و اعمال کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ ایسا علم جو اِن فوائد سے خالی ہو اسلام کی نظر میں جہالت کے برابر ہے۔ قرآن کریم میں علم بلا عمل کی مثال یوں دی گئی ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (سورۃ جمعہ)

ترجمہ: جن لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ ان کی حالت اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہو۔

واضح ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بے فائدہ علم سے پناہ مانگتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے:

نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ

ترجمہ: جو علم فائدہ نہ دے اس سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر دلوں کو خشیتِ الٰہی اور تقویٰ کے جذبات سے معمور کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً پہاڑوں کی مختلف اقسام اور جانداروں کے بعض عجائبات بیان کرنے کے فوراً بعد فرمایا:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

ترجمہ: خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

اسی طرح لوہے کے فوائد کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا کہ اس نعمت کو حق کی سربلندی کے لیے استعمال کرنا چاہیے:

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ (حدید ۲۵)

ترجمہ: اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے۔ اور لوگوں کے لیے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ بغیر دیکھے کون اللہ اور

اس کے رسولوں (کے دین) کی مدد کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی علمی تحریک ہمیشہ دین کے پُر رحمت سائے تلے پھلتی پھولتی رہی اور اسے خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اسلامی نظامِ تعلیم کے تحت علم حاصل کرنے والے شخص کے ذہن میں یہ بات ہر وقت مستحضر رہتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ذہنی اور مادی قوتوں کو اس کی رضا جوئی اور آخرت کی کامیابی کے لیے استعمال کرنا ہے۔ ایسے شخص کی کوشش و کاوش یقیناً بنی نوع انسان کے لیے خیر و برکت کا باعث بنے گی۔

بعثت نبوی کے بعد دنیا دو سائنسی ادوار سے متعارف ہوئی۔ پہلا دور عباسی خلافت سے وابستہ تھا جبکہ دوسرے دور کا تعلق یورپ کے عروج سے ہے۔ تاہم جب ہم مجموعی طور پر پہلے دور کے علمی کارناموں اور سائنسی ایجادات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں مثبت اور افادی پہلو کا واضح غلبہ نظر آتا ہے جبکہ دوسرے دور کی تحقیقات و انکشافات زندگی کی بے شمار سہولیات کے ساتھ ساتھ لاتعداد مسائل اور پیچیدگیوں کا سبب بھی بنی ہیں۔

وجہ صاف ظاہر ہے کہ دوسرے دور کی باگیں ان ہاتھوں میں تھیں جو شاہراہِ حیات پر دوڑنا تو جانتے تھے لیکن منزل سے بے خبر تھے۔ ان کے ہاں تعلیم و تعلم کے اغراض و مقاصد متعین نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی اداروں کی دن رات کی محنت اور انسانوں کی دماغ سوزی کا نتیجہ خود غرضی، خطرناک سازشوں، زہریلے پروپیگنڈوں، مہلک ہتھیاروں اور انسانی اقدار کی رسوائی کی شکل میں برآمد ہو رہا ہے۔ یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ انسانوں کے لیے وہی تعلیم نجات و فلاح کا ذریعہ بن سکتی ہے جس کی بنیاد ظن و تخمین اور ناقص انسانی افکار کے بجائے وحی الٰہی کے یقینی اور روشن ماخذ پر ہو۔ اور جو شک و اوہام اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔

اس میدان میں آپ اسلامی نظامِ تعلیم ہی کو یکتا و منفرد پائیں گے۔ جس کی بنیاد قرآن کریم ہے اور جس کی تعریف یہ ہے کہ:

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (۴۲/۴۱)

ترجمہ: اس میں باطل نہ آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ (کلام) نازل ہوا ہے خدائے حکیم و قابلِ ستائش کی طرف سے۔

آنحضرتؐ اور مسلمانوں کا طرزِ زندگی

جناب محترم ڈاکٹر جان۔ ایل ایسپوزیٹو

مذاہب کے تاریخ نگار کی حیثیت سے میرے خیال میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کا سب سے واضح اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے خود کو قرآنی تعلیمات کے عملی نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ ایک ایسے مثالی نمونہ کے طور پر جس کی پیروی آمتِ مسلمہ کا ہر فرد کر سکے۔ سنتِ نبوی کی اہمیت خود قرآن سے واضح ہے جس میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے:

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی .....
پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔" (النساء - ۵۹)

در حقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا اُمیدوار ہو۔" (الاحزاب - ۲۱)

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ مکہ اور مدینہ کے مسلمان بالکل ابتدائی دور سے ہی آپؐ کے عمل کا غور سے مشاہدہ کرتے رہے اور آپؐ کے اسوہ کی پیروی کرتے رہے اور آپؐ کے قول اور عمل کی زبانی روایت کے ذریعہ اور تحریروں کے ذریعہ حفاظت کرتے رہے۔ اس طرح آپ کا عمل اُمت کے لیے سنت بن گیا جسے ہم آج حدیث رسول کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آپؐ کا کوئی قول یا عمل ایسا نہیں تھا جس کا آپؐ کے پیروؤں نے ذوق و شوق سے تحفظ نہ کیا ہو۔ تاریخِ اسلام کا ہر طالبِ علم جانتا ہے کہ مسلمان بالکل ابتدائی دور ہی سے اپنی رہنمائی کے لیے قرآن اور سنتِ رسول کی طرف دیکھتے تھے۔

علاوہ ازیں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اخلاقی زندگی میں آنحضرتؐ کے اس اسوہ کی اہمیت کے نتیجے میں ہزاروں احادیث محفوظ کر لی گئیں جن کی روایات بڑھتے بڑھتے لاکھوں تک پہنچ گئیں۔ اس کے بعد ابتدائی دور کے علمائے حدیث نے ان روایات کو جمع کیا اور ان کے اسناد اور متن کے باہمی تعلق کو جانچنے کے طریقے متعین کیے اور اس کے بعد ان کی روشنی میں ان روایات کی صحت کو پرکھنے کا مشکل اور محنت طلب فرض انجام دیا۔ بخاری، مسلم، ابو داؤد اور اس قسم کے احادیث کے

دوسرے مجموعے اسی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

اس پس منظر میں اس اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اسلامی طرز زندگی یعنی شریعت میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حاصل ہے۔ چناں چہ ابتدائی دور کے فقہا نے جب شریعت اسلامی کے خطوط مرتب کرنے کی کوشش کی تو ان کے اولین مآخذ قرآن اور سنت رسولؐ قرار پائے۔

جب ہم مسلمانوں کے طرز زندگی، ان کے مقاصد اور اصولوں کو دیکھتے ہیں تو ان پر آنحضرتؐ کی زندگی اور اسوہ کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اسلام میں پہلا اور سب سے اہم تصور توحید کا ہے یعنی اللہ ایک ہے اور خالق اور رب کی حیثیت سے وہ ساری کائنات اور مخلوق پر حکمراں ہے۔ یہ اس عقیدہ کی بنیاد ہے کہ اسلام، دین اور ریاست دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ دوم یہ کہ یہ دنیا انسان کے پاس اللہ کی ایک امانت ہے اور مسلمان دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ خدا کے حکم کو زندگی کے ہر پہلو پر نافذ کرے۔ مذہب کا سیاسیات اور معاشرے سے ایسا تعلق ہے جسے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آنحضرتؐ نے اس عقیدہ کی بہترین مثال اس طرح پیش کی کہ وہ رسول بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی، جج بھی تھے اور امیر المومنین بھی۔ ابتدائی دور کے فقہا نے شرعی قوانین کی جو تدوین کی ہے اس میں اسلام کی یہ جامعیت پوری طرح نظر آتی ہے۔ یہ شریعت اپنے عظیم المرتبہ اماموں کے ناموں کی نسبت سے حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور جعفری مکاتب فقہ سے موسوم ہے۔

شریعت کی وسعت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سنت کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) سنت قولی: یعنی آنحضرتؐ کے اقوال (۲) سنت فعلی: یعنی آپؐ کا عمل اور (۳) سنت تقریری: یعنی بعض ایسے کاموں پر آپؐ کا اظہار پسندیدگی یا سکوت جس کا آپ کو علم تھا۔

اگر ہم حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کو کما حقہ سمجھنا چاہتے ہیں اور ایک مسلمان کی زندگی پر ان کے اثرات اور ایک مسلمان کی نظر میں ان کے مرتبے کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے قرآن اور سنت رسولؐ کی طرف مراجعت لازمی ہے جو اسلام کے ماخذ ہیں۔ قرآن میں آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو واضح طور پر اس طرح پیش کیا گیا ہے:

> اے اہل کتاب، ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمھارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمھیں دے رہا ہے جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت

سے بند تھا تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آ گیا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (المائدہ - ۱۹)

" وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔" (الفتح - ۲۸)

آپؐ کے اخلاق اور آپؐ کی شخصیت سے متعلق جو احادیث موجود ہیں ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ ہی مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل رہے ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی گفتگو میں اعتدال سے نہیں بڑھتے تھے۔ آپ سڑکوں پر بلند آواز سے بات نہیں کرتے تھے اور نہ برائی کا جواب برائی سے دیتے تھے۔"

ایک اور حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جوتے گانٹھ لیتے تھے اور اپنے کپڑے سی لیتے تھے اور ہر کام بالکل اسی طرح کیا کرتے تھے جیسا تم لوگ کرتے ہو۔ وہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

یہ نمونہ تھا ایسی شخصیت کا جس کی پیروی تمام مسلمانوں پر لازم تھی۔ سیوطی نے الجامع الصغیر میں یہ بتاتے ہوئے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ آنحضرتؐ کی مثال کو بہت واضح طور پر پیش کیا ہے؟

" بابرکت ہیں وہ لوگ جو اللہ کی پیروی میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، جب ان کو کوئی جائز چیز دی جاتی ہے اس کو قبول کرتے ہیں، اور جب ان سے کسی جائز چیز کو طلب کیا جاتا ہے تو وہ اس کو دے دیتے ہیں اور جو اپنا احتساب خود کرتے ہیں۔"

نیکی اور اچھائی کی ترغیب دینے والی ان احادیث میں بشارت دینے کے ساتھ ساتھ انتباہ بھی ہے:

" بدبخت ہے وہ شخص جو مقدمہ کے دوران رشوت دیتا ہے اور رشوت قبول کرتا ہے۔"

ایک مغربی مصنف ایف۔شون (F. SCHUON) نے، جنھوں نے آنحضرتؐ کی سیرت اور مسلمانوں کی زندگی میں آپؐ کے کردار کا مطالعہ کیا تھا، ایک اخلاقی رہبر کی حیثیت سے آپؐ کی شخصیت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

" رسولُ اللہ کی پیروی میں یہ سبق مضمر ہے کہ خود طاقت ور بنو، دوسروں کے ساتھ فیاضی سے پیش آؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔"

(UNDERSTANDING ISLAM P. 93)

ایک مسلمان کی زندگی کی تشکیل میں آنحضرتؐ کا جو کردار ہے اس کا مشاہدہ صرف احادیث کی ابتدائی تدوین کے مراحل میں ہی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ قانون شریعت کی تدوین میں بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ قرآن اور سنت ہیں جو اسلامی قانون کی تدوین کے لیے ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شریعت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس میں ایک واسطے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صدرِ اسلام کے مسلم معاشرے میں آپ کو رہنما اور جج کی حیثیت سے جو مقام حاصل تھا وہ قوانین کی تشکیل کے سلسلے میں سنت رسول کی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ اس معاملے میں بھی مثالی نمونہ اور رہبر قرار پائے۔ جب بعض مسلمان اس حقیقت کو فراموش کر گئے تو بخاری نے (حضرت) عائشہؓ سے روایت بیان کی : " حضورؐ نے کوئی کام کیا اور دوسروں کے لیے اس کو جائز قرار دیا، لیکن کچھ لوگ ہیں کہ اب تک اس کام سے احتراز کرتے ہیں ۔۔۔ آپ نے فرمایا " ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ایسے کام سے اجتناب کرتے ہیں جسے میں نے کیا ؟ خدا کی قسم میں خدا کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اور میں ان سے زیادہ خدا کو ناراض کرنے سے ڈرتا ہوں۔"

ایک اور جگہ آپؐ نے فرمایا :

" جو کوئی میری سنت سے انحراف کرتا ہے وہ میرا کوئی نہیں۔"

جب ہم فقہ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ عبادت اور معاملات دونوں میں ائمہ فقہا سنت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ابن حنبل جب وضو کا بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وضو نیت کے بعد ہی جائز ہو سکتا ہے تو اپنے بیان کی تائید میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ : تمام اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہو۔

اس طرح صلوٰۃ کے بیان میں ابن قدامہ کتاب العمدہ میں عبادہ بن صامت سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں : " پانچ وقت کی نمازیں ہیں جن کو خدا نے دن اور رات میں اپنے بندوں کو

پڑھنے کا حکم دیا ہے .... جو شخص نماز پابندی سے پڑھتا ہے اس سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔"

احادیث کے ایک اور مجموعہ 'موطا' میں جسے مالک بن انس نے مرتب کیا ہے ہمیں اسی طرح حدیث پر اعتماد ملتا ہے۔

قانون کے دوسرے بڑے شعبے معاملات میں بھی اسوۂ رسول صلعم کو نمونہ بنایا گیا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں فقہ حنفی کے ان ضوابط میں جو اسلامی عائلی قوانین سے متعلق ہیں ملتی ہیں۔ ایک نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح والدین یا سرپرست کی اجازت سے جائز ہے، کیوں کہ آنحضرت صلعم نے اس کی اجازت دی ہے۔ فقہا کا فیصلہ ہے کہ ایک آدمی جس کی دو یا زیادہ بیویاں ہوں اور سب آزاد ہوں (یعنی لونڈی نہ ہوں) تو اس کو چاہیے کہ ازدواجی حقوق و فرائض کے معاملے میں ان کے درمیان مساوات قائم رکھے، کیوں کہ رسول صلعم نے کہا ہے کہ "جس آدمی کے دو بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہو گا تو اس شخص کا ایک پہلو قیامت کے دن مفلوج کر دیا جائے گا۔"

آخر میں اُمّت کی قیادت یعنی خلیفہ یا امام کے معاملے کو لیجیے۔ اس کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول صلعم کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں"۔ (النساء۔ ۵۹)

اس طرح ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ: "میرے بعد تمھارے اوپر دوسرے حکمراں حکومت کریں گے، نیک حکمراں نیکی کے ساتھ حکومت کریں گے اور بدکردار حکمراں بدکرداری کے ساتھ۔ تم ان دونوں کی سنو اور ان کی ہر اس کام میں اطاعت کرو جو حق ہو......"

ایک غیر مسلم کی حیثیت سے — جس نے سالہا سال تک اسلام کا مطالعہ کیا ہو، پہلے مسلمان اساتذہ کی زیر نگرانی اور پھر ذاتی طور پر اور جس شخص نے مصر سے انڈونیشیا تک اسلامی ملکوں کا سفر کیا ہو اور تحقیقی کام انجام دیا ہو خاص طور پر یہاں پاکستان میں — مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اُمّت کی زندگی میں اللہ کے رسول کی حیثیت سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسی بے مثل حیثیت حاصل ہے۔ مذہب کے مورّخ کی حیثیت سے میں کسی دوسری مثال کا تصور نہیں کر سکتا جس میں ایک رسول نے، ایک انسان نے، اتنی بڑی اُمّت کی زندگی اور اس کے طور طریقوں کو متاثر کیا ہو۔ لہٰذا اگر یہ سیرت کانفرنس منعقد کر کے عید میلاد النبی کی خوشی منائی جا رہی ہے تو وہ ہر لحاظ سے بجا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

حضور اکرمؐ کا عطا کردہ نظامِ تعلیم و تربیت

جناب محترم محمد صلاح الدین

ہر انسانی معاشرے نے بلا امتیازِ مذہب و عقیدہ علم کی اہمیت و فضیلت کو تسلیم کیا ہے اور دنیا میں عزو وقار اور ترقی و خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لیے فروغِ علم کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ہر متمدن اور مہذب معاشرے نے اپنے مخصوص افکار و نظریات اور مقاصدِ زندگی کے مطابق کوئی نہ کوئی نظامِ تعلیم و تربیت بھی وضع کیا ہے اور پھر اسی نظامِ تعلیم کے اثرات و نتائج کی بنیاد پر اُس نے دُنیا میں اپنا مقام حاصل کیا ہے۔

کسی نظامِ تعلیم کے مزاج و کردار اور اس کے ثمرات کا انحصار اُس نصب العین پر ہے جس کے حصول کے لیے اُس کی صورت گری اور منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ مقصد اگر عیش و عشرت کی زندگی ہے تو نظامِ تعلیم کا پورا زور اسباب عیش کی تیاری و فراوانی نت نئے سامانِ نشاط کی ایجاد اس کے حصول کے لیے ہر نوعیت کی جدوجہد، کمزوروں پر دست درازی، مزاحم قوتوں سے لڑنے کے لیے اسلحہ بندی، اپنے غلبے اور تسلط کے لیئے جارحانہ اقدامات اور افرادِ معاشرہ میں مادہ پرستانہ رجحانات کی آبیاری پر ہوگا۔ اور زندگی کا اخلاقی اور روحانی پہلو یا تو قطعی نظر انداز کر دیا جائے گا، یا اُسے ثانوی حیثیت دی جائے گی۔ اس طرح اگر مقصدِ حیات محض رُوح کی بالیدگی اور ترکِ دنیا ہوگا، تو پھر نظامِ تعلیم بودھ بھکشو اور عیسائی راہب تیار کرے گا۔ اور اس کی تیار کردہ کھیپ دُنیا کے معاملات چلانے کی اہلیت سے عاری ہوگی۔

اس سلسلے میں جب ہم اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کا موازنہ دوسرے نظام ہائے تعلیم سے کرتے ہیں تو پہلی چیز جو سب سے نمایاں اور ممتاز و منفرد ہے وہ اسلام کا مخصوص تصورِ علم ہے اور پھر حصولِ علم کی ضرورت و اہمیت پر جس قدر زور قرآن کریم اور احادیث نبویؐ میں ملتا ہے اس کی بھی کوئی نظیر دُنیا کے کسی فلسفۂ تعلیم میں نہیں ملتی۔

علم کے بارے میں ایک عام تصور یہ ہے کہ انسان نے اس کرۂ ارض پر اپنی زندگی کا آغاز جہل کی تاریکیوں سے کیا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے تجربے، مشاہدے اور مطالعہ کے ذریعہ سے علم کی طرف

پیش رفت کرتا گیا۔ یہ بات مادّی وسائل کی تحقیق، ان کی صفات کے تعارف، طبعی قوانین کی دریافت اور ان کے سہارے نت نئی ایجادات کی حد تک تو درست ہے لیکن خود انسان کے مابعد الطبیعیات مسائل کے سلسلے میں قرآن اس تصورِ علم کو جہل قرار دیتا ہے۔ انسان کا اور اس کائنات کا خالق کون ہے، انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے، وہ اس دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے، اُسے یہاں کیا کام انجام دینا ہے، ——————— اور پھر یہاں سے اپنی متعین عمر پوری کر لینے کے بعد کہاں جانا ہے، وہاں اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آنا ہے اور احتساب کے بعد جزا و سزا کی منزلوں سے گزر کر اُس کا آخری ٹھکانا کہاں ہونا ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا واضح ترین جواب اس دنیا میں آنے والے اوّلین انسان کو بخوبی معلوم تھا۔ اس نے جہل کے اندھیرے میں نہیں علم کی روشنی میں اپنی زندگی کا آخری سفر کیا تھا اور اس علم ہی کی بنا پر وہ فرشتوں سے بلند مقام پر فائز ہوا اور اشرف المخلوقات قرار پایا تھا۔

انسان کے خالق و مالک نے جس طرح اس کی طبعی زندگی کے لیے ہوا، پانی، خوراک، روشنی اور دوسرے بے شمار اسباب مہیا کئے تھے، اسی طرح اسے معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ضابطۂ حیات بھی آغازِ زندگی کے ساتھ ہی عطا کر دیا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ - ۳۱) "اور اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے"

یہاں لفظ كُلَّهَا پر غور کیجیے۔ یہ علم ادھورا اور ناقص نہیں، کامل تھا۔ نام سکھانے کا مطلب یہ نہیں کہ محض اشیا کو گنوا دیا ہو، بلکہ ان کے آثار و خواص، نافع اور مضر پہلو، ان کے استعمال کے طریقے اور ان کے ساتھ انسان کے تعلق کی نوعیت کو پوری طرح واضح کر دیا گیا۔ اسی بنیادی علم اور تحقیق و تجسس کی جبلّت کے سہارے انسان علم الاشیا کا دائرہ وسیع کرتا گیا اور ارتقا کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

قرآن کے پیش کردہ تصورِ علم کے مطابق علم کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے، حواس، عقل اور تجربہ ذرائع علم ہیں منبعِ علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور ضرورتوں کے مطابق انسان کی تعلیم و تربیت کے لئے نزولِ کتاب اور بعثتِ انبیاء کے سلسلے کا اہتمام کیا اور انسانیت جب طفولیت اور بلوغت کے مراحل طے کرتی ہوئی پختگیٔ شعور و ادراک کی سطح پر پہنچی تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختمِ نبوت یعنی تکمیل تعلیم و تربیت کا اعلان کر کے سلسلۂ وحی بند کر دیا گیا اور قیامت تک کے لئے اس آخری معلّم اور اس کی تعلیم کو سرچشمۂ ہدایت و رہنمائی قرار دیدیا گیا۔

اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے کیجیے کہ اوّلین انسان اور سلسلۂ نبوت کے بانی حضرت آدمؑ کی تخلیق اور ان کی فضیلت و خلافت کا ذکر علم کے ساتھ ہوا۔ اور سلسلۂ نبوت

کے مختتم حضرت محمدؐ پہ اولیں وحی نازل ہوئی تو وہ بھی علم اور قلم ہی سے متعلق تھی۔ سورۂ علق میں یہ ارشاد ہوا:

"پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا۔" (ترجمہ آیت ۱ تا ۵)

یہ درحقیقت پڑھنے کا حکم نہ تھا بلکہ منبعٔ علم کی جانب سے ایک امی لقب کو معلّمِ انسانیت بنانے کے لیے براہ راست اس کی تعلیم کا آغاز تھا۔ اس نے اب تک قلم کو ذریعۂ علم بنایا تھا۔ اب وہ واسطہ قلم کے بغیر علم پہنچا رہا تھا اور ایسا کامل علم جو اس سے قبل انسان کو کبھی میسر نہ آسکا تھا۔ اس علم کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ اوّل روز سے بے مقصد اور کسی سمت و منزل کے شعور سے عاری نہ تھا۔ اس کا مقصد انسان کو خلافت کے اس عظیم منصب کی ذمہ داریوں کا اہل بنانا تھا جس پر اسے فائز کیا گیا تھا۔ انسان جس علیم و کبیر ہستی کی نیابت پر مامور کیا گیا تھا اُس کی صفات کا ایک ادنا سا شائبہ اس کے کردار و اعمال میں جھلکنا ضروری تھا۔ اسے التعلیم سے محض علم ہی کی روشنی درکار نہ تھی صفت رحم، عدل، احسان، عفو و درگزر، حلم، صداقت، سخاوت، تخلیق، حکمت، تدبیر اور دوسری صفات کا پرتو بھی مطلوب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور بالخصوص نبیٔ آخرالزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے انسان کی تعلیم و تربیت کا جو اہتمام فرمایا اس میں سیرت و کردار کو انہی صفات سے ہمکنار کیا گیا۔ اور اس طرح انسان کو اعلاترین اخلاقی وجود بخش گیا۔

اس نظامِ تعلیم کی روح اور اس کے مزاج و کردار کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا مقصد اس دنیا میں عدل و انصاف پر مبنی انسانی معاشرے کا قیام، اس مقصد کی تکمیل کے لیے اعلاترین انسانی کردار کی تشکیل اور اس تشکیلِ کردار کے لیے اعلاترین اخلاقی اقدار پر مبنی نظامِ تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔ اب دیکھیے قرآن کریم میں اس کی وضاحت کس طرح ہوتی ہے۔

سورہ الحدید میں ارشاد ہوتا ہے:

"ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔" (الحدید - ۲۵)

گویا تمام معجزات، نشانیوں، ہدایات، کتابوں اور میزانِ خیر و شر کے نزول اور انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد اس دنیا میں انسانی معاشرے کو عدل کی بنیاد پر استوار کرنا ہے۔ یہی بات دوسرے لفظوں میں یوں بیان کی گئی ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔" (الحج - ۴۱)

ایک اور جگہ یہی بات یوں فرمائی گئی:

"تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران - ۱۱۰)

معروف کو پھیلانا اور منکر کو مٹانا درحقیقت ایک عادلانہ معاشرے ہی کے قیام کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیئے جس معیار کا کردار مطلوب ہے اس کی تعمیر و تشکیل کا کام انبیاء کو سونپا گیا اور اور انہیں اس مطلوبہ معیار کا بہترین نمونہ بنایا گیا۔ ہر نبی درحقیقت معلّم انسانیت تھا۔ خود حضور اکرمؐ اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

انما بعثت معلما یعنی میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت دعا کی تھی کہ

"اے رب! ان لوگوں میں خود ان ہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو جو انھیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔ (البقرہ ۱۲۹)

اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور اسی سورہ میں آگے چل کر فرمایا:

"ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔" (البقرہ - ۱۵۱)

اب تخلیق آدمؑ، تعلیم آدمؑ، منصب خلافت، مقصد خلافت، نزول کتاب، بعثت انبیاء اور کار نبوت کا یہ پورا سلسلہ ذہن میں رکھ کر اسلام کے نظام تعلیم و تربیت کے ڈھانچے اور اس کی روح کا جائزہ لیا جائے تو اس کا حسب ذیل خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے۔

۱ - اسلامی نظام تعلیم و تربیت کسی فلسفی یا ماہر تعلیم کی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اس نے اپنے بندوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کتابوں کی صورت میں نصاب تعلیم مہیا کیا، انبیاء کی صورت میں معلمین بھیجے اور ان کے ذریعے خلافت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے انسان کو ہدایت و رہنمائی مہیا کی۔

۲ - حضور اکرمؐ کے ذریعے سے ہمیں جو نظام تعلیم دیا گیا وہ اللہ تعالیٰ ہی کے نظام تعلیم و تربیت

کا ایک پرتو ہے۔ سورۂ بقرہ کی مندرجہ بالا آیت میں حضورؐ کے کام کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے اسلامی نظامِ تعلیم کے چار بنیادی عناصر ترکیبی واضح ہوتے ہیں :

(ا) اللہ کی آیات سنانا یعنی قرآن کی تعلیم اس طرح دینا کہ اس کا متن پوری صحت کے ساتھ اس کے بندوں تک پہنچ جائے۔

(ب) تزکیہ نفس یعنی اعلا ترین اخلاقی تربیت جس کے ذریعے نفسِ انسانی خیر کی طرف مائل اور شر سے متنفر ہو، نیکیوں کا صدور آسان اور برائیوں کا ارتکاب مشکل ہو جائے۔ اور انسانی سیرت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بن جائے۔

(ج) کتاب کی تعلیم جو اس کا متن پہنچا دینے کے بعد ایک اضافی ذمہ داری ہے اس کے تحت قرآن کے منشا، مفہوم اور مطالب کو اس طرح کھول کر بیان کرنا اور عملی صورت میں ڈھال کر دکھانا ہے کہ کوئی بھی الجھن باقی نہ رہے۔

(د) حکمت کی تعلیم یعنی اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور اور فہم و ادراک کی جو عظیم قوتیں انسانی ذہن کو عطا کی ہیں انھیں صیقل کرنا، اور جو جسمانی توانائیاں اور مادی وسائل انسان کو بخشے ہیں اُن کے بہترین استعمال کی استعداد پیدا کرنا، گویا اعلاترین علم کے ساتھ انسان کو حسنِ عمل اور حسنِ تدبیر کی صلاحیتوں سے بہرہ ور کرنا۔

(ہ) ایسی باتوں کی تعلیم جو پہلے سے علم میں نہ ہوں یعنی علم میں مسلسل اضافہ، تحقیق و انکشافات کے میدان میں مسلسل پیش رفت اور جمود کی جگہ پیہم تحرک۔

۳۔ حضور اکرمؐ نے اپنی امت کے علما کو وارثِ انبیاء قرار دیا ہے، گویا اب علماء صرف نبیِ آخر الزماںؐ کے چھوڑے ہوئے ورثہ ہی کے امین نہیں بلکہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک تمام انبیائے کرامؑ نے انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے مجموعی طور پر جو کچھ کیا ہے اس کے ثمرات کی حفاظت کرنا اور اس سلسلۂ تعلیم و تربیت کو جاری رکھنا ان کی ذمہ داری ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم کے اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو ان آیات اور احادیث کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جن میں حصولِ علم پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے علم کو روشنی اور جہل کو تاریکی قرار دیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا :

> جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے

ہیں ۔(البقرہ ۔ ۲۵۷)

اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب کو نور قرار دیا ۔ اس نور کے بغیر اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر خلیفۃ اللہ اپنے منصب کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا اسی لیئے ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے علم حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ حضور اکرمؐ نے طلبِ علم کے لیے سفر کو عبادت، اس راہ میں موت کو شہادت، علمی تحقیق میں بحث و کلام کو جہاد، پڑھنے کو صدقہ، یاد کرنے کو تسبیح، علم کو جنت کے راستوں کا نشان، دل کی روشنی، آنکھوں کا نور، تقرب الٰہی کا ذریعہ، مومن کا سچا دوست، مومن کی گمشدہ میراث اور بزرگی اور فضیلت کی علامت قرار دیا، مہد سے لحد تک علم حاصل کرنے پر زور دیا اور اس مقصد کے لیے چین جیسے دُور دراز ملک تک کا سفر بھی اختیار کرنا پڑے تو وہاں جانے کی تلقین فرمائی۔

اب یہ دیکھیے کہ حضور اکرمؐ نے اپنے عہدِ مسعود میں مسجد نبوی کے بلند چبوترے پر جو پہلا باقاعدہ مدرسہ قائم کیا اس کی خصوصیات کیا تھیں۔ خلافتِ راشدہ میں اسی نمونے کی بنیاد پر پورے عرب اور مفتوحہ علاقوں میں جو نظام رائج کیا گیا اس کے خدوخال کیا تھے۔

۱ ۔ صفہ کا مدرسہ اسلام کی پہلی اقامتی درسگاہ تھی اور اس کا خود مسجد نبوی کی حدود میں واقع ہونا یہ مفہوم رکھتا تھا کہ اسلام کے نظام تعلیم و تربیت میں مسجد اور مدرسہ دو جداگانہ ادارے نہیں بلکہ دونوں مل کر ایک مربوط ادارہ بنتے ہیں جو علم و عمل کی وحدت و یکجائی کا مظہر ہے۔ ہمارے دینی مدارس آج بھی اسی روایت پہ قائم ہیں ۔ ہر دینی مدرسہ کی حدود میں ایک مسجد یا ہر مسجد کے احاطہ میں ایک مدرسہ کی موجودگی مسجد نبوی اور صفہ پہ قائم مدرسہ نبوی کے باہمی رشتے کی روایت کا تسلسل ہے ۔

۲ ۔ اس مدرسہ کی دوسری خصوصیت معلّم اور متعلّم کے درمیان ۲۴ گھنٹے کی رفاقت تھی شاگردوں کو زندگی کے اعلیٰ اصول سکھائے جاتے تھے ۔ جن اخلاقی اقدار کی تعلیم دی جاتی تھی اور سیرت و کردار کے جس سانچے میں ڈھلنے کی تلقین کی جاتی تھی ان کا عملی نمونہ ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ معلّمِ اعظم کی زندگی کا کوئی پہلو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ اوراقِ قرآن کی طرح اس کی زندگی بھی کھلی کتاب کی صورت اُن کے سامنے تھی۔ اس کی نجی اور اجتماعی زندگی کے درمیان دبیز پردے حائل نہ تھے۔ وہ قرآن میں جو کچھ پڑھتے اسے اسوۂ حسنہ کی صورت میں روبہ عمل پاتے ۔ کتاب کے مجرد اصول انھیں معلّم کتاب کی اپنی زندگی میں ایسی ٹھوس، واضح اور موثر صورت میں نظر آتے کہ الفاظ اور معنی کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہ رہتا۔ قرآن اور معلّم قرآن کے اسی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے ام المومنین

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا تھا کہ قرآن کی بہترین تفسیر حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ ہے۔

۳۔ صفہ کے مدرسے کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ہوا اور پانی کی طرح علم کو بھی نہ صرف بنیادی ضروریات میں شامل کیا بلکہ انہی کی طرح بلا قیمت سہل الحصول بنا دیا۔ مسجد کی طرح مدرسہ میں بھی کامل مساوات قائم کی علم پر کسی مخصوص گروہ یا طبقے کا اجارہ نہ رہا۔ اس مدرسے کے قیام سے قبل عرب میں علم عام نہ تھا، چند اونچے گھرانوں کی میراث تھا۔ نادار لوگ اور غلام تو اس کا تصور تک نہ کر سکتے تھے، لیکن مسجد نبوی میں صفہ کا چشمۂ علم جاری ہوا تو اس سے فیضیاب ہونے والوں میں نادار، بے سہارا اور غلام طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہی پیش پیش تھے۔ اصحاب صفہ جن کی تعداد ۶۰، ۷۰ کے قریب تھی معاشی طور پر سب سے پسماندہ لوگ تھے لیکن علم کے معاملے میں وہ بڑوں بڑوں کو پیچھے چھوڑ گئے اور ان کے ذریعے علم غربا کی میراث بن گیا۔ اس غیر طبقاتی نظام کی بدولت مورخین، فقہاء، ریاضی دان، سائنسدان، حکماء اور دیگر علوم کے ماہرین پسماندہ اور متوسط طبقے سے ابھرے اور آسمانِ علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ اسلام نے علم اور اس کے مقصود عدل کا رشتہ مال، عہدے منصب اور ہر دوسرے امتیاز سے یکسر منقطع کر دیا اور ان کی بلا قیمت فراہمی یقینی بنا کر محمود و ایاز کو ایک صف میں لا کھڑا کیا۔

۴۔ صفہ کے مدرسے نے ایک اور شاندار روایت یہ قائم کی کہ علم حاصل کرنے والوں کو نہ صرف ہر قسم کے مالی بار سے نجات دلائی بلکہ خود ریاست اور خوشحال افرادِ معاشرہ کے اجتماعی وسائل سے کفالت کا ایسا انتظام کیا کہ غربت کسی صورت میں بھی حصولِ علم کی راہ میں مانع نہ ہو۔ مدرسہ غریبوں کی پناہ گاہ اور معاشرے میں انھیں باعزت مقام دلانے کا ذریعہ بنا۔ صفہ کے ناظمِ مالیات حضرت معاذ بن جبلؓ تھے جو عطیات کے ذریعے سے اس کے مصارف پورے کرتے اور خود حضور اکرمؐ اس کی کفالت پر خصوصی توجہ فرماتے۔ صفہ کے علاوہ ایک اور اقامتی درسگاہ دار القراء تھی۔ عہد نبویؐ میں ان دو اقامتی درسگاہوں کے ساتھ ہی مدینہ منورہ میں ۹ مساجد اور تھیں جو درسگاہوں کا کام دیتی تھیں۔ آس پڑوس کے بچے یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے، ان تمام مساجد اور درسگاہوں کی نگرانی حضورؐ خود فرماتے۔ آپؐ ہی اساتذہ کا تقرر کرتے۔ مسجد نبویؐ میں آپؐ صدر معلم کے فرائض انجام دیتے۔ آپؐ کی نگرانی میں متعدد کبار صحابہؓ وہاں درس و تدریس کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ مفت، مساوی اور یکساں نصاب کے تحت تعلیم کی یہ روایت اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کا ایک لازمی حصہ بن گئی۔ خلافتِ عثمانیہ اور برصغیر میں

میں مغلیہ عہد حکومت تک پوری مسلم دنیا میں کہیں تعلیم کی فیس نہ تھی اور عدالتیں بھی انصاف کے لیئے کسی کورٹ فیس وغیرہ کے تصور سے بالکل ناآشنا تھیں۔ مفت اور کفالتی تعلیم کی وہ روایت جو صفہ سے شروع ہوئی آج بھی ہمارے دینی مدارس میں جاری ہے۔ مدرسہ قائم کرنا اور معلم و متعلم دونوں کو مالی وسائل سے بے نیاز کر دینا مسلم معاشرہ کا ایک عام مزاج بن گیا تھا۔ اس کارِ خیر میں بادشاہ، امراء، رؤسا ہی نہیں مسلمان مزدور تک حسب حیثیت حصہ لیتے اور اسے عبادت سمجھتے تھے۔ کسان اپنی پیداوار کا ایک حصہ مدرسہ کے لیئے وقف کرتا، جولاہا اس کے لیے کپڑے کا ایک تھان فراہم کرتا، تیلی اس کے چراغوں کے لیے تیل مہیا کرتا، بڑھئی رحل اور الماریاں بنا کر دیتے، چٹائی بننے والے چٹائی لا کر دیتے، راج مزدور فالتو وقت میں اس کی تعمیر اور رنگ و روغن کا کام مفت انجام دیتے اور مسلمانوں کا ہر گھرانا طلبہ کے لیے اپنے کھانے کا ایک حصہ ضرور وقف کرتا۔ غرض معاشرے کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جو عطیات، صدقات، ہدیہ، فطرے اور دوسری صورتوں میں مدارس کی خدمت کو ایک نیکی اور سعادت سمجھ کر انجام نہ دیتا ہو۔ خلافتِ راشدہ میں جب بیت المال کی آمدنی بڑھی تو ضروری مصارف میں زیر تعلیم طلبہ کا حق سب پر مقدم رکھا گیا۔ اس نظام کے تحت بچوں اور بڑوں کی تعلیم ان کے سرپرستوں کی ذمہ داری نہ رہی بلکہ ریاست اور افرادِ معاشرہ کی اجتماعی ذمہ داری بن گئی۔

۵ - کفالتِ عامہ کے تحت کام کرنے والے نظام تعلیم کو حریتِ فکر، آزادانہ علمی تحقیق اور بے خوف و خطر اظہارِ رائے کی روح بھی میسر آگئی۔ استاد کسی کا ملازم نہ تھا سب اس کے خادم تھے، شاگرد کسی کے وظیفہ خوار نہ تھے ایک اجتماعی فنڈ سے اپنا حق حاصل کرتے تھے۔ مدرسہ عوام کی عقیدت و محبت اور ان کی قیادت و رہنمائی کا مرکز تھا۔ دربار کی مجال نہ تھی کہ اہلِ مدرسہ پر اپنا تسلط قائم کرتا۔ ان پر کسی کو بالادستی حاصل تھی تو وہ صرف مدرسہ تھا جو دلوں پر راج کرتا۔ علماء بادشاہوں سے زیادہ قابلِ احترام تھے۔ ان پر کبھی دربار کی دست درازی ہوتی تو پورا معاشرہ ان کی پشت پر ہوتا۔ علماء کی جرأتِ کردار، حریتِ فکر اور حق گوئی و بیباکی کی داستانوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ یہ صفات درحقیقت اس خود کفیل نظامِ تعلیم کا جوہر تھیں جس میں مدرسہ اپنے وجود کے لیئے دربار کی سرپرستی کا محتاج نہ تھا۔

۶ - اس نظامِ تعلیم کا ایک اور بنیادی وصف یہ تھا کہ اس کو اعلیٰ ترین اخلاقی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ حضور اکرمؐ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا تھا کہ :

"میں صرف اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں"۔ (موطا - امام مالک)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کروں (مسند احمد - بیہقی، ابن سعد)۔

آپؐ کے قائم کردہ نظامِ تعلیم و تربیت کی روحِ اخلاقِ حسنہ تھی۔ اس نظام نے سیرت و کردار کے اعتبار سے جیسی پاکیزہ اور بلند و بالا ہستیاں اپنی آغوشِ تربیت میں ڈھالیں ان کا مشاہدہ انسانی تاریخ نے پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ اسلام نے اسی نظامِ تعلیم و تربیت کے ذریعے نصف صدی کے اندر اندر ایسا عظیم اخلاقی انقلاب برپا کیا کہ دنیا جنّت کا نمونہ بن گئی۔ عدل، احسان، اخوت، مساوات، ایثار، ہمدردی، غمگساری، تعاون، اعتماد، سچائی اور نیکی کی ایک ایسی عمومی فضا نصف کرۂ ارض پر چھا گئی جس میں انسان کو پہلی بار حقیقی امن، سکون اور اطمینان کی لذت نصیب ہوئی۔

۷۔ اسلامی نظامِ تعلیم کو صرف مساجد اور مدارس تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ اس کا دائرہ خاندان، معاشرے اور اس کے ہر ادارے تک وسیع کیا گیا۔ مدرسے اور معاشرے کے درمیان تضادات اور منافقت کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی گئی، جو کچھ مدرسے میں پڑھایا جاتا، پورا معاشرہ اس کی عملی تصویر پیش کرتا۔ جو چیز مدرسے میں معروف کے طور پر پڑھائی جاتی وہی معاشرے میں معروف نظر آتی اور جن چیزوں کی نشاندہی بطور منکر کرائی جاتی وہ گھر سے لے کر ایوانِ حکومت تک منکر ہی کی صورت میں قابلِ نفرت پائی جاتی۔ گویا مدرسہ ایک مکمل معاشرے کا چھوٹا سا نمونہ اور اس کا حقیقی آئینہ دار تھا۔

۸۔ حضورِ اکرمؐ کے عطا کردہ نظامِ تعلیم نے علم کو ایک وحدت قرار دیا اور اسے گروہی، لسانی، نسلی اور قومی تعصبات سے پاک کیا۔ اس اندازِ فکر نے دنیا بھر کے علوم کے دروازے مسلمانوں پر کھول دیئے۔ انھوں نے یونانی، رومی، فارسی، فرانسیسی، اسپینی اور افریقی زبانیں سیکھیں، ان کے علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا اور خود ان زبانوں کو اپنے علوم کے خزانوں سے مالا مال کیا۔ اس نظامِ تعلیم میں دینی اور دنیوی علوم کی کوئی حد بندی نہ تھی۔ تمام مروّجہ علوم جن میں ادب، فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، فلکیات، طب، کیمیا، طبعیات، فنِ سپہ گری اور دوسرے علوم شامل تھے، اسلامی نظامِ تعلیم کا حصہ بنے اور خود مسلمانوں نے سینکڑوں نئے علوم کی داغ بیل ڈالی۔ اس نظامِ تعلیم نے مسلمانوں کو دنیا میں بھی عزت و عظمت، وقار و افتخار اور قوت و شوکت عطا کی اور انھیں آخرت میں

اپنے رب کے حضور سرخروئی کے قابل بھی بنایا، اس نے امت کے کسی خاص طبقے اور گروہ کو نہیں پوری امت کو بحیثیت مجموعی اوپر اٹھایا اور علوم و فنون کو بہتے دریا کے پانی کی طرح سب کے لیے قابلِ حصول بنا دیا۔

حضور اکرمؐ کے معجزات بے شمار ہیں لیکن میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ امی ہونے کے باوجود انھوں نے اس دنیا کو علوم کے خزانوں سے بھر دیا اور یہ علوم بھی محض فلسفیوں کے افکار و نظریات کی طرح نہ تھے کہ جن کا انسان کی سیرت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ علم اور کردار کو اس طرح یکجا کیا گیا کہ یہ آپس میں مل کر ایک وحدت بن گئے۔ کردار کے بغیر اسلامی معاشرے میں علم کی کوئی وقعت نہ رہی اور علم کے بغیر کردار بقدرِ حسنِ عمل معتبر تو ٹھہرا مگر مقبول نہ بن سکا، قیادت و رہنمائی کا تاج صرف اسی کے سر پر رکھا گیا جسے بلند اخلاقی کردار اور علم کی قابلِ اعتماد مقدار نصیب ہوئی۔

یہ نظام نوآبادیاتی دور میں استعماری قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ مدرسے کی وحدت اور اس کی مساوات ختم ہوئی، دین اور دنیا کی علاحدگی کے تصور نے مدرسے کو بھی دینی اور دنیوی بنیاد پر تقسیم کیا۔ پھر دنیوی بنیاد پر قائم ہونے والے مدارس بھی طبقوں کی بنیاد پر تقسیم ہوئے۔ امراء، متوسط طبقات اور غریبوں کے لئے الگ ذریعۂ تعلیم، الگ نصاب اور الگ معیار کے مدارس قائم ہوئے اور یوں ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ تعلیم کی اونچی اور نیچی جنس نے علم کو صلاحیت و اہلیت کے بجائے معاشی حیثیت سے منسلک کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہی قوم کے اندر اپنی تہذیب، ثقافت، زبان، اندازِ فکر، لباس، بود و باش، ذہنی رجحانات و میلانات، مقاصدِ زندگی اور اقدار و روایات کے لحاظ سے درجنوں طبقات وجود میں آگئے جن کی زندگی علاحدہ علاحدہ طبقوں کے جزیروں میں بند ہو کر ایک دوسرے سے منقطع ہو گئی۔ باہمی تعاون کے بجائے ان کے درمیان مفادات کے تصادم کا سلسلہ ابھر آیا۔ یوں پوری قوم متحد ہونے اور صبغۃ اللّٰہ کے رنگ میں رنگنے کے بجائے تعلیم و تربیت کے جداگانہ اور رنگ برنگے نظام کی وجہ سے شدید انتشارِ فکر کا شکار ہو گئی۔ ایک گروہ اسے اپنے افکار کی سمت کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے اور دوسرا اس کی مخالف سمت۔

یہ المناک صورت حال اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ہم پوری قوم کے لیے مفت اور یکساں نصاب و ذریعۂ تعلیم پر مشتمل ایک غیر طبقاتی اور قومی نظام تعلیم وجود میں نہیں لاتے، طبقاتی مفادات کی زنجیروں کو توڑ کر پوری قوم کے بچوں کو کم از کم درس گاہ کی حدود میں مساوی

حیثیت کا نہیں بناتے۔ صفہ کی روایت کے مطابق امیر اور غریب کے بچوں کو ایک ہی چھت کے نیچے نہیں بٹھاتے، ہمارا نظامِ تعلیم کبھی اسلامی نہیں بن سکتا۔

خدا کا نبی مکارمِ اخلاق کی تکمیل اور قیامِ عدل کے لیئے دُنیا میں بھیجا گیا تھا۔ اس نے مدرسے کی مساوات کے ذریعے سے پورے اسلامی معاشرے کو عدل کی بنیاد پر استوار کیا تھا۔ اب یہ بات اخلاق اور عدل دونوں کے منافی ہے کہ ہم امت کے نونہالوں کو امیر اور غریب کے گروہی طبقات میں تقسیم کرکے ان کی مالی حیثیت کے مطابق درسگاہیں قائم کریں۔ اور اُن کے لیے حسب حیثیت علاحدہ علاحدہ نصاب اور سہولتیں مہیا کریں۔ تقسیمِ ملت کی یہ روایت غیر ملکی آقاؤں نے قائم کی تھی۔ ہم نے اس کی کافی سزا بھگت لی ہے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل برصغیر میں شرح خواندگی ۸۵ فیصد تھی آج پاکستان میں صرف دستخط کی اہلیت اور ناظرہ قرآن کی سطح تک علمیت رکھنے والوں کو شامل کرکے یہ شرح ۲۲ فیصد ہے۔ گویا نوآبادیاتی اور طبقاتی بنیادوں پر قائم نظامِ تعلیم نے جہل کی تاریکی پھیلائی، علم کے دیئے بجھائے اور قوم کے ٹکڑے اڑائے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن کے صدر محترم حکیم محمد سعید صاحب نے "آوازِ اخلاق" بلند کی ہے۔ خدا کرے یہ ہر پاکستانی کی آواز بن جائے۔ اسے اگر ہوا میں تحلیل ہوکر رائگاں نہیں جانے دینا تو میری گزارش ہے کہ اخلاق کی اس آواز کو یکساں قومی نظامِ تعلیم کی تحریک کا ذریعہ بنائیے۔ مدرسہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات پر قائم ہوگیا تو میں خدا کو گواہ بنا کر اس امر کی ضمانت دیتا ہوں کہ پورا معاشرہ عدل و مساوات کی بنیادوں پر استوار ہوکر رہے گا۔ اور اخلاق کا پرچم بلند ہوگا۔ خدا ہم سب کو اپنی اپنی قوت، صلاحیت اور وسائل کے مطابق اسلامی نظامِ تعلیم کے لیے جدوجہد کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب

جناب محترم مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مشہور حدیث کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کی کامل کتاب قرآن مجید ہے۔ قرآن حکیم کی ایک مختصر سورۃ "والعصر" میں اس اخلاق کا ایک اجمالی خاکہ یوں پیش کیا گیا ہے:

"انسانی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ گھاٹے اور نقصان میں رہا ہے سوائے اُن کے جو اللہ پر ایمان لائے، انھوں نے نیک کام کیے۔ ایک دوسرے کو نیک کام کی صلاح دی اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں اُنھیں برداشت کیا۔"

ایمان باللہ، اعمالِ صالحہ، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ انسانی تاریخ اور اخلاق کی یہ چار صداقتیں ہیں جنھوں نے اس پر عمل کیا وہ فائز و کامران ہوئے اور جنھوں نے ان سے بے پروائی برتی وہ ناکام و خاسر رہے۔ یہ بنیادی صداقتیں اتنی ہی قدیم ہیں جتنی خود انسانیت۔

اخلاقِ حسنہ جن سے تہذیبِ نفس ہوتی ہے اور انسانیت کا ایک مہذب اور صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ان کے چار اصول بتائے ہیں اور اُن کے الفاظ میں ہر مذہب اور شریعت اُن کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی رہی ہے۔ ان اخلاق کی ہر مذہب میں اگرچہ صورتیں مختلف رہیں، لیکن رُوح سب کی ایک تھی۔ شاہ صاحبؒ اپنی فارسی تالیف "سطعات" میں فرماتے ہیں: (ترجمہ) فقیر پر یہ بات روشن کی گئی ہے کہ تہذیبِ نفس کے سلسلے میں جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ چار خصلتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو انھی چار خصلتوں کے لیے بھیجا۔ تمام ملل حقہ میں انھی چار اخلاق کا ارشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب موجود ہے۔ اور بِرّ یا نیکی انھی چار اخلاق اور خصلتوں کا نام ہے اور بِرّ کے بالمقابل اثم یا گناہ سے مُراد وہ عقائد اعمال اور اخلاق ہیں جو انھی چار خصائل کی ضد ہیں۔

ان چار اخلاق میں سے ایک طہارت ہے۔ اس کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت رکھا گیا ہے اور طہارت صرف ظاہری صفائی کا نام نہیں ہے بلکہ شریعت نے جو اس کے اقسام بتائے ہیں اُن پر صحیح طور پر عمل پیرا ہونے سے جو وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ طہارت کا حاصل ہے جس

کو اُنس اور نُور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

دوم اِخبات یا خدا وند قدوس کے لیے انتہائی درجہ کی عجز و نیاز مندی ہے جس کی تفصیل میرے استاذِ مکرّم علامہ عبید اللہ سندھیؒ نے اس طرح فرمائی ہے کہ ایک سلیم الفطرت شخص جب طبعی اور خارجی تشویش سے فراغت کے بعد، اُس کے جلال اور اُس کی کبریائی میں غور کرتا ہے تو اُس پر ایک حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یہی حیرت اور دہشت خشوع، خضوع، اخبات یعنی نیاز مندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں تمام عبادات آجاتی ہیں۔

سوم سماحت اور فیاضی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ نفس بُرے خصائل اور بُرے اخلاق سے مغلوب نہ ہو مثلاً طلبِ لذت، حبِ انتقام، حسد، غیبت، بخل اور حرص وغیرہ سے اپنے آپ کو بچائے رکھے اس میں عفت (پاک دامنی) جد و جہد، صبر، عفو، سخاوت، قناعت اور تقویٰ تمام آجاتے ہیں۔ شکم اور فرج کی خواہش قبول نہ کرنے کا نام عفت اور پاک دامنی ہے۔ آسائش اور ترکِ عمل کی خواہش قبول نہ کرنے کا نام جد و جہد ہے۔ جزع و فزع اور بے صبری کو روکنا صبر ہے۔ انتقام اور بدلہ لینے کی خواہش کو دبانا عفو ہے۔ خواہش بخل کو چھوڑ دینے کا نام سخاوت ہے اور حرص و ہوا کو قبول نہ کرنے کا نام قناعت ہے۔ شریعت کی بتائی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کرنا تقویٰ ہے۔

چہارم عدالت ہے۔ سیاسی اور معاشرتی نظاموں کی رُوح رواں یہی خصلت اور خُلق ہے۔ ادب، کفایت، حریت، سیاستِ مدنیہ اور حُسنِ معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں۔ اپنی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنا، عمدہ اور بہتر وضع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف متوجّہ رکھنا ادب ہے۔ جمع و خرچ، خرید و فروخت اور تمام معاملات میں عقل و تدبّر سے کام لینا کفایت ہے۔ خانہ داری کے کاموں کو بہ خوبی انجام دینا حریت ہے اور شہروں اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا سیاستِ مدنیہ ہے۔ بھائیوں اور دوستوں میں نیک زندگی بسر کرنا، ہر ایک کے حق کو پہچاننا اور ان سے الفت و بشاشت سے پیش آنا حُسنِ معاشرت ہے۔

یہی چار اخلاق ہیں جن کی تکمیل سے انسانیت کو ترقی حاصل ہوتی ہے اور اُن کو چھوڑنے سے انسان قعرِ مذلت اور خواری میں گرتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کی نظر میں تمام انبیا علیہم السلام ان چار اخلاق کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے۔ یہ ایسے اصول ہیں کہ ان میں شریعت کے عقائد اور اعمال سب آجاتے ہیں۔ اور سورۃ العصر میں انسانیت کی کامیابی اور ترقی کے جو اعمال بتائے گئے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اخلاق اور خصائلِ انسانی کے سلسلے میں یہ تحقیق گویا اُن کے لیے تفسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اخلاقِ حسنہ کے مختصر تذکرے کے بعد اب ہم اخلاقی انحطاط کے اسباب کی طرف آتے ہیں:۔

ویسے تو اخلاقی انحطاط کے فلسفۂ اخلاق میں کئی اسباب بتائے گئے ہیں، لیکن قرآنِ حکیم کی تعلیمات،

قصص الانبیا کے مطالعہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کسریٰ اور قیصر کے دورِ حکومت سے متعلق بتائی ہوئی تحقیق سے (جس کی تفصیل ازالۃ الخفا اور حجۃ اللہ البالغہ میں موجود ہے) یہ بات ملتی ہے کہ اخلاقی انحطاط کا حقیقی سبب انسانیت میں اجتماعی شرک کا رائج ہونا ہے۔ اور یہ بے جا سرمایہ داری اور رفاہیتِ بالغہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے قرآنِ حکیم میں خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعدا میں سے ابولہب کا نام لایا گیا اور ابوجہل کو چھوڑ دیا گیا، کیوں کہ ابولہب مکہ کا بڑا سرمایہ دار تھا، مال اور دولت کے نشے میں اس کی اخلاقی گراوٹ کا یہ عالم تھا کہ وہ کھل کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آزار پہنچانے کے درپے تھا۔ حضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ چوں کہ وہ حضورؐ کا چچا تھا اور مکان بھی قریب تھا تو پڑوس کا خیال بھی چھوڑ کر غلاظت پھینکتا تھا۔ یہاں اہلِ مکہ کی بُری معاشرت اور بُری اقتصادی حالت کا ایک بُرا نمونہ دکھا کر اخلاقی انحطاط کی طرف اشارہ کیا اور اُس پر بددعا کی گئی۔ اس کا اصلی مطلب اصلاح ہے کہ اہلِ مکہ کی یہ حالت نہ رہے بلکہ اصلاح پذیر ہو کر یہ معاشرہ قرآنِ حکیم کی تعلیم پر آجائے۔

قرآنِ حکیم میں نوح علیہ السلام، لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ حضرت شعیبؑ بھی حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی طرح دعوت دیتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم ایک معاشرتی مسئلہ نکاح میں زیادتی کرتی تھی اور شعیب علیہ السلام کی قوم بھی اسی طرح معاشرتی مسئلہ ماپ تول میں کمی کرتی تھی۔ قرآنِ کریم کی سورۂ ہُود میں بتایا گیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے افراد میں دو ناجائز خصلتیں پائی جاتی تھیں: ایک تو وہ خدا کے لیے شریک بناتے تھے اور دوسرے ماپ تول میں ظلم کرتے تھے۔ چوں کہ انھوں نے اپنے نبی کی دعوت کو رد کر دیا تھا، اس لیے انھیں برباد کر دیا گیا۔ کچھ اہلِ علم یہاں شرک کا ذکر دیکھ کر عذاب کا مدار صرف اسی بات پر رکھتے ہیں کہ وہ شرک کرنے کے باعث برباد کر دیے گئے، لیکن قرآنِ حکیم کے واضح الفاظ کی رُو سے اُن کی تباہی کے دونوں ہی اسباب ہیں۔

اس سلسلے میں تحقیق یہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کے حکما ہوتے رہے ہیں: ایک وہ جو الٰہیات کی تعلیم دیتے رہے، جنھیں حکمائے الٰہی کہا جاتا ہے۔ دوسرے اجتماعی حکماء ہیں یعنی فقہا وغیرہم، اور یہ انسانی اجتماع کو چلانے والے ہوتے ہیں۔ اس اجتماع کا حقیقی چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس میں دنیا کا کوئی بادشاہ، حاکم اور حکیم حصہ دار نہیں ہے۔ اجتماعی حکیم کی نظر میں جو شرک ہے اسی شرک کو قرآنِ حکیم میں جا بجا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ قومِ شعیب علیہ السلام کے متعلق قرآنِ مجید میں یہی بتایا گیا ہے کہ وہ اجتماعی شرک میں مبتلا تھے، جیسے ناپ تول میں کمی کیا کرتے تھے، اسی وجہ سے اُن کو برباد کیا گیا۔ عدل

اور ظلم حقیقت میں اجتماعی حکمت کے الفاظ ہیں، قرآن مجید نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ قرآن مجید کا لفظ شرک عام ہے۔ سورۂ ہود میں آتا ہے "وما انا بظلام للعبید" یعنی میں بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ اصل میں جو شخص ظلم کو قانونی شکل دے گا ضرور ہے کہ اُسے خدا کے سوا قانون کا مالک کسی اور طاقت ہی کو ماننا پڑے گا۔ اب جب وہ قانون کا مالک کسی دوسری طاقت کو مانے گا تو وہ اجتماعی حکمت میں دُوسرا خدا مان لے گا اور یہ اجتماعی حکمت میں شرک ہے۔ اس میں سب سے پہلے بادشاہ اور حاکم آجاتے ہیں جیسے فرعون جو اپنے آپ کو قانون کا مالک سمجھتا تھا اور ایسے علمائے سو اور فقرا بھی اس میں آجائیں گے جو تقدس کے نام پر قانون کے مالک بن جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک، امام الائمہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں، فرماتے ہیں:

وما افسد الدین الا الملوک و احبار سوء و رھبان

قریشِ مکّہ اس اجتماعی شرک میں مبتلا تھے۔ اس وجہ سے اُن کے اخلاق میں انحطاط آگیا تھا۔ وہ فی الجملہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ سورۂ عنکبوت میں آتا ہے کہ قریشِ مکّہ اس بات کو مانتے تھے کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے، مگر اس کے باوجود وہ اللہ سے دُور تھے اور اُن میں اخلاقی گراوٹ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اجتماعی شرک میں مبتلا تھے جو ایک گونہ اخلاقِ انسانی سے عاری ہونے کا نام ہے۔ جیسے لوط علیہ السلام کی قوم نکاح کے معاملے میں اور شعیب علیہ السلام کی قوم ناپ تول کے معاملے میں تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حکمت کی بات کی مخاطب سب انسانیت ہوتی ہے اور اسے (توحید کو) ہر ایک آدمی اپنی فطرت کے مطابق سمجھ لیتا ہے مگر اس کے نیچے قانونی درجہ ہے اور قانون کے لیے ضروری ہے کہ کوئی قانون داں ہمیں اس قانون سے آگاہ کرے۔ اسلامی قانون یہ ہے کہ غیر اللہ کے نام پر قسم نہ کھائی جائے اور اللہ کے شعائر یعنی بیت اللہ کے سوا کسی اور طرف سجدہ نہ کیا جائے۔ اس کی خلاف ورزی کرنا گویا قانونی شرک ہے۔ اس قانونی شرک کے ارتکاب کے باعث وہ مجرم بن جائے گا اور قانونی سزا کا مستحق۔ جس طرح اور قانون کی خلاف ورزی جُرم قرار دی گئی ہے اسی طرح اس شرک کو جُرم قرار دے کر اس کی بھی سزا مقرر کر دی گئی ہے۔ جو شخص توحید کو چھوڑ کر شرکِ حقیقی کی طرف جاتا ہے اُس کی سزا غیر محدود ہے۔ قانونی شرک کی جزا دُوسرے جرائم کی طرح محدود ہے۔

محدود اور غیر محدود میں یہ فرق ہے کہ دوسرے جرائم بخشے جائیں گے۔ وہ اسلام سے خارج نہیں ہوتے، اُن کو سزا ضرور دی جائے گی، لیکن اُن پر کفر کے فتویٰ میں احتیاط برتنا چاہیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں مسلمان مشرکوں پر جو قانونی شرک میں مبتلا ہیں بہت غصّہ کرتے ہیں مگر اُنھیں کافر نہیں کہتے۔ اسی طرح "تقویۃ الایمان" میں حضرت شاہ شہیدؒ کا بھی یہی رویّہ ہے۔ مولانا محمد لکھوی زینتُ

الاسلام" میں اس کی بڑی داد دیتے ہیں۔ توحید کا شرک کفر ہے، دوسرا قانونی شرک جس میں قریشِ مکہ مبتلا تھے اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ تیسرا درجہ عام جرائم کا ہے جو بخشے جا سکتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی معاشی ضرورتوں سے فراغت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ جاتا ہے زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں، لیکن ان کی اگر اقتصادی ضروریات بھی فراہم نہ ہوں اور ان کی وجہ سے انسان کی جدوجہد اس کی حیوانی ضرورتوں تک محدود ہو جائے تو انسانیت کے اعلا مقامات کا کسے ہوش رہے گا! اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیاتِ دنیوی میں انسانیت کے اخلاق تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔

شیراز کے حکیم شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اس سلسلے میں کیا خوب فرمایا ہے:

شب چوں عقد نماز می بندم
چہ خورد بامداد فرزندم

1/1/61

[illegible] پاکستان